حدیثِ سوزِ فُغاں

حدیثِ سوزِ فُغاں

سمیع اللہ ملک

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَامِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَامِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿75﴾

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچّوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے

(النساء:75)

انتساب

غزہ اور کشمیریوں کے

ان گمنام شہداء کے نام

جو قربانی کا سبق سکھا گئے

بے تیغ وسناں جائیں، با آہ وفغاں جائیں
اس سوچ میں غلطاں ہیں، جائیں تو کہاں جائیں؟
دُعائے نیم شَبی
زورِ بیان و قوّتِ اظہار چھین لے
مجھ سے مِرے خدا، مِرے افکار چھین لے
کچھ بجلیاں اُتار، قضا کے لباس میں
تاج و کُلاہ وجبّہ و دستار چھین لے
عِفّت کے تاجروں کی دکانوں کو غرق کر
نظّارہ ہائے گیسو و رُخسار چھین لے
شاہوں کو اُن کے غرّۂ بے جا کی دے سزا
محلوں سے اُن کی رفعتِ کہسار چھین لے
میں اور پڑھوں قصیدۂ اربابِ اقتدار
میرے قلم سے جُرأتِ رفتار چھین لے
اربابِ اختیار کی جاگیر ضبط کر
یا غم زدوں سے نعرۂ پیکار چھین لے

پیش لفظ

حضرت وہب ابن منبہ فرماتے ہیں کہ ایک بادشاہ تھا جس کا ارادہ اپنی مملکت کی زمین کی سیر اور حال دیکھنے کا ہوا ۔اس نے شاہانہ جوڑا منگایا۔ ایک جوڑا لایا گیا۔ وہ پسند نہ آیا۔ دوسرا منگایا وہ بھی پسند نہ آیا۔ غرض بار بار رد کرنے کے بعد نہایت پسندیدہ جوڑا پہن کر سواری منگائی گئی۔ ایک عمدہ گھوڑا لایا گیا۔ پسند نہ آیا۔ اس کو واپس کر دیا۔ دوسرا منگایا وہ بھی پسند نہ آیا۔ غرض سارے گھوڑے منگائے گئے، ان میں سے اپنی پسند کا گھوڑا لے کر سوار ہوا ۔ شیطان مردود نے اور بھی نخوت اس کے ناک میں پھونک دی۔ نہایت تکبر سے سوار ہوا، خدام، فوج پیادہ، بڑائی اور تکبر سے رعایا کی طرف التفات بھی نہ کرتا تھا۔ راستے میں چلتے چلتے ایک شخص نہایت سادہ خستہ حال ملا، سلام کیا، بادشاہ نے توجہ بھی نہ کی۔ خستہ حال نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ بادشاہ نے ڈانٹا، لگام چھوڑ۔ اتنی جرات کرتا ہے، معلوم ہے میں کون ہوں؟ اس نے کہا مجھے تجھ سے کام ہے۔ بادشاہ نے کہا، اچھا صبر کر۔ جب میں سواری سے اتروں گا۔ تب بات کر لینا۔ کہا نہیں۔ اب کام ہے۔ یہ کہہ کر زبردستی لگام چھین لی۔ کہا:

میں ملک الموت ہوں اور تیری جان لینے آیا ہوں۔ یہ سن کر بادشاہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ دماغ چکرا گیا۔ زبان لڑکھڑا گئی۔ کہنے لگا، اچھا مجھے اتنی مہلت دے دے کہ میں گھر جا کر اپنے سامان کا نظم کر لوں۔ فرمایا مہلت نہیں ہے، یہ کہہ کر اس کی روح قبض کر لی۔ وہ گھوڑے سے لکڑی کی طرح نیچے گر گیا۔ بغیر پوچھے بغیر اطلاع بغیر مرض وہ موت ہے جو اٹل ہے۔

کیا نظام قدرت ہے۔ جو حکیم جس مرض میں ماہر تھا۔ اسی کا شکار ہو کر چل بسا۔ سل کے مرض میں ارسطا طالیس، افلاطون فالج سے، حکیم لقمان اور جالینوس اسہال سے مر گئے، حکیم اجمل خان دل کی بیماری سے، گویا جس بیماری میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اسی میں ختم ہوئے۔ دھنہ سانپ پکڑتا ہے، سانپ نے کاٹا اور چل بسا۔ کہانی ختم ہوئی اور ایسی ختم ہوئی کہ لوگ رونے لگے تالیاں بجاتے ہوئے۔

فہرست حدیثِ فریاد

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
1	سقوطِ کشمیر.....ذمہ دار کون؟	بروز جمعرات 21 ربیع الاول 1445ھ 5/اکتوبر 2023ء	10
2	کشمیر.....فولادی عزم کی ضرورت	بروز بدھ 27 ربیع الاول 1445ھ 11/اکتوبر 2023ء	14
3	قابل رشک کامیابی	بروز سوموار 2 ربیع الثانی 1445ھ 16/اکتوبر 2023ء	18
4	انکار، روحِ اسلام ہے	بروز منگل 3 ربیع الثانی 1445ھ 17/اکتوبر 2023ء	21
5	دنیا کی زندگی موت پر موقوف ہے	بروز جمعرات 5 ربیع الثانی 1445ھ 19/اکتوبر 2023ء	25
6	موت سے بھلا کوئی ڈرتا ہے	بروز ہفتہ 7 ربیع الثانی 1445ھ 21/اکتوبر 2023ء	30
7	ترقی معکوس	بروز سوموار 9 ربیع الثانی 1445ھ 23/اکتوبر 2023ء	34
8	عظمت کا راستہ	بروز بدھ 11 ربیع الثانی 1445ھ 25/اکتوبر 2023ء	38
9	حافظ دواخانہ	بروز جمعرات 12 ربیع الثانی 1445ھ 26/اکتوبر 2023ء	40
10	اسرائیل: امریکا کا کرائے کا سپاہی	بروز ہفتہ 14 ربیع الثانی 1445ھ 28/اکتوبر 2023ء	44
11	موت سے ڈر کیسا؟ (چار اقساط)	بروز منگل 17 ربیع الثانی 1445ھ 31/اکتوبر 2023ء	50
12	یہ دردناک مناظر	بروز ہفتہ 21 ربیع الثانی 1445ھ 4 نومبر 2023ء	57
13	عالمی امن اور نسل پرست اسرائیل	بروز سوموار 23 ربیع الثانی 1445ھ 6 نومبر 2023ء	61
14	ایمان کا کمزور ترین درجہ	بروز بدھ 25 ربیع الثانی 1445ھ 8 نومبر 2023ء	65
15	67/الفاظ نے نقشہ بدل دیا	بروز جمعۃ المبارک 27 ربیع الثانی 1445ھ 10 نومبر 2023ء	70
16	مشترکہ دشمن	بروز اتوار 29 ربیع الثانی 1445ھ 12 نومبر 2023ء	74
17	ہمیں انسان سمجھو	بروز منگل 2 جمادی الاوّل 1445ھ 14 نومبر 2023ء	76
18	ہاؤس فُل.....الامان الحفیظ	بروز بدھ 3 جمادی الاوّل 1445ھ 15 نومبر 2023ء	78
19	موت کا رقصِ بسمل	بروز جمعۃ المبارک 5 جمادی الاوّل 1445ھ 17 نومبر 2023ء	82
20	ادھورا سچ پورے جھوٹ سے زیادہ خطرناک	بروز ہفتہ 6 جمادی الاوّل 1445ھ 18 نومبر 2023ء	85
21	بے یقینی کے بادل اور جرأت	بروز سوموار 8 جمادی الاوّل 1445ھ 20 نومبر 2023ء	90
22	یاددہانی	بروز بدھ 10 جمادی الاوّل 1445ھ 22 نومبر 2023ء	94
23	خوش فہمی نے برباد کر دیا	بروز جمعۃ المبارک 12 جمادی الاوّل 1445ھ 24 نومبر 2023ء	98
24	اپنی فکر کر ناداں	بروز ہفتہ 13 جمادی الاوّل 1445ھ 25 نومبر 2023ء	101
25	بلیوں کا بندر ثالث	بروز اتوار 14 جمادی الاوّل 1445ھ 26 نومبر 2023ء	103
26	امریکی تاریخ کی گواہی	بروز سوموار 15 جمادی الاوّل 1445ھ 27 نومبر 2023ء	105

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
27	اب کس کی باری ہے؟	بروز بدھ 17 جمادی الاوّل 1445ھ 29 نومبر 2023ء	110
28	خوف سے نجات کیسے؟	بروز جمعرات 18 جمادی الاوّل 1445ھ 30 نومبر 2023ء	113
29	مہلتِ عمل بہت تھوڑی!	بروز جمعتہ المبارک 19 جمادی الاوّل 1445ھ یکم دسمبر 2023ء	116
30	حقیقی امن کی راہ، کیسے؟	بروز ہفتہ 20 جمادی الاوّل 1445ھ 2 دسمبر 2023ء	118
31	اک شخص اندھیرے میں اجالے کی طرح تھا	بروز سوموار 22 جمادی الاوّل 1445ھ 4 دسمبر 2023ء	122
32	دعا کیوں ضروری ہے	بروز جمعرات 25 جمادی الاوّل 1445ھ 7 دسمبر 2023ء	129
33	رسوائیاں ہمارا مقدر کیوں؟	بروز ہفتہ 27 جمادی الاوّل 1445ھ 9 دسمبر 2023ء	133
34	ٹرائیکا اور پاکستانی ممکنہ انتخابات	بروز سوموار 29 جمادی الاوّل 1445ھ 11 دسمبر 2023ء	138
35	شاہی فرمان اور کورا کاغذ	بروز بدھ یکم جمادی الثانی 1445ھ 13 دسمبر 2023ء	142
36	سیاست میں کس کا سکہ معتبر"	بروز جمعرات 2 جمادی الثانی 1445ھ 14 دسمبر 2023ء	145
37	یائے رسول ﷺ کے نقوش	بروز ہفتہ 4 جمادی الثانی 1445ھ 16 دسمبر 2023ء	149
38	سنہری کلغیوں والے مرغانِ چمن	بروز اتوار 5 جمادی الثانی 1445ھ 17 دسمبر 2023ء	152
39	حادثہ یا اتفاق	بروز منگل 7 جمادی الثانی 1445ھ 19 دسمبر 2023ء	157
40	غلامی کا طوق	بروز بدھ 8 جمادی الثانی 1445ھ 20 دسمبر 2023ء	160
41	قائداعظم، اقبال اور پاکستان	بروز جمعرات 9 جمادی الثانی 1445ھ 21 دسمبر 2023ء	163
42	اندلس کے بعد اب بھارت!	بروز ہفتہ 11 جمادی الثانی 1445ھ 23 دسمبر 2023ء	167
43	نوحہ پڑھتے ہوئے صبح وشام	بروز سوموار 13 جمادی الثانی 1445ھ 25 دسمبر 2023ء	172
44	سرشاری ہی سرشاری	بروز منگل 14 جمادی الثانی 1445ھ 26 دسمبر 2023ء	176
45	کچھ اس کا بھی علاج اے چارہ گراں!	بروز جمعرات 16 جمادی الثانی 1445ھ 28 دسمبر 2023ء	181
46	بحیرہ روم۔۔۔ مفادات کا نیا میدانِ جنگ	بروز جمعتہ المبارک 17 جمادی الثانی 1445ھ 29 دسمبر 2023ء	183
47	حادثہ یا اتفاق	بروز اتوار 19 جمادی الثانی 1445ھ 31 دسمبر 2023ء	186
48	مجرم کون؟	بروز سوموار 20 جمادی الثانی 1445ھ یکم جنوری 2024ء	189
49	اقبال اور پاکستان	بروز بدھ 22 جمادی الثانی 1445ھ 3 جنوری 2024ء	192
50	اقبال کا یقین کامل	بروز جمعتہ المبارک 24 جمادی الثانی 1445ھ 5 جنوری 2024ء	198
51	ستم کی آندھیاں، ظلم کی بجلیاں	بروز اتوار 26 جمادی الثانی 1445ھ 7 جنوری 2024ء	203
52	ظلم کب تک؟	بروز منگل 28 جمادی الثانی 1445ھ 9 جنوری 2024ء	207

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ
53	سرخ گلاب کی دبیز چادر	بروز بدھ 29 جمادی الثانی 1445ھ 10 جنوری 2024ء	210
54	تاریخ کا رخ بدلنے والا ہے	بروز جمعرات یکم رجب المرجب 1445ھ 11 جنوری 2024ء	213
55	طاقت اور بد دعاؤں کی جنگ	بروز جمعتہ المبارک 2 رجب المرجب 1445ھ 12 جنوری 2024ء	216
56	غلاظت اور سڑاند بھرے کچرا گھر	بروز ہفتہ 3 رجب المرجب 1445ھ 13 جنوری 2024ء	219
57	چنگاری	بروز اتوار 4 رجب المرجب 1445ھ 14 جنوری 2024ء	222
58	قرآن اور موسیقی	بروز سوموار 5 رجب المرجب 1445ھ 15 جنوری 2024ء	225
59	ناشکرا انسان	بروز جمعرات 8 رجب المرجب 1445ھ 18 جنوری 2024ء	231
60	ناقابلِ تلافی جرم	بروز ہفتہ 10 رجب المرجب 1445ھ 20 جنوری 2024ء	233

سقوطِ کشمیر.....ذمہ دار کون؟

میں کس منہ سے اس بزرگ سید صاحب کا شکریہ ادا کروں جو ہمیشہ مشکل وقت میں بھولا ہوا سبق یاد دلا دیتے تھے۔ جب بھی دل بہت بے چین اور اداس ہوتا تو فوری طور پر ان سے فون پر رابطہ پر ہمیشہ کی طرح دانش و حکمت کے ایسے موتی جھڑتے کہ روح تک سرشار ہو جاتی اور ہر مرتبہ تنگ دامنی کا معاملہ آن کھڑا ہوتا لیکن اب منوں مٹی میں پاکستانی جھنڈے میں ملبوس اللہ کے ہاں اپنی دائمی منزل پر اپنی وفاداریوں کے صلے میں یقیناً جنت میں بیٹھے اپنی جاودانی کامیابی پر مسرور ہوں گے۔ ان کے فراق میں ان کے موصول پیغامات سے دل کی پیاس بجھاتا رہتا ہوں۔ پچھلے دنوں ایک اہم کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا جہاں آزادی کے نامور ہیروز اور ان کی جدوجہد آزادی کی جب بات ہوئی تو میرے حصے کا تفاخر مرد مجاہد سید علی گیلانی کا تذکرہ آیا تو ایک عرصے کے بعد پھوٹتی سحر اچھی لگی، صبح نور کی تازگی دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی، اور سجدہ شکر ادا کیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ روح کا سارا آلام دھل گیا ہے اور روٹھے ہوئے الفاظ ایک دفعہ پھر ایک قطار میں مسکراتے کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں، پھر سے ہمدم، ہمدرد اور غم گسار، بڑھ کر گلے ملنے کیلئے متمنی، جونہی میرے بیانئے نے محبت سے بازو پھیلائے فوراً بغیر کسی تاخیر کے برچھی کی طرح سینے میں اتر گئے۔

یہ سب ایک بوڑھے، بیمار و علیل اور ایک سفید ریش کے حامل بزرگ کی وجہ سے ہوا جن سے ملاقات کی آرزو برسوں سے دل کو بے چین کئے ہوئے تھی ۔ میں جانتا ہوں کہ یہ دل کی مراد اب اس زندگی میں تو پوری نہیں ہو سکتی اور اس بات سے بھی واقف ہوں کہ کبھی نہ تو ان سے پہلے کی طرح بات ہو سکے گی اور نہ ہی ان کو دیکھ سکوں گا۔ سید علی گیلانی مرحوم جنہوں نے اس کارزار میں قدم رکھنے سے قبل اپنے رب سے یہ عہد کیا:قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ(انعام:162) کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

اپنی زندگی کے بیشتر قیمتی سال بھارتی مکار ہندو بنئے کی بنائی ہوئی جیلوں میں گزار دیئے اور برسوں گھر میں نظر بندی کی حالت میں ہی ان تمام ظالموں کی خواہشات کے منہ پر تھوک کر اپنے اس رب کے ہاں حاضر ہو گئے جس نے قرآن میں اپنے ایسے بندوں کو یہ بشارت دی کہ:یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ،ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً،فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ،وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ(الفجر:27-30)اے نفسِ مطمئن، چل اپنے ربّ کی طرف اِس حال میں کہ تُو﴿اپنے انجامِ نیک سے﴾خوش﴿اور اپنے ربّ کے نزدیک﴾پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے﴿نیک﴾بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنّت میں۔

زندگی کی آخری دہائی میں جہاں رابطے کے تمام ذرائع پر مکمل پابندی کے ظلم و ستم برداشت کئے وہاں ان کی اولاد پر بھی زندگی تنگ کر دی گئی۔ درجنوں مرتبہ جس کے مکان پر راکٹ برسائے گئے، جسے خلقِ خدا کے قلب و دماغ سے اتارنے کی ان گنت سازشیں کی گئیں لیکن وہ اتنا ہی زیادہ قلب و روح کی جان بنتا چلا گیا۔ جسے تھکا ڈالنے، دھمکانے اور خریدنے کا ہر حربہ آزمایا گیا لیکن وہ ہر دفعہ تازہ دم، کسی خوف سے عاری اور کسی بھی خطرے کی پرواہ کئے بغیر مایوسی کو دھتکارتے ہوئے منزل کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا.....اور بالآخر اس مظلوم نے اسی بے بس شہر سرینگر میں نظر بندی کی حالت میں اپنے رب سے ملاقات کیلئے رخصت ہو گیا جہاں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ کرنے والے اس بزرگ سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ کرفیو کا اعلان کر کے اس کے نماز جنازہ پر بھی پابندی لگا دی گئی اور کفن کے طور پر پاکستانی پرچم کو اتارنے کا حکم دیتے ہوئے مرد مجاہد کی وصیت کے خلاف شہداء کے

قبرستان میں دفن ہونے تک کی اجازت نہ دی گئی لیکن تاریخ نے دیکھا کہ دنیا بھر میں ان سے محبت کرنے والوں نے اپنے آنسوؤں کے ساتھ ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی اور میں نے سینکڑوں ایسے افراد کو بلک بلک رروتا ہوا دیکھا جنہوں نے کبھی ایک بار بھی ان کو نہ دیکھا اور نہ ہی براہ راست ان سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

اس مرد مجاہد کو کرفیو کی پابندیوں کی بناء پر برسوں مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے کی اجازت ملی، نہ ہی وہ اپنے کسی عزیز یا ہمدم کے ہاں کسی بھی خوشی یا غمی میں شریک ہونے دیا گیا، گویا اسے کشمیریوں سے دور رکھنے کی ایک سازش پر عمل جاری رہا لیکن اس تمام آلام و مصائب کے باوجود وہ اس شان اور عزم صمیم سے کھڑا رہا کہ عظمت اس پر ٹوٹ ٹوٹ کر برستی رہی اور اس کی ایک اپیل پر سارے کشمیر کے مرد وزن اور جوان دیوانہ وار گولیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونا اپنا ایمانی فرض سمجھتے رہے۔

دوسروں کا ذکر ہی کیا، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مقبوضہ کشمیر کی جماعت اسلامی نے بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور حریت کانفرنس سے مطالبہ کیا گیا کہ ان کو الگ کر کے جماعت کے کسی اور لیڈر کو نمائندگی کا اختیار دیا جائے۔ کمالِ جرأت لیکن نہائت صبر و تحمل کے ساتھ وہ اپنی راہ پر گامزن رہا۔ سرینگر کے ایک مزدور کا بیٹا جس نے اپنی بھرپور جوانی میں اپنے لئے ایک راہ چن لی تھی اور پھر عمر بھر ناک کی سیدھ میں اس راہ پر چلتا رہا اور کبھی کسی موقع پر اس کے قدم نہیں ڈگمگائے، جسے دیکھ کر تو حیرت ہوتی تھی، جس کے بارے میں سنو تو دل سے بے اختیار اس کی درازئ عمر کی دعائیں نکلتی رہیں اور غور کریں تو "اھدنا الصراط المستقیم" کا مفہوم سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ عمر بھر اس نے جھوٹ اور فریب کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور عمر بھر اس کو کوئی مشتعل بھی نہیں کر سکا۔

وہ جانتا تھا کہ راہ کٹھن بھی ہے اور طویل بھی لیکن وہ پھر بھی اپنی ترجیحات اور مقاصد پر یکسو رہا۔ وہ راز اس پر آشکار ہو گیا تھا کہ جس سے مسلم دنیا کے اکثر رہنما اب بھی بے خبر ہیں کہ عرصہ گیر امتحان میں اصل اہمیت کامیابی اور ناکامی کی نہیں، حسنِ نیت اور حسنِ عمل کی ہوتی ہے۔ آدمی نتائج کا نہیں جدوجہد کا مکلف ہے، نتیجہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پہلے تو وہ خود اپنی پارٹی قیادت کے خلاف صف آراء ہوا، جدجہد کے طویل برس اور ان گنت قربانیاں بھی اسے تھکانے میں ناکام رہیں۔ پارٹی کے کارکنوں کو آواز دی جو ہمیشہ کی طرح اس پر اعتماد اپنا نصب العین سمجھتے تھے کہ زندگی کی کتاب میں جاہ پسندی ، ریا اور مفاد کا کوئی باب نہیں۔ اپنا سارا اخلاقی دباؤ ڈال کر اس نے جماعت کی قیادت کو بدل ڈالا، پھر وہ حریت کانفرنس کی مصلحت کا شکار ہونے والی قیادت کے خلاف اٹھا.... ایک فرد، متعدد لیڈروں اور گروہوں کے خلاف جو پاکستان کو بھول کر بھارت سے مذاکرات پر آمادہ ہو گئے تھے، جانتے ہوئے بھی کہ کن لوگوں نے انہیں آمادہ کیا تھا۔

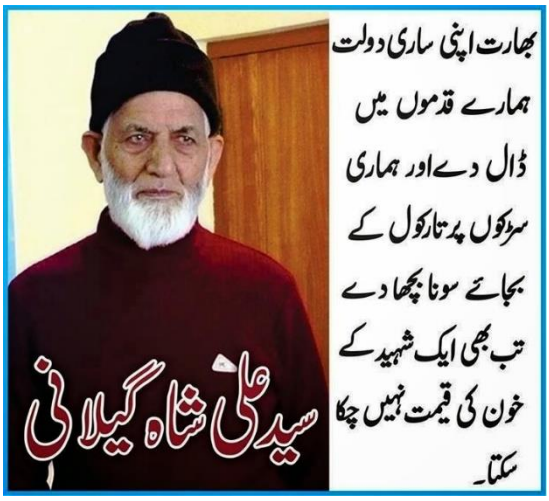

اندلس کا جلیل القدر حکمران درباریوں کے ساتھ نو تعمیر محل میں نمودار ہوا جس میں سونے کا قبہ جگمگا رہا تھا۔ جب دوسرے داد دے چکے تو قاضی سعید کی طرف متوجہ ہوا "بادشاہ تم پر شیطان سوار ہے" قاضی نے کہا کہ "سونے سے عمارتیں نہیں بنائی جاتی" آسمان اور زمین کے درمیان ایک سناٹا تھا اور دل تھے جو خوف اور

اندیشوں سے دھڑک رہے تھے۔ جب بادشاہ کی آواز ابھری ''سعید کو لوگ بے سبب ہسپانیہ کا ضمیر نہیں کہتے، قبہ گرا دیا جائے''۔

کبھی کبھی ایک تنہا آدمی اٹھتا ہے اور منظر کو بدل ڈالتا ہے۔ علی گیلانی فرشتہ نہیں ہے۔ چند لمحوں کیلئے مان لیتے ہیں کہ ان کے اپنے تعصبات ہو سکتے تھے اور ناقص فیصلے بھی، ان کی ہر رائے اور ہر اقدام سے اتفاق ضروری نہیں، نہ اس سے اختلاف کرنے والوں کی نیت پر شبہ کرنے کا کوئی جواز ہے، ہو سکتا ہے ان کی عقلیں وہی کہتی ہوں جس پر وہ عمل پیرا ہیں؟ دنیا کے بدلے ہوئے ناساز گار حالات اور پہاڑ جیسی رکاوٹیں، لیکن بزرگ درویش ان سے مختلف ثابت ہوا۔ وہ ایک صاحبِ یقین تھا اور صاحبِ یقین کبھی مرجھاتا اور مایوس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات سے اوپر اٹھ جاتا ہے اور ایک برتر مقصد کیلئے ہر چیز کو تیاگ دیتا ہے۔ قوموں کو ایسے لوگ انعام کے طور پر عطا کئے جاتے ہیں اور کوئی الٹا لٹک جائے ان کی راہ کھوٹی نہیں کر سکتا، اسی لئے وہ جدوجہد آزادی کا کامیاب استعارہ بن گیا۔

سید علی گیلانی نے حریت کانفرنس کی درماندہ قیادت اور اس کے عقب میں سازشیں کرنے والے بھارتیوں اور شاطر امریکیوں کو بالآخر شکست سے دوچار کر دیا جب استعمار سارا زور کشمیریوں کو تنہا کرنے کیلئے صرف کر رہا تھا، جبکہ پاکستانی حکومت بھی تھک چکی اور دیگر ادارے بھی راستہ بھول چکے ہیں۔ شاہ محمود قریشی نے بطور وزیر خارجہ امریکی ایماء پر کشمیر کی بندر بانٹ کرنے کیلئے ایک کشمیری لیڈر کے ساتھ ساز باز شروع کرتے ہوئے خصوصی طور پر واشنگٹن میں آصف زرداری کے ساتھ اس کشمیری لیڈر کی ملاقات بھی کروائی تھی تو یہ مردِ مجاہد سید گیلانی ہی تھے جنہوں نے بروقت اس سازش کی دہائی دیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح کشمیریوں کی مدد سے اس مذموم منصوبے کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ان دنوں بھی ٹیلیفون پر میری جب ان سے بات ہوئی تو ایک دفعہ پھر سید علی گیلانی نے پاکستانی حکمرانوں کو بھارت کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھانے پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ ممبئی میں دہشتگردی کا شور مچانے والا بھارت اب بلوچستان، سرحد، کراچی اور پاکستان کے دیگر دوسرے بڑے شہروں میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مسلسل دہشتگردی کا ارتکاب کرتے ہوئے پاکستان کی سلامتی کیلئے ایک مستقل سنگین خطرات پیدا کر رہا ہے اور پاکستانی حکومت ان کے ساتھ دوستی کیلئے مرتی جا رہی ہے۔ میں ان کی آواز کا کرب بڑی شدت اور ندامت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ سقوط کشمیر کا معاملہ بھی عمران خان کے اسی وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کے دور میں ہوا ہے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے سقوط کشمیر کے ذمہ داران کے خلاف کڑی تحقیق کیلئے انہیں احتساب کے کٹہرے میں کھڑا کر کے کشمیریوں کو یقین دلایا جائے کہ کشمیر کاوکیل آئندہ انہیں کبھی بھی مایوس نہیں کرے گا اور اس کے ساتھ ہی اقوام عالم کو یہ واضح طور پر بتائے کہ سفاک مودی کشمیر میں خونی کھیل کی آڑ میں کشمیر کی آبادی کا تناسب بدلنے کی جو کوششیں کر رہا ہے اس سے اگر خطے میں جنگ کا آتش فشاں پھٹ گیا تو نہ صرف جنوبی ایشیا میں تباہی وبربادی ہو گی بلکہ یہ عالمی جنگ کا بھی پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ دیگر مسلم ممالک میں بھی کشمیر کے حالات سے متعلق شدید تشویش اور غصہ پایا جاتا ہے بلکہ مودی کی فسطائیت کا کینیڈا میں خالصتانی سکھ کے قتل نے دنیا کے سامنے بھارت کا مکروہ چہرہ عیاں کر دیا ہے

اگر اب بھی بین الاقوامی سطح پر اس معاملے میں سنجیدہ کوششیں نہ کی گئیں تو دنیا کو ایک بڑی ہولناک جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا جو کہ یقینی طور پر ایٹمی جنگ ہو گی اور اس تباہی سے بچنے کا واحد حل یہی ہے کہ حقدار کو اس کا حق دیا جائے تاکہ اس خطے میں امن قائم رہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں ظلم وبربریت کے پہاڑ توڑ رہا ہے اور وہ نہتے اور مجبور کشمیریوں پر غیر انسانی اور غیر اخلاقی دونوں طرح کے حربے آزما رہا ہے

۔کشمیری شہری یہ ظلم و ستم گزشتہ 76 سال سے سہہ رہے ہیں اور اپنے حق کیلئے مردانہ وار لڑ رہے ہیں۔ انڈین آرمی کی تقریباً ساڑھے دس لاکھ سے زائد تعداد (جو ہر طرح سے مسلح ہیں) تحریکِ حریت کی آگ کو بجھا نہیں پا رہی اور نہ بجھا پائے گی۔ بھارت تحریکِ حریت کو ختم کرنے کی اور کشمیر پر مکمل قبضہ کرنے کی سر توڑ کوششیں کر رہا ہے اور ان کوششوں میں اس کے ساتھ اب مزید خوارجی ممالک بھی شامل ہو گئے ہیں جن میں اسرائیل سرِ فہرست ہے۔

5 / اگست کو آرٹیکل 370 ختم کرنے کے بعد بھارت نے کشمیر کو اپنا حصہ بنانے کیلئے وہی حکمتِ عملی اپنائی ہے جو کبھی اسرائیل نے فلسطین پر قبضہ کرنے کیلئے بنائی تھی کہ سب سے پہلے کچھ اسرائیلی فلسطین جا کر آباد ہوئے پھر انہوں نے اپنی آبادی میں اضافہ شروع کیا اور مقامی فلسطینیوں سے منہ مانگی قیمتوں پر زمینیں اور جائدادیں حاصل کرنا شروع کی اس کے بعد انہیں لالچ دیا اور پھر تیزی سے منہ مانگی قیمت پر زیادہ سے زیادہ زمینیں خریدنے لگے اور زیادہ تر فلسطینی علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ بالکل یہی طریقہ اب بھارت نے آرٹیکل 370 کا خاتمہ کر کے مقبوضہ جموں کشمیر میں اپنایا ہے۔ انڈین آرمی بلا اجازت گھروں میں داخل ہو کر جسے چاہتی ہے اٹھا لیتی ہے۔ خاص طور پر جوان بچوں کو حریت پسند کہہ کر اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور پھر چند دن کے بعد ان کی تشدد شدہ لاشیں کسی اور علاقے سے ملتی ہیں اسی طرح مسلم عورتوں کو گھروں سے اٹھا لیا جاتا ہے اور عصمت دری کے بعد یا تو مار دیا جاتا ہے یا پھر انتہائی بری حالت میں مجبور خواتین کسی علاقے میں پھینک دی جاتی ہیں۔ یہی نہیں کسی بھی گھر کو آگ لگانا گھر سے سامان لے جانا اور توڑ پھوڑ کرنا تو روز کا معمول بن گیا ہے۔ بین الاقوامی میڈیا کو کشمیر سے دور رکھا جا رہا ہے۔ مودی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تحریک حریت کو بندوق کے زور پر کچل دیا جائے۔ مودی حکومت برہان وانی کی شہادت بعد نوجوانوں کے جذبہ آزادی دیکھ کر حواس باختہ ہو چکی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہزاروں نوجوانوں کو پکڑ کر عقوبت خانوں میں پہنچا دیا گیا ہے۔

سید علی گیلانی کو میرا، ایک عام پاکستانی کا سلام پہنچے۔ انہوں نے اپنے عمل سے ہماری ساری مایوسی دھو ڈالی ہے۔ ہمارے لئے انہوں نے ایک تابہ فلک ایک مشعل فروزاں کر دی ہے اور ہمیں یاد دلایا ہے کہ انسانیت کا مستقبل ابلیس اور مایوسی پھیلانے والے اس کے کارندوں کے پاس نہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ جو امید کا رب ہے اور جس کی کتاب برملا یہ کہتی ہے کہ "الیس اللہ بکاف عبدہٗ" (کیا اللہ اپنے بندوں کیلئے کافی نہیں)۔ اس کانفرنس میں ایک خصوصی ملاقات میں انسانی بنیادی حقوق پر نگاہ رکھنے والی تنظیموں ایمنسٹی انٹرنیشنل، واچ ڈاگ، ہیومن رائٹس انٹرنیشنل، اینٹی سلیوری انٹرنیشنل اور گلوبل رائٹس کو کشمیریوں پر ہونے والی زیادتیوں سے جب آگاہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تمام ادارے بھی کشمیریوں کے انسانی حقوق اور دیگر حقوق تلفی کا نہ صرف اعتراف کرتے ہیں بلکہ ان کی ثابت قدمی پر بھی نازاں ہیں اور ایک بار پھر کشمیریوں کے حقوق کی بازیابی کیلئے سرگرم ہونے کا یقین دلایا ہے۔ جناب سید صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ کا تذکرہ ہمیشہ ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلاتا رہے گا۔

بروز جمعرات 21 ربیع الاول 1445ھ 5 / اکتوبر 2023ء

کشمیر.....فولادی عزم کی ضرورت

سوبدائی بہادر منگولوں کے عظیم بادشاہ چنگیز خان کا ایک نامور سالار گزرا ہے۔ خانہ بدوش منگول لٹیرے تموجین سے خان اعظم چنگیز خان بننے تک کے سفر میں سوبدائی کا سب سے اہم حصہ رہا ہے۔ عسکری ماہرین کہتے ہیں کہ اگر سوبدائی چنگیز خان کا کمانڈر نہ ہوتا تو شاید منگول اس قدر حیران کن فتوحات نہ حاصل کر پاتے۔ سوبدائی نے بیس کے قریب جنگیں اور بے شمار لڑائیاں لڑیں مگر کسی میں شکست نہیں ہوئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ بطور کمانڈر (سالار) اس نے جس قدر علاقہ فتح کیا، انسانی تاریخ میں اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ سوبدائی انتہائی زیرک اور شاطر جنگجو تھا۔ اسلامی تاریخ کے ایک بے مثل جنگجو بیبرس نے عین جالوت کے مقام پر ہلاکو خان کے سالار بوغا کو شکست دی جو منگولوں کو 38 برس میں ہونے والی شکست تھی جو ان کے زوال کا سبب بنی۔

سوبدائی نے چین اور مشرقی یورپ میں شاندار فتوحات حاصل کیں۔ پولینڈ اور ہنگری کی فوجوں کو صرف دو دنوں میں تباہ و برباد کر دیا۔ منگولوں کے مطابق سوبدائی پر چالیس دیوتاؤں کی جانب سے اترتی ہیں۔ چنگیز خان کے بعد اس کا بیٹا اوغدائی خان اعظم بنا۔ روس، بلغاریہ اور دوسرے علاقوں پر حملہ کیلئے اس نے منگول شہزادے باتو خان کی رہنمائی کیلئے سوبدائی کو بھیجا۔ سوبدائی بوڑھا اور اس قدر موٹا ہو چکا تھا کہ گھوڑے کیلئے اس کا وزن اٹھانا ممکن نہیں رہا۔ اس کے باوجود باتو خان سوبدائی کو ایک رتھ میں بٹھا کر ساتھ لے گیا تاکہ جنگ کے دوران سوبدائی کی شاطرانہ چالوں سے فائدہ اٹھا سکے۔ اوغدائی کے بعد اس کا بیٹا قویوق خان اعظم بنا۔ اس نے سوبدائی کو بلا بھیجا۔ سوبدائی نے پیرانہ سالی کے باعث مستعفی ہونے کی درخواست کی تو نوجوان قویوق نے تجربہ کار سالار سے پوچھا "سوبدائی بہادر! میں فیصلہ سازی میں کمزور ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ میرا عظیم دادا کیا کرتا تھا؟

سوبدائی بہادر نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ترچھی آنکھوں سے خان اعظم قویوق کو دیکھا اور اپنی روایتی صاف گوئی سے بولا، مجھے تمہاری بات سن کر خوشی نہیں ہوئی۔ یاد رکھو! بادشاہ کبھی اپنے فیصلوں میں گومگو کا شکار نہیں ہوتے۔ مستقبل کے اندیشوں اور ممکنہ خطرات سے گھبرانا سپاہیوں کو نہیں تاجروں کو زیب دیتا ہے۔ تمہارے دادا چنگیز خان کی فتوحات کا سب سے بڑا راز تربیت یافتہ فوج اور جنگی چالوں سے زیادہ اس کا فولادی عزم اور واضح اہداف تھے۔ خان اعظم کے بے شمار دشمن تھے۔ خود منگولوں میں سے کئی سردار اس کے مخالف تھے۔ اس کے باوجود خان کبھی بھی سازشوں سے نہیں گھبرایا۔ مضبوط عزم اور واضح اہداف رکھنے والا سالار یا بادشاہ کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوتا"۔

امیر تیمور ایک شاندار جنگجو اور دانا شخص تھا۔ اس کی سوانح پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اپنے تمام تر مظالم اور شخصی کمزوریوں کے باوجود وہ ایک غیر معمولی شخص تھا۔ امیر تیمور کا مشہور قول ہے کہ کمزوری یا طاقت کوئی الگ شے نہیں۔ مخالف کی کمزوریاں کسی شخص کو طاقتور بنا دیتی ہیں۔ اسی طرح اس کی اپنی کمزوری دشمن کو طاقتور بناتی ہے۔ منگول قائد کے ایک قول کو ہمیشہ دہراتا تھا کہ "سپاہی کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ بہادری، جرأت اور دلیری کا راستہ، جسے مضبوط عزم ہی سے عبور کیا جا سکتا ہے"۔

اس قصے پر سنجیدگی سے غور کریں تو ہمیں تین کامیاب اسباق ملتے ہیں:

پہلا تو نوجوان منگول کا بہادر سودائی کے سامنے یہ اعتراف کہ "میں فیصلہ سازی میں کمزور ہوں اور اس کے جواب میں سودائی کے تاریخ ساز جواب دوبارہ پڑھ لیں کہ فیصلوں میں گومگو، اندیشوں اور ممکنہ خطرات سے گھبرانے کی کیفیت سے گریز اور فولادی عزائم کو اپنانے کی نصیحت نظر آتی ہے اسی سبق کی روشنی میں ہم اپنا محاسبہ کرتے ہیں کہ کیا ہم آج تک کشمیر کے معاملے میں گومگو کا بری طرح شکار نہیں ہیں۔ پچھلی سات دہائیوں میں کشمیر کے بارے میں اپنی خارجہ پالیسی کا جائزہ لیں تو کوئی ایک پالیسی بتادیں جس پر ہم نے باقاعدہ عمل کر کے کشمیر کی ایسی وکالت کی ہے جس کی بناء پر ہم اقوام عالم کو مجبور کر سکیں کہ مشرقی تیمور کی طرح کشمیر کا تنازعہ حل کئے بغیر دنیا کا امن مسلسل ایک ایسا خطرناک بن سکتا ہے کہ جس سے ساری دنیا کو تباہی کا منہ دیکھنا پڑ سکتا ہے۔ میں آپ سب کے سامنے تاریخ کا وہ آئینہ رکھ دیتا ہوں جس میں ہم اپنے چہرے کا جائزہ لے سکتے ہیں: ہم نے آج تک کشمیر کے ساتھ جس طرح دیا ہے، وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔

72 سالوں سے ہم کشمیریوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ لاکھوں کشمیری شہید ہو گئے ہم ساتھ کھڑے ہیں۔ لاکھوں کشمیری بہنوں بیٹیوں کی عزتیں لٹ گئیں مگر ہم ساتھ کھڑے ہیں۔ لاکھوں مائیں بیوہ ہو گئیں ہم ساتھ کھڑے ہیں۔ لاکھوں بچے یتیم ہو گئے ہم ساتھ کھڑے ہیں۔ لاکھوں کشمیری ہم سچ کب بولیں گے کہ کشمیری ہمارے معذور ہو گئے ہم ساتھ کھڑے ہیں۔ اب کشمیر کی شناخت بھی ختم کر دی گئی ہے اور ہم ساتھ کھڑے ہیں۔ آخر وعدوں پر یقین کر کے لٹ گئے جبکہ ہم لیٹ گئے ہیں۔ کیا ہم یہ بھول گئے کہ امریکا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ٹرمپ نے برملا کشمیر کے معاملے پر ثالثی کی آفر کی تو اس سے اگلے دن ہی میں نے ایک عالمی ٹی وی چینل پر اپنے پروگرام میں یہ دہائی دی کہ لو گو اب کشمیر ہمارے ہاتھوں سے مکمل طور پر نکل گیا ہے تو بے شمار یوتھیوں نے سوشل میڈیا پر اپنی جس تربیت کا اظہار کیا، وہ سارے پھول میں نے اپنے دامن میں جمع کر لئے ہیں اور یوم آخرت کو یہ سارا گلدستہ اپنے رب کے ہاں پیش کر دوں گا۔

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

کشمیریوں کو ذلت کی زندگی سے نکالنے کیلئے گومگو کی کیفیت سے نکل کر یقینِ محکم کے ساتھ فیصلے کرنا ہوں گے اور پھر ان فیصلوں پر اسی طرح ڈٹ کر کھڑا ہونا پڑے گا جیسا فیصلہ 23 سال پہلے ملا عمر نے کیا تھا اور اس فیصلے کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ اس سرزمین کے سپوتوں نے دنیا کی تین بڑی طاقتوں کے قبرستان اپنے ہاں قائم کر کے ایک تاریخ رقم کی ہے۔ اسی طرح کشمیر میں بھی درجنوں شہداء کے قبرستان وجود میں آچکے ہیں اور ان شہداء کے قبرستان سے مجھے کشمیر کا مرد حر سید علی گیلانی یاد آگئے جنہوں نے ان شہدا کے قبرستان میں دفن ہونے کی وصیت کی تھی لیکن بزدل ہندو بنیاء ان کی میت سے بھی اس قدر خوفزدہ ہوا کہ زبردستی ان کے اہل خانہ سے ان کی میت چھین کر اپنی مرضی سے حیدر پورہ کے قبرستان میں دفن کر دیا اور بعد ازاں ان کے اہل خانہ پر مقدمہ دائر کر دیا گیا کہ انہوں نے اس میت کو پاکستانی جھنڈے میں کیوں لپیٹ کر رکھا ہوا تھا۔

مانگے جو کوئی مجھ سے تیرے نام کا صدقہ
میں خود کو پھینک دوں تیرے سر سے وار کر

جب سید علی گیلانی کی طبیعت اچانک اس قدر بگڑ گئی کہ کئی ایسی افواہوں نے جنم لے لیا کہ ساری دنیا میں ان سے محبت کرنے والوں میں ایک اضطراب پیدا ہو گیا اور میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور فوری طور پر رابطہ کیا تو ان کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر نعیم صاحب نے افواہوں کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ حالت بہت نازک ہو گئی ہے اور دعاؤں کی بھی اشد ضرورت ہے مگر والد محترم نے مودی سرکار کی طرف سے میڈیکل سہولت اور خصوصی طیارے کی آفر کو مکمل طور پر مسترد کرتے ہوئے سارا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے اور موسم کی خرابی کی بناء پر ہم اپنے تئیں کم از کم آج دہلی جانے سے قاصر ہیں۔ پھر ان کے وصال سے چند گھنٹے قبل کی ویڈیو نے تو ساری دنیا کو ششدر کر دیا کہ کس طرح اللہ اور رسول کی گواہی دینے کے بعد پاکستان کے قومی ترانے کے بول ان کے لبوں پر تھے، جب موت سامنے ہو تو بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے اور صرف صاحبِ کردار ہی ایسی مثالیں قائم کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ میری جب ان سے بات ہوئی تو بڑی دلسوزی سے فرمانے لگے:

''سننے میں آیا ہے کہ پاکستان بھارت کو "موسٹ فیورٹ ملک" کا درجہ دینے کیلئے تیار ہے اور اب صرف کسی بھی وقت اعلان کرنا باقی ہے۔ اس بارے میں ہم جموں وکشمیر کے مظلوم عوام کی ترجمانی کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہمیں بھارت کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے، بھارت اور پاکستان کے درمیان تعلقات خوشگوار ہو جائیں اس کیلئے ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ بھارت جو جموں وکشمیر کے عوام کا بنیادی اور پیدائشی حق پچھلے محض طاقت کی بنیاد پر سلب کئے ہوئے ہے اور اب تک جموں وکشمیر کے عوام نے 1947ء سے لیکر اب تک اپنے بنیادی حق کے حصول کیلئے سوا لاکھ سے زائد اپنی جانوں کی جو قربانیاں دی ہیں، عزتیں اور عصمتیں لٹ گئیں ہیں، بستیاں اجاڑ دی گئیں ہیں اور اب تک بھارتی فورسز کی جانب سے جموں وکشمیر کے عوام کو بے پناہ مظالم کا نشانہ بنایا جارہا ہے، اب ایسے ماحول میں پاکستان کا بھارت کو بہت ہی پسندیدہ ملک قرار دینا جموں وکشمیر کے مظلوم عوام کے زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہو گا اور جموں وکشمیر کی غالب اکثریت بہت ہی دکھ اور صدمہ محسوس کرے گی کیونکہ پاکستان نے بھی جموں وکشمیر کے مسئلے کے حل کیلئے اب تک بے مثال قربانیاں دی ہیں اور ہندوستان کی ہٹ دھرمی اور ضد کے کے نتیجے میں اب تک بڑی تکالیف، جبر وستم اور مظالم کا نشانہ بنائے جارہے ہیں تو ایسے ماحول میں بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دینا، یہ جموں وکشمیر کے عوام کی بے پناہ قربانیوں اور خود پاکستانی عوام کی بے مثال قربانیوں کے منافی ہو گا اور یقیناً کشمیری اور پاکستانی عوام اس عمل کو انتہائی ناپسند کریں گے کہ ان کی قربانیوں اور اصولی مؤقف کو پاک بھارت تجارت پر قربان کر دیا جائے"۔

دوسرا سبق سیکھنے کا یہ ہے کہ "سپاہی کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ بہادری، جرأت اور دلیری کا راستہ، جسے مضبوط عزم ہی سے عبور کیا جاسکتا ہے ''کوئی بھی نہیں کہے گا کہ جنگ کرنا اچھی بات ہے، جنگ سے ملک تباہ ہو جاتے ہیں، ناقابل تلافی حد تک جانی ومالی نقصان معیشت کو برباد کر دیتا ہے۔ بظاہر ایسے حقائق بہت وزنی معلوم ہوتے ہیں اور کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا لیکن:

1- گزشتہ دو صدیوں سے امریکا نے ایک دن کیلئے بھی جنگ بند نہیں کی۔

2- اپنے قیام سے لیکر آج تک اسرائیل حالتِ جنگ میں ہے اور اس جنگ نے اسے مضبوط اور طاقتور بنا دیا ہے جبکہ جنگ سے منہ چھپانے والے عرب دن بدن کمزور اور بزدل ہو گئے ہیں۔

3- گزشتہ صدی میں سب سے طویل اور خوفناک جنگیں جاپان، جرمنی اور کوریا نے لڑی ہیں اور آج یہی تین ممالک ترقی میں سب سے آگے نکل گئے ہیں اور دنیا کی مضبوط ترین معیشت کے مالک ہیں۔

4-پہلی 12 صدیوں میں مسلمان مسلسل جنگوں میں مصروف رہے (جہاد، جس کا حکم اللہ نے قرآن میں 484 مرتبہ دیا ہے) اسی دوران وہی سب سے زیادہ ترقی یافتہ، طاقتور اور مضبوط رہے جبکہ گزشتہ دو صدیوں سے مسلمانوں کو جنگوں سے ڈرنے اور بزدلی کا سبق پڑھایا گیا ہے۔ حالیہ دو صدیوں میں مسلمان نہ صرف غربت کا شکار ہوئے ہیں بلکہ ترقی میں بھی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اسی لئے ہم کفار کا تر نوالہ بن گئے ہیں۔ یاد رکھیں جو قومیں تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتیں، ان کا جغرافیہ تبدیل ہو جاتا ہے اور ہمارے ساتھ تو یہ ہو چکا ہے۔ کیا مودی نے بنگلہ دیش کی سرزمین پر جا کر خود یہ اقرار نہیں کیا کہ ہم نے قیامِ پاکستان کے وقت ہی اس کو ختم کرنے کی پالیسیوں پر عملدرآمد شروع کر دیا تھا اور بنگلہ دیش میں سب سے پہلے ہم نے اسکول، کالجز اور یونیورسٹی میں ہندو اساتذہ کو دو قومی نظریئے کی تنسیخ کا کام سونپا جس کے نتیجے میں ہم نے دو قومی نظریے کو خلیج بنگال میں ڈبو کر بنگلہ دیش کی بنیاد رکھ دی اور آخری حربے کے طور پر ہم نے اپنے فوجیوں کو اس سرزمین پر اتار کر پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ کیا ہماری کسی بھی حکومت نے ہندوستان کے اس ظالم و مکار ہندو مودی کے اس بیان کے خلاف عالمی عدالت میں جنگی جرائم کا مقدمہ دائر کیا؟ کیا اقوام متحدہ میں اس بیان کے خلاف صدا بلند کی گئی؟

اس بیان کے بعد ہمارے دفتر خارجہ نے کیا اقدامات اٹھائے؟ کیا قوم کا کروڑوں روپے کا بجٹ ہر سال ان کی عیاشی کیلئے مختص کیا جاتا ہے؟ ہم نے کشمیر کمیٹی تشکیل دی اور سب سے بڑا مذاق اس کے ساتھ اب بھی جاری ہے۔ جب سے اس کمیٹی کا اعلان ہوا ہے، اس کی کارکردگی پر کوئی رپورٹ جاری ہوئی؟ ہم نے اس کمیٹی کو قائم کر کے سیاسی مفادات کے حصول کا ایک ذریعہ بنالیا اور ایسے افراد کی تقرری کی گئی جس کو شائد کشمیر کی تاریخ تو کجا اس کے صحیح ہجے بھی نہیں آتے ہوں گے۔ محض ان کے بیرونی دوروں پر کروڑوں روپے کے اخراجات اور ملک میں بڑی بڑی گاڑیوں اور بھاری اخراجات پر مبنی دفتر کی آرائش اور سیاسی مفادات کی تکمیل کا ذریعہ بنائے رکھا اور اب تک انتہائی غیر سنجیدہ افراد کے ہاتھوں کشمیر کمیٹی کے نام کو داغدار بنا کے رکھ دیا ہے۔ عمران کے دورِ حکومت میں تو ایسا غیر سنجیدہ آدمی جس کے منہ کو بواسیر لاحق ہے، اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کیلئے کبھی سید علی گیلانی جیسے بلند قامت شخص پر انگلی اٹھا کر اپنی غلامی کے طوق کی سند حاصل کرتا رہا تو کبھی امریکا کے ہوائی اڈے پر امیگریشن کے روکنے پر وہاں کے سفارت خانہ کی مداخلت پر داخلہ حاصل کرتا ہے اور امریکی سڑکوں پر کاؤبوائے کی طرح ایک انتہائی فضول اور بے معنی اور بے مقصد بیان داغ کر کشمیر کاز کو نقصان پہنچا کر اپنے آقاؤں کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتا؟ سوال یہ ہے ایسے افراد کا کب احتساب ہو گا کیا قومی خزانہ ایسے اوباش افراد کیلئے تھا جس نے قوم کے ٹیکس کو مادرِ پدر کا مال سمجھ کر برباد کر دیا۔

اب آیئے تیسرا اور اہم سبق کی طرف چلتے ہیں۔ بابل کے بادشاہ بالش ضر کی غلطیوں پر اسے ایک غیبی ہاتھ نے واضح الفاظ میں نوشتہ دیوار دکھایا تھا "تمہیں آزمایا گیا' مگر تم تول میں پورے نہیں اترے اور ہلکے ثابت ہوئے۔" کیا ہمارے مقتدر حلقے سوبدائی بہادر سے اتفاق کرتے ہیں کہ حکمران کبھی اپنے فیصلوں میں گومگو کا شکار نہیں ہوتے، مستقبل کے اندیشوں اور ممکنہ خطرات سے گھبرانا سپاہیوں کو نہیں تاجروں کو زیب دیتا ہے۔ پاکستانی سیاست میں بھی آزمائش کا وقت آپہنچا ہے۔ اس میں صرف عوام کے دلوں کی آواز سننے والا ہی سرخرو ہو سکے گا۔ تاریخ کا یہ ابدی سبق ہے کہ صرف وہی لیڈر فتح یاب ہوتا ہے جو فولادی عزم اور واضح ویژن کے ساتھ میدان میں قدم رکھے۔

بروز بدھ 27 ربیع الاول 1445ھ 11 / اکتوبر 2023ء

قابلِ رشک کامیابی

لفظ بھی بچوں کی طرح ہوتے ہیں، معصوم اور بھولے بھالے بچوں کی طرح، بہت محبت کرنے والے، لاڈ و پیار کرنے والے، ناز و ادا والے، تنگ کرنے والے، روٹھ جانے والے اور پھر بہت مشکل سے ماننے والے یا ہمیشہ کیلئے منہ موڑ لینے والے۔ کبھی تو معصوم بچوں کی طرح آپ کی گود میں بیٹھ جائیں گے پھر آپ ان کے بالوں سے کھیلیں، ان کے گال تھپتھپائیں تو وہ کلکاریاں مارتے ہیں، انہیں چومیں چاٹیں بہت خوش ہوتے ہیں وہ۔ آپ ان سے کسی کام کا کہیں تو وہ آمادہ ہو جاتے ہیں۔ محبت فاتح عالم جو ہے۔ کبھی تنگ کرنے پر آجائیں تو ان کا رنگ انوکھا ہو جاتا ہے۔ آپ ان کے پیچھے دوڑ دوڑ کر تھک جاتے ہیں لیکن وہ ہاتھ نہیں آتے کہیں دم سادھے چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور آپ انہیں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ آپ ہلکان ہوں تو ہو جائیں وہ آپ کو "دیکھو میں آگیا" کہہ کر آپ کے سامنے کھڑے مسکرانے لگتے ہیں۔ تنگ کرنے پر اترے ہوتے ہیں اور جب آپ کی ہمت جواب دے جاتی ہے تو وہ بچوں کی طرح لفظوں کے بھی بہت ناز نخرے اٹھانے پڑتے ہیں اور اگر اللہ نہ کرے وہ روٹھ جائیں اور آپ انہیں منانے کی کوشش بھی نہ کریں تب تو قیامت آجاتی ہے۔ ایک دم سناٹا، تنہائی اداسی، بے کلی آپ میں رچ بس جاتی ہے، آپ خود سے بھی روٹھ جاتے ہیں۔ ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ کا تو میں نہیں جانتا، میرے ساتھ تو ایسا ہی ہے۔ میں گزشتہ ایک ہفتے سے اسی حالت میں ہوں۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا، بے معنی لگتی ہے زندگی، دوبھر ہو گیا ہے جینا ..... لیکن پھر وہی جبر کہ بڑا مشکل ہے جینا، جئے جاتے ہیں پھر بھی۔

وطنِ عزیز کی طرف نگاہ اٹھتی ہے تو دل میں ایک کسک سی پیدا ہو جاتی ہے کہ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟ پھر سوچتا ہوں کوئی بھی ہو..... جب طاقت ہو اس کے پاس ہتھیار بند جتھہ ہو، حکم بجالانے والے خدام ہوں، راگ رنگ کی محفلیں ہوں، جام ہوں، عشوہ طرازی ہو، دل لبھانے کا سامان ہو، واہ جی واہ جی کرنے والے خوشامدی اور بغل بچے ہوں..... تو اس کے دیدے شرم و حیا سے عاری ہو جاتے ہیں۔ شرم و حیا کا اس سے کیا لینا دینا! چڑھتا سورج اور اس کے پوجنے والے بے شرم پجاری جن میں عزتِ نفس نام کو بھی نہیں ہوتی۔ بس چلتے پھرتے روبوٹ..... تب طاقت کا نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ عدلیہ جن افراد کو ملکی دولت لوٹنے کا مجرم ٹھہراتی ہے، انہی کو بلا کر وزارت عطا کر دی جاتی ہے کہ کر لو جو کچھ کرنا ہے ہم تو دھڑلے سے ایسے ہی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے رہیں گے۔

6 ستمبر 65 کی رات بھی عجیب سی تھی۔ بے کلی کم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی اور بالآخر صبح ہوئی تو پتہ چلا کہ مکار ہندو بنئے نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے اور پہلی مرتبہ ساری قوم کو ایسا یکجا، مضبوط اور متحد دیکھا کہ پہاڑوں سے ٹکرا جانے کا حوصلہ پیدا ہو گیا اور ہر شہری محاذ پر جانے کیلئے بے چین نظر آرہا تھا لیکن مجھے آج کے حالات کے برعکس ان کرداروں کا ذکر کرنا ہے کہ جن کا ذکر آنکھوں کی ٹھنڈک، دلوں کا سکون اور اطمینان و فرحت بخش ہے۔ ہاں کوئی بھی ہو، کہیں بھی ہو، انکار سننا تو اس کی لغت میں ہی نہیں ہوتا۔ انکار کیا ہوتا ہے وہ جانتا ہی نہیں ہے لیکن ہوتا یہی آیا ہے، ہوتا یہی رہے گا۔ منکر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ نہیں ماننے کا نعرۂ مستانہ گونجتا رہتا ہے، تازیانے برستے رہتے ہیں، کھال کھنچتی رہتی ہے، خون بہتا رہتا ہے لیکن عجیب سی بات ہے، جتنی زیادہ شدت سے نہیں ماننے کی آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے، ہر جتن ہر حربہ اپنایا جاتا ہے، وہ آواز اسی شدت سے گونجنے لگتی ہے چاروں طرف۔ نہیں ماننے کا رقص..... رقص ہی نہیں رقصِ بسمل، نہیں ماننے نہیں ماننے کا نغمہ اور گھومتا ہوا رقّاص۔

کیابات ہے جی، کھولتے ہوئے تیل کے اندر ڈالا جاتا ہے، تپتے صحرا میں لٹا کر، سینے پر پہاڑ جیسی سلیں رکھی جاتی ہیں، برفانی تودوں میں کو دجاتے ہیں لیکن نعرۂ مستانہ بلند ہو تا رہتا ہے ۔ رقص تھمتا ہی نہیں اور یہ توحید کا رقص، جنوں تھمے گا بھی نہیں۔ زمین کی گردش کو کون روک سکا ہے! بجا فرمایا آپ نے، بندوں کو تو غلام بنایا جاسکتا ہے، ان پر رزق روزی کے دروازے بند کیے جاسکتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہم نادان صرف روپے پیسے کو ہی رزق سمجھ بیٹھے ہیں۔ بندوں کو پابہ زنجیر کیا جاسکتا ہے، قید خانوں میں ٹھونس سکتے ہیں آپ، عقوبت خانوں میں اذیت کا پہاڑ ان پر توڑ سکتے ہیں۔ پنجروں میں بند کر سکتے ہیں، معذور کر سکتے ہیں، بے دست و پا کر سکتے ہیں، ان کے سامنے ان کے پیاروں راج دلاروں کی توہین کر سکتے ہیں، انہیں گالیاں دے سکتے ہیں، جی جی سب کچھ کر سکتے ہیں۔

صدیوں سے انسان یہ دیکھتا آیا ہے، انکار کرنے والوں کو بھوکے کتوں اور شیروں کے آگے ڈال دیا جاتا تھا، اس جگہ جہاں چاروں طرف خلق خدا کا ہجوم ہوتا اور ایک جابر تخت پر براجمان ہو کر یہ سب کچھ دیکھتا اور قہقہے لگاتا اور خلق خدا کو یہ پیغام دیتا کہ انکار مت کرنا، کیا تو پھر یہ دیکھو یہ ہو گا تمہارے ساتھ بھی۔ ہر فرعونِ وقت اپنی تفریح طبع کیلئے یہ اسٹیج سجاتا ہے، سجاتا رہے گا۔ ایسا اسٹیج جہاں سب کردار اصل ہوتے ہیں، فلم کی طرح اداکار نہیں، لال رنگ نہیں، اصل بہتا ہوا تازہ خون، زندہ سلامت انسان کا، رونا چیخنا بھنبھوڑنا کاٹنا سب کچھ اصل.....بالکل اصل۔ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، فرعونیت تو ایک رویّے کا نام ہے، ایک بیماری کا نام ہے۔ ایک برادری ہے فرعونوں کی، فرعونوں کی ہی کیا.....ہامان کی، شداد کی، قارون کی، ابولہب کی، ابوجہل کی۔ یہ برادری کا نام ہے جس میں کسی بھی وقت کسی بھی مذہب وملت کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ بس بچتا وہ ہے جس پر رب کی نظر کرم ہو۔

سب کچھ قید کیا جاسکتا ہے، سب کچھ لیکن ایک عجیب سی بات ہے، اسے قید نہیں کیا جاسکتا، بالکل بھی نہیں، مشکل کیا ممکن ہی نہیں ہے۔ عجلت نہ دکھائیں، خوشبو کو قید نہیں کر سکتے آپ! اور پھر خوشبو بھی تو کوئی ایک رنگ ایک مقام نہیں رکھتی ناں، بدلتے رہتے ہیں اس کے رنگ، خوشبو کے رنگ ہزار.....بات کی خوشبو، جذبات کی خوشبو، ایثار و وفا کی خوشبو.....بس اب آپ چلتے رہئے اور ان تمام خوشبوؤں کی رانی ہے عقائد کی خوشبو، دین کی ۔ جب بھی دبائیں ابھرتی ہے۔ وہ کیا یاد آگیا: "جتنے بھی تو کرلے ستم، ہنس ہنس کے سہیں گے ہم" خوشبو، نظریات کی خوشبو۔ یہ خوشبو قید نہیں کی جاسکتی ۔ جتنا خون بہتا ہے اتنی ہی خوشبو پھیلتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب درد خود ہی مداوا بن جاتا ہے درد کا۔ دیکھئے پھر مجھے یاد آگیا:

رنگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے
درد پھولوں کی طرح مہکے اگر تو آئے

یہ سب کچھ میں آپ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ چند برس قبل میں نے (نیویارک آن لائن) میں یہ خبر پڑھی تھی کہ امریکی آرمی کا ایک اسپیشلسٹ میٹری ہولڈ بروکس گوانتاناموبے کے عقوبت خانے میں کلمۂ شہادت پڑھ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا تھا۔ نوجوان فوجی افسر ہولڈ بروکس نے جس کی ڈیوٹی صرف چھ ماہ تک کیوبا کے عقوبت خانے میں مسلمان قیدیوں کی نگرانی اور بعض اوقات انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتے وقت رہنمائی کرنا تھی، مسلمان قیدیوں کے اخلاق اور عبادات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ ہولڈ بروکس نے ایک مختصر سی ای میل میں تسلیم کیا کہ مراکشی

اور دیگر مسلمان قیدیوں کے حسنِ اخلاق اور تلاوتِ قرآن جو وہ عقوبت خانے کی سخت ترین جالیوں کے عقب میں کرتے تھے، کی مانیٹرنگ کرتے ہوئے وہ بے حد متاثر ہوا تھا اور آج وہ امریکا میں دین اسلام کی حقانیت کا پیغام پہنچانے میں مصروف ہے۔ کیا بات باقی رہ گئی جناب۔

دیکھئے! چراغ کو تو پھونک مار کر بجھایا جاسکتا ہے، نور کو کون بجھا سکتا ہے! جی جناب نور کو تو پھونک مار کر نہیں بجھایا جاسکتا۔ اسلام نور ہے، قرآن حکیم نور ہے، روشنی ہی روشنی، صراط مستقیم کھرا سودا..... غزہ والو! تم نے ایک بار پھر سکھادیا کہ اللہ کے راستے میں جان قربان کر دینا سب سے بڑا اعزاز ہے، ماں باپ، بیوی بچے اور ملائکہ بھی استقبال میں کھڑے گواہی دے رہے ہیں کہ بندے نے اپنے رب سے وفاداری کا جو حلف اٹھایا تھا، اس میں وہ کامیاب ہو گیا!

بروز سوموار 2 ربیع الثانی 1445ھ / 16 اکتوبر 2023ء

انکار روحِ اسلام ہے

زندگی کی متاعِ عزیز کیا ہے؟ روپیہ پیسہ، زر و جواہر، زمینیں اور جائداد، منصب، جاہ و جلال، ناموری، واہ واہ، داد و تحسین، صلہ و ستائش، بیوی، یار دوست بچے عزیز و اقرباء.... کیا یہی ہے زندگی کی متاعِ عزیز! تو پھر نظریہ کیا ہے، اصول کیا ہے، حق و صداقت کیا ہے، دار و رسن کیا ہے، شہادت کیا ہے، عشق کیا ہے؟ محبت کیا ہے، بے غرضی کیا ہے، جاں نثاری کیا ہے، مر مٹنا کیا ہے؟؟؟ بتایئے پھر یہ سب کیا ہیں؟ کسے کہتے ہیں متاعِ عزیز؟ کیا انکار متاعِ عزیز نہیں ہے؟ جبر کے سامنے انکار، فرعونیت کا انکار، صلہ کا انکار، سودے بازی سے انکار، دولتِ بے بہا کا انکار، باطل کا انکار، سر جھکانے سے انکار، ظلم و جبر کا انکار، رب کی حاکمیت کے سوا سب کا انکار..... انکار متاعِ عزیز نہیں ہے تو پھر کیا ہے انکار؟ انکار اور یکسر انکار، پورے شعور کے ساتھ انکار۔ کوئی مصالحت نہیں، بالکل بھی نہیں..... مجسم انکار..... باطل کے سامنے، طاغوت کے سامنے، رب کے باغیوں کے سامنے، نفس پرستوں کے سامنے، دنیائے حرص و تحریص کے سامنے، دھوکے کے سامنے، بے وفائی کے سامنے، خدائی لہجے میں بات کرنے والوں کے سامنے..... انکار اور یکسر انکار..... پورے شعور اور پورے وجود کے ساتھ انکار۔ بس انکار۔

دلیل چاہے کتنی بھی مضبوط ہو، رب کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہے! بس انکار، لیکن انکار اپنے نفس کو خوش کرنے کیلئے نہیں، نفس کو خوش کرنے کیلئے انکار انکارِ ابلیس ہے۔ اپنے رب کیلئے انکار..... یہی ہے اصل اور کچھ نہیں۔ نہیں مانیں گے کسی کی بھی۔ کسی طاقت کی، کسی بھی نظام باطل کی..... نہیں مانیں گے چاہے لاکھ دلیلیں دو۔ بس مانیں گے تو صرف رب اعلی کی، بس اسی کی اور کسی کی بھی نہیں۔ یہی توحید ہے اور ہے کیا توحید! میرا دین تو شروع ہی انکار سے ہوتا ہے یعنی لا سے۔ پہلے انکار کی منزل ہے پھر تسلیم کی۔ میں انکار کیے بغیر تسلیم کیسے کر سکتا ہوں! اگر میں انکار نہ کروں اور تسلیم بھی کروں تو یہ منافقت ہے، کھلا تضاد ہے جو قابلِ قبول نہیں۔ ملاوٹ نہیں خالص درکار ہے بالکل خالص..... چاہے ذرہ ہی ہو۔ ملاوٹ شدہ پہاڑ درکار نہیں ہے۔ یہی ہے اخلاص اور کیا ہے!

توحید تو یہ ہے کہ خدا خود حشر میں کہہ دے
یہ بندۂ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

انکار روحِ اسلام ہے۔ انکار روحِ حسینیت ہے۔ انکار..... جا، نہیں مانیں گے۔ تمہارے دھوکے تمہیں مبارک، ہمارا سچ ہمیں۔ انکار لکھنے میں بہت آسان ہے۔ پنج حرفی لفظ بہت آسان ہے لکھنا، کرنا بہت مشکل ہے۔ جان لیوا ہے، بہت نقصان دہ، بہت قربانی چاہتا ہے۔ خود سے بھی لڑنا پڑتا ہے۔ اپنا انکار بھی، نہیں اپنی بھی نہیں مانوں گا۔ بہت مشکل ہے یہ بہت کٹھن منزل۔ معرکۂ خیر و شر کیا ہے؟ معرکہ حق و باطل کیا ہے؟ یہی تو ہے، حق کا ساتھ دینا خیر، باطل کا ساتھ دینا شر۔ رب کے سامنے تسلیم خیر اور ابلیس کا پیروکار بننا شر۔ معرکۂ خیر و شر یہی ہے۔ بس یہی ہے۔ پورے عالم میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ نہیں رکے گا یہ معرکہ۔ کربلا کا درس کیا ہے؟ جنگِ بدر کیا ہے؟ معرکہ احد میں دندانِ مبارک شہید ہو گئے، چچا حمزہ کے ٹکڑے کر دیئے گئے، بلک بلک کر رو دیئے لیکن سر تشکر سے جھک گئے کہ یہی اللہ کی مرضی، جہاد کیا ہے؟ یہی ہے بس۔ سب کا درس ایک ہے: بس انکار۔ انکار کرو تو جان سے گزرنا پڑتا ہے۔ خاندان نثار کرنا پڑتا ہے۔ سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آگ و خون میں نہانا پڑتا ہے۔ خاک آلود ہونا پڑتا ہے۔ اپنی

خواہشات کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ تیز دھار پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ لاشے اٹھانے پڑتے ہیں۔ جب شعور کے ساتھ انکار ہو تو ہر لاشہ اٹھاتے ہوئے یقین بڑھتا ہے۔ پختگی آتی ہے۔ ربِّ اعلیٰ کیلئے سب کچھ قربان کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

انکار جتنی شدت اختیار کرتا چلا جائے انقلاب اسی شدت سے نمودار ہوتا ہے اور پھر ہمارا مسئلہ نتائج نہیں کارزارِ خیر و شر میں اپنا کام سرانجام دینا ہے۔ ایسے ویسے چونکہ چنانچہ لیکن ویکن نہیں، یکسر انکار۔ رب پر کامل یقین کے ساتھ باطل کا انکار۔ طاغوت کا انکار۔ خون رنگ لاتا ہے، پھر انقلاب آتا ہے ۔کب رکا تھا معرکہ حق و باطل! نہیں رکے گا یہ معرکۂ خیر و شر۔ بس غالب وہی رہیں گے جو اپنے رب کے ساتھ جڑے رہیں گے۔ پورے یقین کے ساتھ، پوری سرشاری کے ساتھ۔ انکار روحِ دین ہے، باطل کا انکار۔ طاغوت کی ہر شکل کا انکار، یکسر انکار کوئی مصالحت نہیں، بالکل بھی نہیں۔ قربانی ہی قربانی، سرشاری ہی سرشاری!

سرشاری اسے ہی کہتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے لاشے اٹھانا اور پھر آوازِ بلند سے رب کی کبریائی بیان کرنا۔ یہی ہے دین، اور ہے ہی کیا! اسے کہتے ہیں اپنی نذر پوری کرنا۔ اپنے دعوے کی صداقت کو مجسم کر دینا لیکن یہ ہے بہت مشکل، توفیق پر ہے یہ۔ جانوں کا نذرانہ پیش کرنا اور رب سے التجا کرنا کہ قبول کر لیجیے ہماری قربانی اور پھر یقین کی منزل پر پہنچ کر پکارنا: قُل اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡن، کہہ دو بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کیلئے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے"۔ رب کیلئے خالص۔ باطل ہمیشہ سے گھمنڈی ہوتا ہے، دھوکے کا شکار۔

ایک مختصر حدیث سن لیں: اہل ہند کے مسلمان پہلے اہل کفر ہند سے جنگ کریں گے اور ان کے امراء اور روساء کو گرفتار کریں گے پھر شام میں مریم کے بیٹے کا ساتھ دیں گے۔ گویا یہ پاکستان کی منزل یا تقدیر پہلے سے طے ہو چکی ہے۔ جو مرضی کر لیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ تندی باد مخالف کا ساتھ دینا ہے یا منافقین غم گسار کا۔ اب مخالفین جو کچھ مرضی کر لیں، جتنا مرضی زور لگا لیں، قدرت کے اٹل فیصلوں کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ خطے میں ایسے حالات پیدا کئے جا رہے ہیں کہ پاک و ہند کا محاذ ایسا گرم ہو جس کے جواب میں مکمل جنگ ہو اور میرے آقا کا فرمان مکمل ہو کر رہے گا۔ حدیث کے دوسرے حصے کے مطابق شام میں جانے سے مراد اسرائیل کے ساتھ مکمل جنگ کی پیشگوئی ہے۔ یہ وقت اور موقع کب آئے گا، اس کیلئے فی الحال وقت کا تعین مشکل ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسا ہو گا ضرور، چاہے ہمارے اپنے دور میں ہو، یا آنے والی نسل کو یہ معرکہ درپیش ہو کیونکہ کتاب لکھنے والے نے اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے اور لکھنے والے نے تو زمانے کی قسم کھا کر، وقت کو گواہ بنا کر خبردار کیا ہے اور زمانے میں پیش آنے والے سارے واقعات اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ میرا رب اپنے اپنے وعدے کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا اور اس کے احکام کی تکمیل میں کہا جانے والا "کن" فوری طور پر "فیکون" میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

یہاں کے مورخین کی کثرت اب منطقی طور پر اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ مستقبل میں پاک و ہند اور بعد ازاں اسرائیل کے ساتھ جنگ کا معرکہ ضرور پیش آئے گا اور وہ ان حقائق کا انکشاف بھی کر رہے ہیں کہ اب مغرب کا تسلط اور عروج روبہ زوال ہے، مغرب اور امریکا کی اکانومی تیزی سے بکھر رہی ہے، دن بدن تجارتی حالات اور خسارہ بے قابو ہوتا جا رہا ہے، مغرب بشمول امریکا کی طاقت کا محور بھی مشرق کی طرف

کی طرف تبدیل ہو رہا ہے۔ یاد رہے جب اسلام اٹھا تھا تو اس وقت بھی چین اور روس دو بڑی طاقتیں موجود تھیں، اب ایک مرتبہ پھر اسلام کی نشاط ثانیہ کا سورج طلوع ہو رہا ہے اور یہی دو عالمی طاقتیں میدان میں موجود ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی حلیف بھی ہیں۔ مغرب اور امریکا کے بیشتر معاشی ماہرین نے جاری معاشی بحران سے نکلنے کیلئے ایک چھوٹے سے اندازہ کے مطابق 700 ٹریلین ڈالر کا تخمینہ لگایا ہے اور یہ ناممکن خزانہ اگر مغرب و امریکا کے ہاتھ لگ بھی جائے تو پھر بھی ان کی تجارتی ترقی کا گراف بلند نہیں بلکہ دیوالیہ سے بچانے میں میں مددگار ہو گا لیکن اس کے مقابلے میں مشرق میں عروج کا سورج اور اس کی روشنی میں اس قدر اضافہ ہونے کا امکان ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ خطہ زمین میں پوشیدہ خزانوں کو دریافت کرنے کے بعد ایک ایسی منزل کی طرف رواں دواں ہو گا جس میں پاکستان کے بیشتر لامحدود توانائی کے ذخائر اس کی نئی منزل کا تعین کریں گے۔

انہی غیر ملکی ماہرین کے مطابق پاکستان میں 15 ہزار بلین ڈالر کا لوہا موجود ہے، ہم اس وقت گیس کی کمیابی اور بحران میں مبتلا ہیں لیکن ہمارے سمندر سے جہاں ہمیں فی الحال بیرونی دباؤ کی بناء پر گیس نکالنے سے روک دیا گیا ہے کہ وہاں گیس کے وسیع ذخائر پاکستان کی خوشحالی میں مدد و معاون ہونے کیلئے بے چین ہیں۔ اس لئے مغرب و امریکا کے ہاتھوں سے عالمی اقتدار کا تاج مشرق کی طرف شفٹ ہو چکا ہے اور یہی دو طاقتیں روس اور چین کیلئے پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چند سال قبل چینی وزارت خارجہ کے ایک اہم رکن نے مثال دیتے ہوئے کہا تھا کہ جس طرح امریکا کیلئے اسرائیل بہت اہم ہے، اسی طرح اس خطے میں چین اور دیگر ہمارے حلیفوں کیلئے پاکستان اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اللہ کی سنت ہے کہ وہ اپنے باغیوں کو ایک حد تک تو مہلت دیتا ہے اور اسی مہلت کے دوران اپنے وفاداروں کو مختلف امتحانات سے گزار کر ان کی تربیت کے بعد ان پر اپنے انعامات کا بند دروازہ کھول دیتا ہے۔ ہمارے لئے شرط یہ ہے کہ ہم اپنے رب کی طرف پلٹ کر اس کی وہ بندگی اختیار کریں جس کا ہم نے اپنے رب سے وعدہ کیا ہے، اس کے بعد ہمارا کریم رب اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، اس کیلئے ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک میں ایماندار قیادت کا انتخاب کریں۔ اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا ہو گا کہ ہم ایسے افراد کا انتخاب کریں جو ملک و ملت کے اثاثوں کے مکمل امین ہوں، یقین رکھیں کہ جس طرح اللہ نے بنی اسرائیل سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ تم اگر میری طرف پلٹ آؤ گے تو میں بھی تمہاری طرف پلٹ آؤں گا۔ میرے رب کا تو ہم سے یہ وعدہ ہے کہ تم اگر چل کر میرے پاس آؤ گے تو میں دوڑ کر تمہارے پاس آؤں گا۔

امام نسائی نے اسی حدیث کو اپنی دو کتابوں میں نقل کیا ہے: محمد ﷺ بن عبد اللہ کے آزاد کردہ غلام ثوبان روایت کرتے ہیں۔ میری امت میں دو گروہ ایسے ہوں گے جنہیں اللہ نے آگ سے محفوظ کر دیا ہے، ایک گروہ ہندوستان پر چڑھائی کرے گا اور دوسرا گروہ جو عیسیٰ ابن مریم کے ساتھ ہو گا۔
حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہندوستان کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ضرور تمہارا ایک لشکر ہندوستان سے جنگ کرے گا، اللہ ان مجاہدین کو فتح عطا فرمائے گا حتیٰ کہ وہ (مجاہدین) ان کے بادشاہوں کو بیڑیوں میں جکڑ کر لائیں گے اور اللہ ان کی مغفرت فرما دے گا۔ پھر جب وہ مسلمان واپس پلٹیں گے تو عیسیٰ ابن مریم کو شام میں پائیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا" اگر میں نے وہ غزوہ پایا تو اپنا نیا اور پرانا سب مال بیچ دوں گا اور اس میں شرکت کروں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح عطا کر دی اور ہم واپس پلٹ آئے تو میں ایک آزاد ابو ہریرہ ہوں گا جو ملک شام میں اس شان سے آئے گا کہ وہاں عیسیٰ ابن مریم کو پائے گا۔ یا رسول اللہ ﷺ! اس وقت میری شدید خواہش ہو گی کہ میں ان کے پاس پہنچ کر انہیں بتاؤں کہ میں آپ کا صحابی ہوں (راوی کا بیان ہے) کہ حضور مسکرا پڑے اور ہنس کر فرمایا: "بہت زیادہ مشکل، بہت زیادہ مشکل۔۔۔۔ (آگے حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں) نبی کریم ﷺ نے ہم سے غزوہ ہند کا وعدہ فرمایا۔ "اگر مجھے اس میں شرکت کا موقع مل گیا تو میں اپنی جان و مال اس میں خرچ کر دوں گا۔

اگر قتل ہو گیا تو میں افضل ترین شہداء میں شمار کیا جاؤں گا۔

حضرت نعمت اللہ شاہ ولی کی پیش گوئیوں کے مطابق بھارت پاکستان سے جنگ تو ضرور کرے مگر انہوں نے یہ بھی صاف بتا دیا تھا کہ وہ جنگ کشمیر کے علاقے سے شروع ہو گی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک کو لپیٹ میں لے لیگی اور یہیں سے بھارت کی بربادی کے دن شروع ہوں گے۔ جنگ میں دونوں طرف لازمی نقصان ہوتا ہے لیکن مبارک ہو مسلمانوں کو کہ یہ وہ جنگ ہو گی جس میں شرکت کرنے کیلئے صحابہ کرام بھی دعائیں کیا کرتے تھے کیونکہ ہمارے نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب کو واضع بتا دیا تھا کہ مسلمانوں کا ایک لشکر ہند فتح کرے گا اور ہند کے بادشاہوں کو بیڑیوں میں جکڑ کر لائے گا اور اللہ ان مجاہدین کی مغفرت فرمادے گا اور جب وہ لشکر واپس لوٹے گا تو شام میں عیسیٰ ابن مریم کو پائے گا۔

الحمد اللہ ہند کی بربادی پاکستان کے ہاتھوں اللہ نے لکھ دی ہے اور ہند کی بربادی کے ساتھ ہی دنیا میں بڑے بڑے معرکے شروع ہو جائیں گے۔ اولیاء اللہ کے نزدیک غزوہ ہند کی فاتح فوج بعد میں حضرت عیسیٰ ابن مریم کے ساتھ مل جائیں گے اور تب اس دنیا کی آخری سب سے بڑی جنگ ہو گی جہاں ایک طرف اہل حق ہوں گے اور دوسری طرف کفار و مشرکین۔ حدیث کے مطابق وہ سب سے بڑی اور خون خوار جنگ ہو گی جس میں مسلمان کے مقابل 80 جھنڈوں تلے فوج ہو گی اور ہر جھنڈے تلے 12000 ہزار فوجی ہوں گے، اس حدیث کے مطابق 80 یعنی 80 ممالک ہیں اور ہمارے خیال سے یہ 80 ممالک کا اتحاد ہو گا جو اقوام متحدہ کے زیر سایہ اہل حق یعنی مسلمانوں سے ایک آخری جنگ کرے گا۔ اس جنگ میں اللہ مجاہدین کو فتح نصیب فرمائے گا اور مجاہدین کی نصرت کیلئے آسمان سے فرشتے اتریں گے یہاں تک کہ ایک ایک کافر کو جہنم واصل کر دیا جائے گا، اس جنگ میں پہاڑ اور درخت بھی مجاہدین کا ساتھ دیں گے سوائے گرقد کے درخت کے جو آج یہودی پورے اسرائیل میں لگا رہے ہیں۔

یقیناً جو انکار کی عظمت سے واقف ہیں، رب ذوالجلال انہی کو فرعونی طاقتوں کے سامنے سر اٹھا کر حق بات کہنے کی توفیق اور فرعونی تکبر کو نیست و نابود اور نمرودی طاقتوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ عنائت کرتا ہے۔ یار کھیں! انکار جتنی شدت اختیار کرتا چلا جائے، انقلاب اسی شدت سے نمودار ہوتا ہے، ایسا انقلاب توحید اور حب رسول کی محبت اور خودداری کے نشے میں مبتلا کرتا ہے، اور پھر ہمارا مسئلہ نتائج نہیں کارزارِ خیر و شر میں اپنا کام سرانجام دینا ہے۔ ایسے ویسے چونکہ چنانچہ لیکن ویکن نہیں..... یکسر انکار۔ رب پر کامل یقین کے ساتھ باطل کا انکار..... طاغوت کا انکار۔ خون رنگ لاتا ہے، انقلاب آتا ہے۔ کب رکا تھا معرکہ حق و باطل؟ نہیں رکے گا یہ معرکۂ خیر و شر۔ بس غالب وہی رہیں گے جو اپنے رب کے ساتھ جڑے رہیں گے ۔ پورے یقین کے ساتھ پوری سرشاری کے ساتھ، انکار روحِ دین ہے، انکار روحِ حسینیت ہے، عاشور کا درس یہی ہے اور کچھ نہیں۔ باطل کا انکار۔ طاغوت کی ہر شکل کا انکار..... یکسر انکار کوئی مصالحت نہیں، بالکل بھی نہیں۔ قربانی ہی قربانی، سرشاری ہی سرشاری۔ کوئی بھی تو نہیں رہے گا۔ رب کی قسم کوئی بھی نہیں۔ بس نام رہے گا اللہ کا۔

الحمد اللہ، یہ زندگی اللہ نے اپنی خوشنودی کیلئے عطا کی ہے، اور جب زندگی کی اصل منزل موت ہے تو اللہ کی راہ میں شہید ہونا سب سے افضل ترین موت شمار ہو گی۔

بروز منگل 3 ربیع الثانی 1445ھ / 17 اکتوبر 2023ء

دنیا کی زندگی موت پر موقوف ہے

آج میں نے فکر آخرت، ذکر موت پر قلم اٹھانے کی جسارت کی ہے کہ ہم سب اس اٹل حقیقت سے کچھ نصیحت حاصل کریں۔ شائد و باید کوئی اہل دل اس سے نصیحت حاصل کرے اور آخرت کے لئے کوئی سامان ایمان، ایقان، قرآن، نبی آخر الزمان کا فرمان بن جائے۔ اللہ اور اس کا رسول ﷺ راضی ہو جائیں، اللہ کے فضل سے خاتمہ بالخیر ہو جائے، سچی بات پر یقین، قبر و حشر میں نجات ہو جائے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ زندگی اور موت کی کشمکش ابتداء سے چلی آرہی ہے۔ زندگی نے دعویٰ کیا کہ اس دنیا میں ہمیشہ رہوں گی لیکن موت نے اس کو باطل کر کے دکھایا۔

کش مکش ہوتی رہی دن رات مرگ و زیست میں
انتہا میں موت جیتی اور ہاری زندگی

زندگی میں انسان نے مکان بنایا کارخانے بنائے۔ دکان بنائی۔ ملیں لگائیں، باغات لگائے، کوٹھیاں ایئر کنڈیشنڈ تیار کیں، محل بنائے، ایٹمی حملوں سے بچنے کیلئے پناہ گاہیں بنائیں، آرائش و زیبائش کے سامان تیار کئے۔ بناوٹ سجاوٹ سج دھج دکھایا۔ قلعے تیار کیے اور حفاظتی جنگلے لگائے مگر جب موت نے ڈیرا ڈالا ، اجاڑ کے رکھ دیا، خود کو رب اعلیٰ کہنے والا جب ڈوبنے لگا تو پکار اٹھا کہ میں سچے رب پر ایمان لاتا ہوں لیکن دیر ہو گئی۔ رہنے والے مکین چلے گئے۔ گاہک آئے، دکاندار روانہ ہو چکا تھا۔ بیوی تھی مگر بیوہ تھی۔ بچے تھے مگر بے سہارا۔ ہنستے ہوئے گھر غمزدہ ہو گئے۔ خوشی غمی میں تبدیل ہو گئی۔ آبادی بربادی میں تبدیل ہو گئی۔ خانہ سرسبز و شاداب خراب ہو گیا۔ اللہ اللہ کتنا ہولناک منظر ہے۔ نومولود چیخ رہا ہے مگر دودھ پلانے والی شفیق ماں دنیا سے چل بسی

حضرت ابن منبہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ملک الموت ایک بہت بڑے جابر ظالم کی روح قبض کر کے جا رہے تھے۔ فرشتوں نے ان سے پوچھا کہ تم نے ہمیشہ جانیں قبض کیں، کبھی کسی پر رحم بھی آیا؟ انہوں نے کہا کہ مجھے سب سے زیادہ ترس اس عورت پر آیا جو جنگل میں بالکل تنہا تھی۔ جونہی اس کا بچہ پیدا ہوا مجھے اس عورت کی جان قبض کرنے کا حکم ہوا۔ مجھے اس بچہ کی تنہائی پر بڑا ترس آیا کہ جنگل میں جہاں کوئی دوسرا نہیں ہے اس بچے کا کیا بنے گا؟ فرشتوں نے کہا یہ ظالم جس کی روح تم لے جا رہے ہو، وہی بچہ ہے۔ ملک الموت حیران ہو گئے۔ کہنے لگے: مولیٰ تو پاک ہے بڑا مہربان ہے۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے برعکس دودھ بہہ رہا ہے مگر پینے والا قبر کے اندر چلا گیا۔ ہاں ہاں بادشاہوں کے محلات مضبوط تھے۔ قلعے موجود ہیں مگر اب وہ کھنڈر ہیں۔ خالی ہیں، یادگار ہیں، آثار قدیمہ ہیں تاکہ دیکھنے والے عبرت پکڑیں۔ تخت ہے تخت نشین نظر نہیں آتا۔ آرام کرسیاں موجود ہیں مگر کرسی نشین مفقود۔ گاؤ تکیے رہ گئے مگر ٹیک لگا کر آرام کرنے والے چلے گئے۔ اس جہان فانی میں بڑے بڑے لوگ آئے: بدکار آئے، باوقار آئے، انبیاء، اولیاء ، صلحاء، اتقیاء، امراء، عقلا، فصحاء، بلغاء آئے، طاقتور بہادر پہلوان آئے، نوجوان آئے، شہنشاہ و بادشاہ آئے، وزراء آئے، حسین آئے، نازنین مہ جبین آئے، سپہ سالار آئے، شہسوار آئے، سردار آئے، مالدار آئے، نیکوکار آئے، بدکار آئے، پدمہا کروڑ ہا لکھو کھا ہزارہا آئے، تندرست آئے لاچار آئے مگر سب چند دنوں کے مہمان تھے۔ کیسے ہی ذی شان تھے۔ بہادر تھے، پہلوان تھے مگر موت نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ مغرور کا غرور توڑا۔ دولت میں قارون، تکبر میں فرعون اور موجودہ دور کے فراعین قصر سفید کے مکین، ظلم میں ہلاکو اور شہ زوری میں رستم، خوبصورتی میں یوسفؑ، صبر میں ایوبؑ ، درازی عمر میں نوحؑ، جلالی میں موسیٰ و صداقت میں صدیقؓ، عدالت میں عمرؓ، سخاوت میں عثمانؓ، شجاعت میں علیؓ، شہادت میں حمزہ و حسین، فصاحت میں سبحانؒ، عدل و انصاف میں نوشیرواںؒ، حکمت میں لقمانؒ، جود میں حاتم، موسیقی میں تان سین، عشق میں مجنوں، شاعری میں انوری، سعدی،

حافظ، جامی، فردوسی اور اقبال، خاموشی میں زکریاؑ، گریہ میں یعقوبؑ، رضاجوئی میں ابراہیمؑ، ادب میں اسماعیلؑ، حیاء میں مریمؑ، امتحان میں کامیاب ہاجرہؑ، ایمان میں بنیان مرصوص آسیہ، وفا میں خدیجہؓ، علم میں صدیقہؓ، صبر میں سمّیہؓ، سخاوت میں زبیدہؒ، عفت میں فاطمہؓ، حدیث میں رفاعیہؓ، حکومت میں سلیمانؑ، ذہانت میں فیضی، فلسفہ میں غزالیؒ، تفسیر میں محمود آلوسیؒ، حدیث میں بخاریؒ، دعوت میں نوحؑ، خونریزی میں چنگیز خاں، بش، ٹونی بلیئر، نیتن یاہو، مودی، فقہ میں امام ابو حنیفہؒ، خوش الحانی میں داؤدؑ، سیاحت میں ابن بطوطہ، فتح میں سکندر اعظم، شہادت و صبر میں امام حسینؓ، سیاست میں مولانا عبید اللہ سندھی، قائد اعظم محمد علی جناح، وعظ اور میدانِ خطابت میں حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔۔۔ مگر یہ سب قبر کے مہمان بن گئے۔

تھیں عظیم ہستیاں مگر خالی کر گئیں بستیاں
نہ آیا جو کہ باقی رہا نہ ساغر رہا نہ ساقی رہا

بی بی عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا:
لوکانت الدنیا تدوم لواحد
لکان رسول اللہ فیھا مخلدا
اگر دنیا ایک شخص کیلئے قائم ہوتی تو رسول اللہ ﷺ وہاں ہمیشہ کے لیے مقیم ہوتے۔

فارسی میں کسی نے کیا عجیب کہا:
اگر کس در جہاں پاینده بودے
ابو القاسم محمد زنده بودے

حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں ملک الموت آدمی کی صورت بن کر حاضر ہوئے۔ ایک وزیر حضرت کے پاس بیٹھا تھا۔ ملک الموت نے کئی بار وزیر کو دیکھا۔ جب ملک الموت چلے گئے، وزیر نے پوچھا، حضرت یہ کون تھا؟ فرمایا! حضرت عزرائیلؑ۔ وزیر نے کہا، اس کے بار بار دیکھنے سے خوف پیدا ہو گیا ہے۔ ابھی ہوا کو حکم دیں کہ مجھے اپنے وطن بوماس جزیرہ میں پہنچا دے۔ حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا، آن کی آن میں خدا کی شان وزیر با تدبیر وطن پہنچا۔ ابھی گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تھا کہ ملک الموت نے جان قبض کر لی۔ دوسری ملاقات میں سلیمانؑ کے دریافت فرمانے پر ملک الموت نے جواب دیا: میں حیران تھا کہ مجھے حکم ہوا کہ اس وزیر کی جان جزیرہ بوماس میں قبض کرنی ہے اور یہ یہاں آپ کے پاس تھا مگر حکم پورا ہو گیا۔

ہارون الرشید کا شہزادہ، مگر نہ دولت کا دلدادہ نہ شاہی محلات میں رہنے پر آمادہ، نہایت سادہ، مسکینی فقیری اختیار کی۔ بیابانوں ویرانوں میں پھرتا رہا۔ بادشاہ نے کئی بار قاصد بھیجے۔ بیٹا گھر آؤ، نعمتیں ہیں، لطف ہے، خزانے ہیں، دولت ہے، عیش ہے، آرام ہے، محل ہے، نوکر ہیں، باندیاں ہیں، تیرے ہر اشارے پر ہر چیز میسر ہو سکتی ہے۔ بیٹے نے کہا: والد محترم! یہ سب بے کار ہے، آخر فنا ہے، دنیا بے وفا ہے۔ آخرت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ دنیا قارون کا ورثہ ہے اور دین محمد مصطفی ﷺ کا ورثہ ہے۔

میری نگاہ قرآن کی اس آیت پر ہے:
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَاقَلِيْل۔ فرمایئے، سامان دنیا بہت تھوڑا ہے۔
وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌوَّاَبْقٰى۔ آخرت اچھی ہے اور باقی ہے۔

ایک دن شہزادے کی موت کا وقت قریب آیا۔ صحرا میں کسمپرسی میں، مسکینی میں جان جانِ آفرین کے سپرد کرنے سے پہلے زمین پر یہ اشعار تحریر کر کے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اشعار نوشتہ بر زمین یہ تھے۔

یا صاحبی لا تغرر بتنعمی
فالعمر ینفدو والنعیم یزول
اذا حملت الی القبرل جنازہ
فاعلم بانک بعدھا محمول

اے دوست دولت پر مغرور نہ ہو۔ یہ مال بھی ختم ہو گا اور عمر بھی۔ جب قبرستان کی طرف جنازہ اٹھا کر لے جائیں گے تو یقین کرنا کہ اس کے بعد تیری باری بھی آئے گی۔

ہارون الرشید کو اطلاع ملی کہ تیرا فرزند ارجمند فلاں جنگل میں فقیری لباس، اینٹ سرہانے ،نہ پلنگ نہ غالیچے وہ نازنین نازک بدن، زیب چمن، بے وطن بے گور و کفن، مسکینی انداز میں دنیا سے بے نیاز ابدی نیند سو رہا ہے۔ بادشاہ نے جب یہ سنا تو محبت و شفقت پدری نے جوش مارا، چیخیں نکل گئیں، بے اختیار رو پڑا، فوراً عزیز بیٹے کے سرہانے پہنچا۔ پیشانی چوم کر کہا! مبارک ہو بیٹا تو نے فقیری کو امیری پر ترجیح دی، آج تو رسول اللہ ﷺ کی گود میں چلا گیا۔ زندگی سادہ موت اعلیٰ مگر تیری جدائی کا داغ ہمیشہ سینے میں رہے گا۔

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست!

عاجزی تکبر نہیں بلکہ بھکاری کا کردار ہے

ہارون الرشید متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یقین ہو گیا کہ دنیا فانی ہے۔ آخرت باقی ہے۔ اس کے بعد علماء کی صحبت و محبت اختیار کی۔ ہارون الرشید کی بھی یہ مشہور بات ہے کہ نصیحت کے سننے پر بہت رویا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حج کو جا رہے تھے تو سعدوں مجنوں راستہ میں سامنے آ گئے۔ چند اشعار پڑھے جس کا مطلب یہ تھا: مان لیا کہ تم ساری دنیا کے بادشاہ بن گئے ہو لیکن کیا آخر موت نہ آئے گی؟ دنیا کو اپنے دشمنوں پر چھوڑ دو۔ جو دنیا آج تمہیں خوب ہنسا رہی ہے، یہ کل کو تمہیں خوب رلائے گی۔ یہ اشعار سن کر ہارون الرشید نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر گئے۔ اتنے طویل عرصہ تک بے ہوش رہے کہ تین نمازیں قضا ہو گئیں۔

حضرت حسن بصریؒ جواہرات کی تجارت کیا کرتے تھے۔ پھرتے پھراتے روم پہنچے، کیا دیکھا کہ وزراء کی بیگمات، لونڈیاں اور فوج سب کہیں جا رہے ہیں۔ پوچھا کیا آج جشن ہے یا بے وطن ہو کر جا رہے ہو؟ وزیر نے کہا: ہمارے ساتھ چلو۔ ایک جنگل میں پہنچے۔ وہاں خیمہ ایستادہ ہے۔ نہایت شاندار خیمہ، پہلے لشکر مسلح نے طواف کیا اور روتے رہے۔ پھر حکماء فلاسفروں نے پھر لونڈیوں نے پھر شاہی بیگمات نے، پھر وزیروں نے۔ آخر میں بادشاہ نے طواف کیا، اندر گیا، بصد رنج و ملال، یاس و حسرت، پریشان روتا ہوا سر جھکائے باہر نکلا۔ کچھ آہستہ آہستہ بادشاہ کہتا رہا۔ حسن بصریؒ نے ماجرا پوچھا کہ کیا ہے؟ وزیر نے کہا، بادشاہ کا نوجوان بچہ فوت ہو گیا ہے۔ ہر سال پورا لشکر یونہی معہ بادشاہ اس کی قبر پر آتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ بے نیاز کے

قبضہ میں یہ فرزند ہے؟ اے عزیز بچہ! اگر میرے اختیار میں ذرہ برابر زندہ کرنے کا امکان ہوتا تو ہم سعی بلیغ کرتے، سب مال ملک اور دولت نثار کر دیتے کہ تیری ایک بار ملاقات ہو جاتی مگر ہم ہار گئے۔ ہماری طاقت ہیچ ہے، تو ایسی ذات کے قبضہ میں ہے جو بے نیاز ہے۔ حضرت حسن بصریؒ پر اتنا اثر ہوا کہ سب کاروبار چھوڑ کر بصرہ واپس آئے اور تمام جواہرات فی سبیل اللہ غرباء میں تقسیم کر دیئے۔ دنیا ترک کر دی اور گوشہ نشین ہو گئے۔ ستر سال اللہ کی عبادت اور مخلوق خدا کی خدمت میں گزارے۔ ولی کامل بن کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

قدیم بادشاہوں میں رواج تھا کہ ایک مشیر، ان کو ہر صبح و شام موت یاد دلایا کرتا تھا۔ جب شاہجہاں کی تاج پوشی ہو رہی تھی۔، راگ رنگ، ناچ گانے ،راجے مہاراجے، خوبصورت لونڈیاں، سپاہ لشکر سب موجود تھے۔ خزانے لٹائے جا رہے تھے۔ اہل اللہ دعا کر رہے تھے۔ فقرا، گدا مداح سرائی میں مصروف تھے۔ شعراء قصیدے لکھ رہے تھے۔ انتظام و اہتمام دربار عام صبح و شام جاری تھا۔ مرصع مزین شاندار چمکدار ہیروں اور موتیوں والا تاج سر پر تھا۔ آفرین مبارکبادی کے پیغامات اطلاعات، لگاتار مل رہے تھے۔ خوشی و مسرت و شادمانی میں ہر شخص باغ و بہار تھا۔ اچانک ایک فقیر نے بلند آواز سے کہا۔ بادشاہ سلامت! اتنی خوشی کا اظہار کرو جتنی خوشی رہ سکے۔ کل یہ تاج اتارا جائے گا۔ یہ شاہی ختم ہو جائے گی۔ یہ عیش و عشرت سب کافور ہو جائے گی، جو عزت دے سکتا ہے۔ ذلت بھی دے سکتا ہے۔ شاہی دینے والا تباہی بھی کر سکتا ہے۔ تاج دینے والا اتار بھی سکتا ہے۔ ہزاروں میں رونق افروز ہونے والا کل تنگ و تاریک قبر میں جائے گا۔

شاہجہان کا چہرہ یکایک فق ہو گیا۔ گردن جھک گئی، آنکھیں پرنم ہو گئیں، دماغ چکرا گیا، وجود کانپنے لگا۔ فوراً تخت سے اتر کر مٹی پر سر رکھا۔ عاجزی و انکساری سے روتے ہوئے عرض کیا: اے مالک زمین و آسمان، اے حقیقی شاہجہان، اے رب دو جہان، اے رحیم و رحمان، اے وارث کون و مکان، میں کمترین انسان شاہجہان ناپاک پانی کا قطرہ، لاش محض، محتاج فقیر ناتواں، بندہ حقیر ہوں۔ اے اللہ! ذلت سے بچانا، حکومت تیری ہے میں تیرا محکوم ہوں ،میں عاجز تو قوی، میں انسان تو عالی شان، میں فقیر تو مدبر، میں فانی تو باقی، مجھے ناز نہیں نیاز ہے، تو ہی شرافت دے، قوم کی خدمت دے، بادشاہ کی اس مسکینی، ناتوانی، بے چینی، بیقراری اور اضطراری کو دیکھ کر پورے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ تمام خوشیاں، عیش و عشرت فکر آخرت میں تبدیل ہو گئیں۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی، تمام پروگرام موقوف، اذہان ماؤف۔

نمے ترسی ازاں روزے کہ در گورت فرو آرند

عزیزاں جملہ باز آیند تو تنہا در لحد مانی

تم اس دن سے نہیں ڈرتے جس دن پیارے لوٹ آئیں گے تم لحد میں اکیلے ہو گے۔

ہم موت کو بھول جائیں مگر موت نے ہمیں نہیں بھلایا، آئے گی، ضرور آئے گی۔ یہ شکایت ہی غلط ہے کہ موت اچانک آتی ہے۔ پہلے مطلع نہیں کرتی۔ ہم روزانہ اپنی آنکھوں سے بچے، جوان، بوڑھے اور نوجوان مرتے دیکھتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مرنے کا وقت مقرر ہے۔

جدید تحقیق کے مطابق زمین 1.9 بلین سے زیادہ مسلمانوں کا گھر ہے اور اسلام دنیا کا سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب بھی ہے۔ 2010ء میں دنیا میں کل 57 مسلم اکثریتی ممالک (جن میں مغربی کنارے، غزہ کی پٹی، مایوٹ اور مغربی صحارا کے علاقے شامل ہیں) کو تسلیم کیا گیا ہے اور اب نائیجیریا کے شامل ہونے کے بعد ان کی تعداد 58 ہو گئی ہے جہاں مسلم حکمران ہیں۔ دنیا کے 62 فیصد مسلمان ایشیا پیسیفک کے خطے (ترکی سے انڈونیشیا تک) میں

رہتے ہیں لیکن کیا ہم نے سوچا ہے کہ ہماری اس وقت کیا حیثیت ہے؟ سوچنے کا مقام ہے آج امریکا پچاس ریاستوں کو ملا کر سپر پاور بنا ہوا ہے جبکہ ہمارے پاس 58 مسلم ممالک ہیں، ہم "سپر پاور" کیوں نہیں؟ جبکہ مادی قوت کی بھی ہمارے پاس کمی نہیں۔

ثوبان رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا" قریب ہے کہ دیگر قومیں تم پر ایسے ٹوٹ پڑیں جیسے کھانے والے پیالوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں"۔ تو پوچھا گیا کہ کیا ہم تعداد میں کم ہوں گے آپ ﷺ نے فرمایا" نہیں، بلکہ تم تعداد میں کثرت میں ہوگے لیکن تم سیلاب کی جھاگ کی مانند ہوگے، اللہ تمہارے دشمن کے سینوں سے تمہارا خوف نکال دے گا اور تمہارے دل میں "وہن" ڈال دے گا" تو ایک صحابی نے پوچھا! وہن کیا چیز ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا" یہ دنیا کی محبت اور موت کا ڈر ہے"۔ (سنن ابو داؤد 4297)

آج کئی افراد کہہ رہے ہیں کہ حماس نے آخر اسرائیل پر یہ حملہ کیوں کیا جبکہ انہیں پتہ ہے کہ اسرائیل کی پشت پر امریکا اور پورے یورپ جیسی جابر قوتیں موجود ہیں اور ان کے مقابلے میں مسلمان اپنی نااتفاقی کی بناء پر ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ لیکن وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ پچھلے دس سالوں سے غزہ کے مکین شدید ترین محاصرے میں ہیں اور اسرائیل جب چاہتا ان پر زندگی کے دروازے بند کر کے ان پر ظلم و ستم توڑ رہا ہے۔
انہوں نے روز روز مرنے سے یہ بہتر سمجھا کہ اپنی جانوں کی قربانیاں دیکر دنیا کو ایک مرتبہ پھر یہ باور کرایا جائے کہ ہمیں اللہ کی راستے میں موت اتنی ہی عزیز ہے جتنی تمہیں اس فانی زندگی میں اپنی زندگی۔
إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ
(آل عمران:160) اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے، ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

انسان کیسا احمق بے وقوف ہے، کیوں نہ ہو۔ مگر اسے موت کا یقین ہے۔ موت کا سیاہ بادل ہر وقت سر پر منڈلا رہا ہے۔ جہاں موجود ہو، جس جگہ ہو، ایک دن موت کے پنجہ میں گرفتار ہو گا۔ کون ہے جو دعویٰ کرے کہ یہ چیز میری ہے، مگر ایک موت ہے جو دعویٰ کر سکتی ہے کہ یہ میری امانت ہے۔ آنے کا ایک راستہ ہے مگر جانے کے ہزار راستے ہیں۔ دنیا کی زندگی موت پر موقوف ہے۔

راہِ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ
بہت اس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ

بروز جمعرات 5 ربیع الثانی 1445ھ 19 / اکتوبر 2023ء

موت سے بھلا کوئی ڈرتا ہے!

خود کو مخلوق سمجھتے ہیں اور خالق کو نہیں پہچان سکے۔ چلتی پھرتی تصویریں اپنے مصور کو نہیں پہچان پائیں۔ بندہ بشر اپنے پالنے والے سے بے خبر ہے۔ خوش قسمتی سے اپنے رب کو تو ایک مانتا ہے لیکن بد قسمتی سے اس کی ایک نہیں مانتا۔ رب کا ذکر تو بہت کرتا ہے، اس پر یقین نہیں رکھتا۔ اپنے جگری دوست کی بات کا تو اعتبار کرتا ہے اور خالق کو بھول جاتا ہے۔ خالق نے کہا ہے کہ میں ہوں رزاق، بس سن لیتا ہے مگر رزاق تو وہ دفتر کو مانتا ہے، اپنی دکان کو مانتا ہے، اپنے ٹھیلے کو سمجھتا ہے، اپنے کارخانے کو سمجھ بیٹھا ہے بلکہ اگر یوں کہوں کہ اغیار کے مالیاتی اداروں کو رازق مانتا ہے۔

سبب کے بغیر بھی وہ مالک دے سکتا ہے، یہ نہیں مانتا، تھوڑی سی تکلیف آجائے تو آہ وزاری کرتا ہے۔ شکر کرنا تو سیکھا ہی نہیں مگر کوئی یاد دہانی کرائے تو بہت کم شکر ادا کرتا ہے اور شکوہ شکایت بے پناہ۔ کسی حال میں بھی تو خوش نہیں ہے یہ۔ سمجھتا ہے کہ بہت دانا ہے بینا ہے لیکن کہاں ہے دانا، کہاں ہے بینا! ٹھُڑدلا ہے، بے ہمت اور جلد اکتا جانے والا.... بندے تو وہ ہیں جو خالق پر ایسا یقین رکھیں جیسے کہ صبح سورج کے نکلنے کا، رات کو چاند تاروں کا۔ ایسا یقین رکھنے والا ہی تو بندہ کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ بندہ کہلانا کوئی معمولی بات نہیں۔ رب کو خوش رکھنا ہے تو بندے بنو، رب نے جو کہہ دیا اس پر ایسا یقین ، لیکن رب کی کرلو کہ پھر تمہیں کوئی خدشہ نہ ستائے۔ رب نے کہہ دیا تو بس یہ ہو کر رہے گا۔ سورج تو ہو سکتا ہے کل نہ طلوع ہو، وہ بھی تو مخلوق ہے ناں بات ہے اٹل، رب کا وعدہ ہے سچا۔ بس وہی ہے خالق و مالک، کھلانے والا پالن ہار۔

انسان کو کیا ہو گیا، بس اکیلے ہی ہر شے چٹ کرنا چاہتا ہے، کیا ہو گیا ہے اسے! کبھی مرغی کو دیکھا ہے تم نے، دانا دنکا چگنے کے بعد پانی پیتے ہوئے۔ جو دیکھنا چاہیے وہ تم دیکھتے نہیں ہو، جو نہیں دیکھنا اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہو۔ دیکھو کبھی مرغی کو پانی پیتے ہوئے، ہر قطرہ پر سر اٹھا کر آسمان تکتی ہے، شکر بجا لاتی ہے..... اپنے رب کا شکر اور جب سیر ہو جائے تو پانی کے کٹورے کو پیر مار کر گرا دیتی ہے، دوسرے وقت کیلئے نہیں رکھتی۔ تم سے تو یہ مرغی زیادہ شکر گزار ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیوں نہیں سمجھتے، کب سمجھو گے؟ یہ وقت تو گزر رہا ہے، پہچانو خود کو، اپنے مالک کو..... رحم کرو مخلوق پر۔ حرصِ قبیح چھوڑ دو، مل بانٹ کے کھاؤ۔ اکیلے تو تم کچھ نہیں کھا سکو گے، سب فتنہ ہے۔ مال بھی فتنہ، غربت بھی۔ رب کو پہچانو، فلاح پا جاؤ گے۔

لیکن بندہ تو حرص قبیح میں مبتلا ہے، ہاں رب کو مطلوب تو حرص ہی ہے، لیکن ایسی حرص نہیں جو لوگوں کو آزار پہنچائے۔ یہ حرص نہیں یہ تو حرصِ غلیظہ ہے، کتے والی حرص ہے۔ کبھی کتے کو دیکھو، اسے اگر کہیں سالم ثابت مردار گائے مل جائے تو بس وہ اسے اکیلا ہی چٹ کرنا چاہتا ہے۔ کبھی موقع ملے تو ذرا اس منظر کو دیکھو۔ وہ دوسرے کتوں کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیتا اور خود ساری گائے کھا بھی نہیں سکتا۔ باقی سارے اسے تکتے رہتے ہیں لیکن جب کتے کا پیٹ بھر جائے تو وہ بھی باقی گائے کو کہیں دوسرے وقت کیلئے چھپا کر نہیں رکھتا، دوسروں کیلئے چھوڑ دیتا ہے۔ کتا حریص ہے لیکن انسان..... یہ تو اب کتوں سے بھی بازی لے گیا، خود ہی سب کچھ کھانا چاہتا ہے۔ سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے باقی محروم رہتے ہیں۔ کوا بھی بہت حریص ہوتا ہے بہت زیادہ۔ لیکن کہیں ایک چھوٹا سا بھی ٹکڑا مل جائے تو کائیں کائیں کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ وہ منادی کرتا رہتا ہے دوسرے کوؤں کو بلاتا ہے کہ آیہ ٹکڑا مل گیا ہے، اسے بانٹ کر کھائیں اور وہ سب اسے مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔

کس کی یہ آرزو نہیں، تمنا نہیں، تڑپ اور کسک نہیں کہ میں سفر حیات کی شاہراہ پر جوان دیکھے گڑھوں، انجانی کھائیوں، ان دیکھی بلاؤں، انجانی

ابتلاؤں، ان دیکھے نشیب و فراز سے گھری ہوئی ہے، آگے ہی آگے بڑھتے جاؤں..... آگے ہی آگے شاداں و فرحاں اپنی مخصوص منزل کی طرف مزید بڑھتا جاؤں اور یہ سفر نہایت ہی قلیل عرصے اور انتہائی کم وقت میں طے کر پاؤں مگر وائے ان دیکھی بلائیں اور انجانی ابتلائیں بیچ منجھدار میں اس شاہراہِ حیات کے مسافر کو اتنی بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ دبوچ لیتی ہیں کہ اس کے حسین و جمیل خواب اور انتہائی نرم و نازک شیش محل چور چور ہو جاتا ہے اور بیچارہ مسافر پھٹی پھٹی آنکھوں سے کف افسوس ملتا رہتا ہے۔ بہت سے مسافر دھڑام سے گر جاتے ہیں کہ ان کی ہمتیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں، ان کی قوتیں پاش پاش ہو جاتی ہیں، ان کی صلاحیت دم توڑ دیتی ہیں اور وہ ہارے ہوئے، حالات کے پٹے ہوئے، قسمت کے مارے مسافر پھر اٹھنے اور اٹھ کر ذرا اس شاہراہ، شاہراہِ حیات پر بڑھنے کا یارا اپنے اندر نہیں پاتے اور بیٹھنے اور سسک سسک کر جان دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

ایسے لاڈلوں پر شاہراہِ حیات ہنستی ہے، زور زور سے ہنستی ہے بلکہ قہقہہ لگاتی ہے اور چلا چلا کر اسے بزدلوں، کم ہمتوں، نامردوں جیسے ناموں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ ارے لاڈلو! تاریخ عالم کے اوراق الٹ لو، ان اوراق پر صرف اور صرف ان جواں مردوں، بہادروں، جیالوں، آہنی عزائم اور فولادی ارادوں کے مالک مسافروں ہی نے انمٹ نقوش ثبت کئے ہیں جنہوں نے گرنے ہی میں اٹھنے کا راز پالیا، جنہوں نے ناکامیوں ہی میں کامیابیوں کی بشارتیں سن لیں، جنہوں نے اپنی بیچارگی اور بدقسمتی کے دامن ہی میں چارہ گری اور خوش بختی کے پھول پالئے، جنہوں نے ٹوٹے حوصلوں میں ہی فولادی عزائم کے گر سیکھے، جنہوں نے زمانے کے ظالم تھپیڑوں سے گر کر ہی نئے عزم اور نئے ارادوں سے اٹھنے کا فن سیکھ لیا!

ارے لاڈلو غور سے سنو! شاہراہِ حیات کانٹوں، ان دیکھے کانٹوں کی سیج ہے۔ یہ پھولوں بھری راہ نہیں، ان کانٹوں سے الجھے بنا بھی یہ آپ سے الجھ جائیں گے۔ ذرا کچھ دیر رکئے نا، بڑے صبر کے ساتھ، بڑی احتیاط و حزم کے ساتھ، بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ، الجھے ہوئے کانٹوں سے الجھئے مت بلکہ ان کو سلجھایئے۔ سلجھنے اور سلجھانے کے اس ناپسندیدہ عمل میں آپ کو کچھ وقت لگ جائے گا، یہ مت سمجھئے، خدارا یہ مت سمجھئے کہ آپ کا یہ قیمتی وقت سلجھنے اور سلجھانے کے عمل میں ضائع ہوا۔ واللہ! یہی وقت قیمتی ہے جسے آپ ضائع شدہ وقت سمجھتے ہیں، یہی وقت شاہراہِ حیات پر آپ کے بقیہ سفر کے نوک پلک درست کرے گا، آپ کے بقیہ سفر کو آسان بنادے گا اور آپ کے بقیہ سفر کی رہنمائی کرے گا۔ شرط صرف ایک ہے کہ بصیرت کی آنکھوں سے کانٹوں کو دیکھئے اور بصیرت کی آنکھوں سے ہی ان کانٹوں کو سلجھایئے۔ واللہ کامیابی قدم چومنے کیلئے آپ کی منتظر ہے۔

اگر ہمیں شاہراہِ حیات پر کامیابی کے ساتھ آگے بڑھنا اور منزل مقصود سے بغلگیر ہونا ہے تو قرآن و حدیث ہی ہمارے لئے سرچشمہ حیات ہے۔ اسی قرآن و حدیث نے ہمیں درس دیا ہے کہ جتنا جتنا خدا سے ڈروگے اتنا ہی دنیا تم سے ڈرے گی۔ جتنے خلوص کے ساتھ تم اللہ کے دین پر صبر و استقامت کا ثبوت دوگے اتنے ہی التفات کے ساتھ اللہ تمہیں عزت و کامیابی سے ہمکنار کرے گا۔ تم اللہ کے حضور جھکوگے، اللہ دنیا کو تمہارے قدموں میں جھکا دے گا۔ جب ایک تنہا انسان محمد رسول اللہ ﷺ نے پوری دنیا کے بالمقابل توحید کی دعوت پیش کی تھی تو ظاہری اسباب کی بنا پر آخر کون گمان کر سکتا تھا کہ یہ دعوت مخالفت کے بڑے بڑے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے گی لیکن دنیا نے دیکھا کہ اللہ پر بھروسہ کرنے والے صابر پیغمبر ﷺ کی استقامت نے ہر طوفانِ مخالفت کا منہ موڑ دیا اور فضا جو تہہ بر تہہ ظلمتوں کا مسکن تھی، نور و تابش سے جگمگاتی چلی گئی۔ کیا یہ ہماری بد عملی کا نتیجہ ہے کہ امت مسلمہ کی ناؤ طوفانی حالات اور دہشتگردی کے خلاف جنگ کے گہرے سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہے؟ کتنا ہی اچھا ہوتا اگر ہم میں ہر فرد کما حقہ با عمل بننے

کی سعی مشکور کرتا تو امت کی ناؤ طوفانی حالات کا سینہ چیر کر کامرانی اور کامیابی کے ساتھ منزل سے جا لگتی۔ کامیابی اور نجات کیلئے گناہ کا اقرار ہی کافی نہیں بلکہ توبہ کی صورت میں اعمال نیک کا صدور ہی نجات کا ضامن ہوتا ہے۔ غذا کی کتنی ہی نئی قسمیں ایجاد کر لی جائیں لیکن انہیں تناول کرنے کیلئے منہ اور نئے دانتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح احوال و ظروف کتنے ہی مختلف ہوں مگر ان سے عہدہ برآ ہونے کیلئے وہی پرانی صلاحتیں درکار ہوں گی جنہوں نے کفر و شرک کی فولادی قوتوں سے اپنا لوہا منوایا تھا۔

قسمت اور ظلم کو آزمائش سمجھ کر صبر کر لیں۔ حقوق لیکن اب تو یہ رسم چل نکلی ہے کہ لوگوں کو مذہب کی آڑ میں اس قدر بزدل بنا دو کہ وہ محرومیوں کو کیلئے آواز اٹھانا گناہ سمجھیں، غلامی کو اللہ کی مصلحت قرار دیں اور قتل کو موت کا دن معین سمجھ کر چپ رہیں۔ دشمنوں کا کیا ذکر کریں خود ہمارے ہاں سے یہ آوازیں اٹھنا شروع ہو گئیں ہیں کہ آخر چاروں طرف سے محصور حماس کے پاس یہ اسلحہ کہاں سے آیا کہ انہوں نے ناقابل یقین تاریخ رقم کر دی۔ یاد رکھیں! غلام قومیں بدکرداروں کو بھی دیوتا مان لیتی ہیں اور آزاد قومیں عمر بن خطاب جیسے بے مثل حکمرانوں کا بھی محاسبہ کرتی ہیں۔ جس دن ہم نے اپنے بچوں کو یہ ذہن نشین کرا دیا کہ ہمارے ہیرو وہ نہیں جو اپنی تعداد اور جدید اسلحے کے گھمنڈ میں جنگ و جدل اور خون بہانے کی دھمکیاں دیکر دنیا کو خوفزدہ کرتے رہیں بلکہ جس دن ہم نے انہیں یہ سکھانا شروع کر دیا کہ ہمارے ہیرو تو وہ صاحبِ کردار ہیں جو انسانی و حیوانی زندگی کا احترام اپنے رب کا حکم سمجھ کر خود پر فرض کر لیتے ہیں، اللہ کی غلامی کے سوا کسی اور کی غلامی انہیں قبول نہیں، ان کی راتیں اللہ کے خوف سے سجدوں میں جھکی رہتی ہیں اور بالآخر اللہ کی راہ میں جان قربان کر کے سرخرو ہو جاتے ہیں اور ان کی اولاد بھی ایک ایسا صدقہ جاریہ بن جاتی ہے کہ روز جزا کے دن امت مسلمہ کے 57 حکمران بھی مارے ندامت کے لرز رہے ہوں گے۔

اسرائیلی وحشیانہ بمباری کے نتیجے میں القسام بریگیڈ کے کمانڈر ایاد الحسنی کا جسد خاکی جب ان کی معصوم بیٹی کے سامنے لایا گیا تو اس بہادر بیٹی نے جس جذبہ ایمانی کے ساتھ فلسطین کی آزادی کی بات کی ہے، یقیناً مایوسی پھیلانے والوں کیلئے یہ جواب کافی ہے: میں ماریہ ہوں، لقائد ایاد الحسنی شہید کی بیٹی، میں اپنے بابا سے بہت پیار کرتی ہوں اور میں تمام یہودیوں سے زیادہ مضبوط ہوں۔ کیا دشمن خوش ہے کہ اس نے میرے بابا کو شہید کر دیا! شہادت تو میرے بابا کی سب سے بڑی تمنا تھی، وہ شہادت کی طلب میں ہی گھر سے نکلے تھے۔ میں خوش ہوں وہ جنت میں ہیں اور تم جہنم میں پگلو گے۔ موت سے بھی کوئی ڈرتا ہے؟ یہ تو بزدلوں کا کام ہے۔ تم جانتے نہیں کہ اللہ ہمارے لیے کیا معنی رکھتا ہے۔ ہم عنقریب مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھیں گے۔ اے امت مسلمہ کے حکمرانوں! سن لو عالم اسلام روزانہ پانچ نمازیں پڑھتے ہیں لیکن ہم ہر روز (نماز جنازہ سمیت) چھ نمازیں پڑھتے ہیں۔ ہم ضرور بیت المقدس واپس لیں گے۔ ہم تم سے لڑتے رہیں گے جب تک ہم اپنی سرزمین آزاد نہیں کرا لیتے کیونکہ یہ ہماری زمین ہے اور ہم اس میں رہیں گے۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ کیا ہم نے اپنے بچوں کو حق و باطل کا یہ فرق سمجھاتے ہوئے ایسی زندگی سے محبت سکھائی ہے جو ہمیشہ کی اخروری زندگی کا زادِ راہ بن سکے

صاحب علم ہمیشہ اپنے طور طریقوں اور عادت و اطوار سے پہچانا جاتا ہے۔ جس طرح سورج کبھی یہ اعلان نہیں کرتا کہ وہ آسمان پر آ چکا ہے اسی طرح ایک صاحبِ علم اور حقیقت کا ادراک کرنے والا کبھی شور اور بے تکے پن سے اپنی شناخت نہیں چاہتا بلکہ اس کی گفتگو اور عمل اس کی شخصیت اور علم کی پہچان بن جاتے ہیں۔ لیکن مایوس افراد کی احساس کمتری کا یہ عالم ہے کہ وہ ہمیشہ خود کو اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کیلئے ایسے بیانات کا سہارا لیتے ہیں۔ پست قامتی جسمانی ہو تو کوئی عیب نہیں لیکن عقلی ہو تو کبھی بھی روا نہیں رکھی جاتی۔ اس لیے وہ گدھا جو خود کو اونچی آواز کی بنا پر شیر سمجھنا شروع کر دے تو عین وقت پر خاموش شیر کو دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔

پاکستان کے بڑے صحافی اور شاعر آغا شورش کشمیریؒ نے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو ایک خط میں پوچھا: "مولانا کیا وجہ ہے کہ تاریخ انسانی میں ہمیشہ باطل کی فتح ہوئی ہے"۔ مولانا نے اس خط کے جواب میں جو لکھا وہ سننے اور پڑھنے کے لائق ہے۔

"حق کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ وہ بجائے خود حق ہے، وہ ایسی مستقل اقدار کا نام ہے جو سراسر صحیح اور صادق ہے۔ اگر تمام دنیا اس سے منحرف ہو جائے تب بھی وہ حق ہی ہے کیونکہ اس کا حق ہونا اس شرط سے مشروط نہیں ہے کہ دنیا اس کو مان لے، دنیا کا ماننا نہ ماننا سرے سے حق و باطل کے فیصلے کا معیار ہی نہیں ہے۔ دنیا حق کو نہیں مانتی تو حق ناکام نہیں ہے بلکہ ناکام وہ دنیا ہے جس نے اسے نہ مانا اور باطل کو قبول کر لیا. ناکام وہ قوم ہوئی جس نے انہیں رد کر دیا اور باطل پرستوں کو اپنا رہنما بنایا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا میں بات وہی چلتی ہے جسے لوگ بالعموم قبول کر لیں اور وہ بات نہیں چلتی جسے لوگ بالعموم رد کر دیں، لیکن لوگوں کا رد و قبول ہر گز حق و باطل کا معیار نہیں ہے۔ لوگوں کی اکثریت اگر اندھیروں میں بھٹکنا اور ٹھوکریں کھانا چاہتی ہے تو خوشی سے بھٹکے اور ٹھوکریں کھاتی رہے۔ ہمارا کام بہر حال اندھیروں میں چراغ جلانا ہی ہے اور ہم مرتے دم تک یہی کام کرتے رہیں گے۔ ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم بھٹکنے یا بھٹکانے والوں میں شامل ہو جائیں۔ اللہ کا یہ احسان ہے کہ اس نے ہمیں اندھیروں میں چراغ جلانے کی توفیق بخشی۔ اس احسان کا شکر یہی ہے کہ ہم چراغ ہی جلاتے جلاتے مر جائیں۔

یاد رکھیں! وہ اسلام جو ایک اللہ کا خوف دے کر ہر دوسرے خوف سے بے نیاز کر دیتا ہے، آج اسی ترغیب کی ضرورت ہے۔ بس ایسی ہی باتیں خود کو اور آپ کو یاد دلانے اور دلوں پر دستک دینے کیلئے حاضر ہوا تھا۔

سنا تو ہو گا تو نے ایک انسانوں کی بستی ہے
جہاں جیتی ہوئی ہر چیز جینے کو ترستی ہے

بروز ہفتہ 7 ربیع الثانی 1445ھ 21/اکتوبر 2023ء

ترقی معکوس

موجودہ عہد کو ٹیکنالوجی کا دور قرار دیا جارہا ہے۔ دنیا اس بات پر خوش ہے کہ ٹیکنالوجی نے بہت زیادہ ترقی کرلی ہے مگر اس ٹیکنالوجی کا مثبت کی بجائے منفی استعمال زیادہ ہورہا ہے جس نے موجودہ دور میں انسانوں کی زندگیوں کو تلخ اور دوبھر کردیا ہے۔ ان میں سے ایک قسم ڈیپ فیک بھی ہے جو کسی بھی شخص کی زندگی برباد کرسکتی ہے۔ آج کل ڈیپ فیک کا نام بہت مشہور ہے لیکن یہ ٹیکنالوجی ہے کیا اور کس طرح کام کرتی ہے، اس کے بارے میں شاید کم لوگ جانتے ہیں۔ ڈیپ فیک کا لفظ آرٹیفیشل انٹیلی جنس کے ڈیپ لرنگ پروگرام سے لیا گیا ہے جس سے مراد یہی لی جاسکتی ہے کہ ایسی ٹیکنالوجی جو پوری طرح سے نقلی ہو لیکن اتنی ڈیپ کہ پہچانی نہ جاسکے۔

یہ ایک ایسی ٹیکنالوجی ہے جس میں کسی کا چہرہ لیکر کسی کے جسم پر لگا دیا جاتا ہے پھر اس کی چہرے کے تاثرات کو مشین لرننگ کے ذریعے کنٹرول کرکے تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس ٹیکنالوجی کا استعمال کرکے آج بہت سی فیک اور فحش ویڈیوز بھی بنائی جارہی ہے۔ سوشل میڈیا میں ایسی بہت سے ویڈیوز اپلوڈ کی جارہی ہے جس میں چہرہ اور آواز کسی اور کی ہوتی ہے اور جسم کسی اور کا۔ جن کا پتا لگایا جاسکتا ہے لیکن ایک عام آدمی کیلئے یہ بالکل ناممکن بات ہے۔ اس میں جو چیز یا ٹیکنالوجی استعمال کی جاتی ہے اسے جنریٹو اڈور سیریل نیٹ ورک کہا جاتا ہے، اس کا استعمال کرکے آپ کسی انسان کے چہرے کے تاثرات تک کی نقل تیار کرسکتے ہیں جس پر اصل کا گمان ہوگا۔ ڈیپ فیک تصاویر یا ویڈیوز ایسے ہوتے ہیں جن میں نظر آنے لوگ وہ کہہ یا کررہے ہوتے ہیں جو انہوں نے کبھی کیا اور کہا ہی نہیں ہوتا۔

اس ٹیکنالوجی کی مدد سے جعلی تصاویر یا ویڈیو تیار کی جاتی ہے۔ پہلے جعلی تصاویر تیار کرنے کیلئے فوٹوشاپ سے کام لیا جاتا تھا جن کی جعل سازی کو پکڑنا کافی آسان ہوتا تھا۔ اس کے برعکس ڈیپ فیک ٹیکنالوجی سے تیار کی گئی تصاویر اور ویڈیوز کسی انسان کے ہاتھ کی نہیں بلکہ مصنوعی ذہانت کے ذریعے کمپیوٹر پر تیار کی جاتی ہیں۔ ڈیپ فیک تیار کرنے والے سافٹ ویئر کو جتنی زیادہ معلومات دی جائیں گی، مطلوبہ تصویر اتنی ہی زیادہ حقیقی لگے گی۔ کئی کمپنیاں اس ٹیکنالوجی کا تجارتی پیمانے پر بھی استعمال کررہی ہیں، مثلاً خبریں پڑھنے میں، اپنے ملازمین کو مختلف زبانوں میں ٹریننگز دلوانے کیلئے، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اس ٹیکنالوجی میں فیک یعنی جعلی کا لفظ استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ٹیکنالوجی کا بہت غلط استعمال بھی ہورہا ہے۔ جیسے اب مشہور شخصیات کو ڈیپ فیک کے ذریعے پورن فلموں میں اداکار بنادیا جاتا ہے یا پھر سیاستدانوں سے اشتعال انگیز اور گمراہ کن بیانات پھیلا دیے جاتے ہیں۔ جتنی دیر میں کوئی ان کے جعلی ہونے کا پتا لگاتا ہے، تب تک خاصا نقصان ہوچکا ہوتا ہے۔ تشویشناک امر یہ ہے کہ آرٹیفیشل انٹیلیجنس کا ابھی تک کوئی توڑ تلاش نہیں کیا جاسکا۔

فیس بک اور مائیکروسافٹ مل کر کوئی ایسا سسٹم بنانے کی کوشش کررہے ہیں جو اس چیز کا پتا لگاسکے کہ ویڈیو اصلی ہے یا نقلی تاکہ اپلوڈنگ سے پہلے خارج یا بلاک کردیا جائے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وطن عزیز میں ان دنوں سیاسی صورتحال کافی خراب ہے۔ ملک دشمن عناصر فیک اور فحش نیوز کے ذریعے سے سیاسی لیڈروں کو بلیک میل کرکے ان کی کردار کشی کررہے ہیں۔ ذمہ دار شہری ہونے کے ناطے ہمارا فرض ہے کہ ایسی فیک اور فحش ویڈیوز کو آگے شئیر کرنے کی بجائے ڈیلیٹ کردیا جائے۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ ہم غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس گناہ کبیرہ میں شامل ہورہے ہیں۔

اب بات کریں اس کے استعمال کی تو کوئی عام بندہ یہ کام بالکل بھی نہیں کر سکتا بلکہ ویڈیو میں موجود انسان کو نیا چہرہ ایک ایسا انسان ہی دے سکتا ہے جو آرٹیفشل انٹیلی جنس کے استعمال کے بارے میں جانتا ہو۔ کچھ عرصہ پہلے "فیس ایپ" نامی ایک ایپ اس چیز کا ایک سادہ سا نمونہ تھی لیکن یہ ٹیکنالوجی اس سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ مشینز سمجھ چکی ہیں کہ انسان کیسے برتاؤ کرتا ہے۔ بہر حال ہر ٹیکنالوجی کی طرف اس کے منفی استعمال کے طریقے بھی موجود ہیں۔ اس کے ذریعے مشہور شخصیات کو فحش فلموں کے اداکار بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے یا پھر سیاست دانوں کی ویڈیوز بنا کر اشتعال انگیز اور گمراہ کن بیانات پھیلا دیئے جاتے ہیں اور جب تک کوئی ان کے جعلی ہونے کا پتا لگاتا ہے، تب تک بہت کچھ نقصان ہو چکا ہوتا ہے۔ ایسی جعلی ویڈیوز، آڈیوز یا تصاویر بنانے کیلئے مخصوص سافٹ ویئرز استعمال ہوتے ہیں جو ڈیپ لرننگ اور مصنوعی ذہانت کی ٹیکنالوجی سے لیس ہوتے ہیں۔ ڈیپ فیک ویڈیو بنانے کیلئے اس سافٹ ویئر کو ٹارگٹ کے متعلق بہت سے معلومات فراہم کرنی ہوتی ہیں، مثلاً وہ دیکھنے میں کیسا ہے، بولتا کیسے ہے، بولتے وقت اس کی حرکات وسکنات کیسی ہوتی ہیں، وہ کس طرح کی صورتِ حال میں کیا ردِ عمل دیتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ٹارگٹ کے متعلق تمام معلومات مہیا کرنے کے بعد یہ سافٹ ویئر آپ کی مرضی کی ویڈیو، آڈیو یا تصویر بنانے کا کام شروع کر دیتا ہے اور نتیجے کے طور پر جو مواد بنتا ہے وہ حقیقت کے قریب تر ہوتا ہے، جس کے جعلی ہونے کا فوری طور پر پتا چلانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ماہرین اس ٹیکنالوجی کے حوالے سے دنیا کو متنبہ کرتے آرہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں ڈیپ فیک اور حقیقی ویڈیوز میں فرق کرنا مشکل تر ہوتا جارہا ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ یہ ان میں موجود معمولی فرق بھی ختم ہو جائے گا۔ یقین کریں کہ وہ پر فتن دور ایسا ہو گا کہ ایک دوسرے پر اعتبار اور اعتماد ختم ہو جائے گا اور سوسائٹی میں ایسی انارکی پیدا ہو جائے گی جس سے جرائم میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ میاں بیوی کے درمیان اختلافات پیدا کر کے رہا سہا خاندانی نظام بھی تباہ و برباد کرنے کی مشقیں شروع ہو جائیں گی اور پتہ نہیں کہ یہ تباہی کہاں تک انسانی معاشرے کو برباد کرے گی۔

اب ایک نئی تحقیق کے مطابق اس ٹیکنالوجی کو خواتین کے خلاف استعمال کیا جارہا ہے۔ نیدرلینڈ سے تعلق رکھنے والی ڈیپ ٹریس نامی سائبر سیکیورٹی کمپنی کی اس تحقیق میں بتایا گیا کہ ایک سال کے دوران آن لائن ڈیپ فیک ٹیکنالوجی سے تیار ہونے والی ویڈیوز کا 96 فیصد حصہ پورن ویڈیوز پر مشتمل تھا اور ان سب میں خواتین کے چہروں کو بدلا گیا جبکہ ان کو 15 کروڑ سے زائد بار دیکھا گیا۔ ہوسٹن یونیورسٹی کے قانون کے پروفیسر ڈینیئل سائٹرون نے محققین کو بتایا کہ ڈیپ فیک کو خواتین کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ اس ٹیکنالوجی کو خواتین کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ان کے چہروں کو پورن ویڈیوز میں لگایا جارہا ہے، ان کا کہنا ہے کہ "ڈیپ فیک ٹیکنالوجی" دہشت زدہ کرنے والا، شرمناک، گھناؤنا اور زبان بندی کا بدترین فعل ہے جس سے خواتین کیلئے آن لائن رہنا، ملازمت کا حصول یا اسے برقرار رکھنا اور خود کو محفوظ رکھنا مشکل ترین بنایا جارہا ہے۔ دسمبر 2018 سے اب تک ڈیپ فیک ٹیکنالوجی والی ساڑھے 16 ہزار ویڈیوز آن لائن ہیں جو کہ اس گزشتہ سال کے مقابلے میں سو فیصد زیادہ ہیں اور ان میں سے 96 فیصد پورن ویڈیوز ہیں۔ تحقیق کے مطابق گزشتہ سال فروری میں ایسی متعدد سائٹس کام کرنے لگی ہیں جو ڈیپ فیک

پورن کو جگہ دے رہی ہیں اوران میں سیٹ اپ 4 سائٹس میں 20 کروڑ 40 لاکھ سے زائد ویوز ریکارڈ ہوئے۔

ڈیپ فیک ٹیکنالوجی کو آگے بڑھنے میں "گٹ حب" میں چہرے بدلنے والے مقبول الگور تھمز کی مقبولیت کا اہم کردار ہے۔ 2 برس قبل جون میں ایک ڈیپ نیوڈ نامی موبائل ایپ اورآرٹی فیشل انٹیلی جنس ٹیکنالوجی (اے آئی ٹیکنالوجی) پر مبنی ایپلیکیشن سامنے آئی تھی جو کسی بھی خاتون کی بے لباس تصویر منٹوں میں تیار کر دیتی تھی۔ اس ایپ کے سامنے آنے کے بعد مختلف مضامین میں اس پر شدید تنقید ہوئی تھی اوراس کے غلط استعمال کے سنگین نتائج کا انتباہ بھی دیا گیا تھا، جس پر اسے فوری بند کر دیا گیا تھا اوراب اس ایپ کے پیچھے موجود ٹیم نے بھی تسلیم کیا ہے کہ اس نے پراجیکٹ کے بارے میں لوگوں کی دلچسپی کو غلط سمجھا اور لوگوں کی جانب سے اس کے غلط استعمال کے امکانات بہت زیادہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسے بند کر دیا گیا ہے۔ اس ٹیم نے ایک ٹوئیٹ میں اس بات کا اعلان کیا کہ ایپلیکیشن اب فروخت نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اس کے مزید ورژن ریلیز کیے جائیں گے تاہم اب بھی آن لائن مارکیٹ پلیس اور سروسز موجود ہیں جو منٹوں میں ڈیپ فیک ویڈیوز تیار کرنے میں مدد دیتی ہیں، اگر کوئی ٹیکنالوجی میں ماہر نہ بھی ہو تو وہ چند روپے دے کر ایک فیک ویڈیو حاصل کر سکتا ہے۔

اس ایپ کے مفت ورژن میں بنائی جانے والی تصویر پر بہت بڑا واٹر مارک ہوتا تھا جس میں لکھا ہوتا تھا کہ یہ جعلی تصویر ہے مگر پیڈ ورژن میں یہ واٹر مارک کونے میں کافی چھوٹا ہوتا تھا جسے آسانی سے ہٹایا جاسکتا تھا۔ یہ ایپ کئی ماہ سے دستیاب تھی اوراس کی ٹیم کا کہنا تھا کہ یہ اتنی زبردست بھی نہیں تھی، مگر ماہرین نے اس کے استعمال پر بہت زیادہ تحفظات ظاہر کیے تھے۔ اب بھی لوگ تصاویر کو ڈیجیٹل طریقے سے بدل لیتے ہیں مگر اس ایپ کے ذریعے یہ کام کوئی بھی 2 یا تین کلک پر کر سکتا تھا اوراسے کسی قسم کی محنت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ان تصاویر کو خواتین کو ہراساں کرنے کیلئے استعمال کیا جاسکتا تھا اور متاثرہ افراد کیلئے صورتحال سے نمٹنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

اس ایپ کو تیار کرنے والے کا نام البرٹو بتایا جاتا ہے جس نے ٹیکنالوجی سائٹ "دی ورج" میں تسلیم کیا کہ اگر وہ یہ کام نہ کرتا تو کوئی اور جلد کر لیتا کیونکہ ٹیکنالوجی تیار ہے (بلکہ ہر ایک کی رسائی میں ہے)۔ اس ٹیم نے ٹوئیٹ میں لکھا "دنیا ابھی اس طرح کی ٹیکنالوجی کیلئے تیار نہیں اورابھی مزید وقت چاہیے ۔" گویا اس شیطانی ایپ کو تیار کرنے والا ندامت کی بجائے دنیا کو الزام دے رہا ہے اوراس وقت کا انتظار کر رہا ہے جب دنیا مزید اخلاقی پستی کی گہری کھائی میں گر جائے گی جہاں اس ایپ کو واقعی ٹیکنالوجی کا معراج سمجھ کر لطف اندوز ہوا جائے گا۔

ارضِ وطن میں ہر روز ہماری سیاسی اشرافیہ نے جو اودھم مچار کھا ہے، جو اخلاق باختہ زبان استعمال کی جارہی ہے، اب یہ بعید نہیں کہ سیاسی فوائد حاصل کرنے کیلئے ایسی بیہودہ ویڈیوز اپنے سیاسی مخالفین کی کردار کشی کیلئے مارکیٹ میں لائی جائیں کیونکہ اس سے پہلے ہمارے ملک میں ایسا گھناؤنا فعل کیا جاچکا ہے جبکہ اس وقت تو سیاسی پارہ اس قدر گرم بھی نہیں تھا لیکن اقتدار کی طمع تمام اخلاقی اقدار کو پامال کرنے میں لمحہ بھر نہیں سوچتی کہ اس کے مستقبل کی سیاست اور نوجوان نسل کی بربادی کا کس قدر خطرناک سامان مہیا کر جاتی ہے۔ موجودہ سیاسی ابتری کی بنا پر ملک کی معاشی صورتحال انتہائی خوفناک صورتحال اختیار کر چکی ہے۔ ملکی محفوظ ذخائر تیزی سے زوال پذیر اور مہنگائی عروج پر ہے۔ ملک میں عوام کو کھانے پینے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ آسمان کو چھوتی ہوئی پٹرول کی قیمتوں کے باوجود پرتعیش گاڑیوں کی درآمد جاری وساری ہے، اب بھی اربوں روپے کا "بیوٹی پارلرز میں میک اپ" کی درآمدی پراڈکٹس زیر استعمال ہیں جو چند گھنٹوں کے استعمال کیلئے ہوتی ہیں اور بعد ازاں منہ ہاتھ دھو کر ان سے نجات حاصل کر لی جاتی ہے۔ حیرت کی

بات تو یہ ہے کہ عالمی مالیاتی ادارے بجلی گیس اور دیگر ضروریات زندگی کی اشیا پر ٹیکس بڑھانے کیلئے تیسری دنیا کے ممالک کی کلائی مروڑنے میں اپنی مہارت استعمال کرتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی بھی ان پر تعیش سامان پر پابندی لگانے کی ضرورت پر زور نہیں دیا بلکہ وہ وہ ایسا کیوں کہیں گے جبکہ یہ تمام اشیا کی درآمد انہیں کے کاروبار کو وسعت دینے میں معاون ہوتی ہیں۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ فوری طور پر معاشی ایمرجنسی پر تمام سیاسی جماعتیں بلا تفریق ایک ایسا معاہدہ کریں جس کے نفاذ کے لئے ہمیں سب اختلافات ایک طرف رکھتے ہوئے اس ملک کی سلامتی کیلئے اہم اقدامات اٹھانا ہوں گے۔ جس ملک کے اقتدار کیلئے آپ دن رات کوشاں ہیں اور ایک دوسرے پر جھوٹ، مکاری، بددیانتی اور بداخلاقی کے ساتھ ساتھ کرپشن کے الزامات لگاتے ہیں، اس کی سلامتی از حد ضروری ہے وگرنہ عالمی مالیاتی ادارے سود خور مہاجن اپنے اپنے پھندے لئے دانت تیز کر کے ہماری طرف بڑی تیزی کے ساتھ لپک رہے ہیں۔ اب آئی ایم ایف کے 9 ماہ کے سٹینڈ بائی قرضہ میں شامل مزید پابندیوں کے مطالبے سے عوام کی زندگی اجیرن بنانے کے منصوبے بھی جلد سامنے آرہے ہیں۔ ہمیں ان حالات کا ادراک کرتے ہوئے اپنی سمت کو فوری تبدیل کرنا ہو گا۔

کہتے ہیں فرانس سے آزادی کے بعد کانگو میں فرانس نے اپنا سفیر تعینات کیا۔ ایک دن فرانسیسی سفیر شکار کی تلاش میں کانگو کے جنگلات میں نکل گیا۔ جنگل میں چلتے چلتے فرانسیسی سفیر کو دور کچھ لوگ نظر آئے وہ سمجھا شاید میرے استقبال کیلئے کھڑے ہیں۔ قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک آدم خور قبیلہ ہے چنانچہ فرانسیسی سفیر کو پکڑ کر انہوں نے ذبح کیا اس کی کڑاہی بنائی، شوربا نکالا اور جنگل میں منگل منایا۔ فرانس اس واقعے پر سخت برہم ہوا اور کانگو سے مطالبہ کیا کہ ورثا سفیر کو کئی ملین ڈالر خون بہا ادا کرے۔ کانگو کی حکومت سر پکڑ کر بیٹھ گئی، خزانہ خالی تھا، ملک میں غربت و قحط سالی تھی، بہر حال کانگو کی حکومت نے فرانس کو ایک خط لکھا کہ کانگو کی حکومت محترم سفیر کے ساتھ پیش آئے واقعے پر سخت نادم ہے، چونکہ ہمارا ملک خون بہا ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا لہذا غور و فکر کے بعد ہم آپ کے سامنے یہ تجویز رکھتے ہیں کہ ہمارا جو سفیر آپ کے پاس ہے آپ بدلے میں اسے کھا لیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس واقعے میں کتنی صداقت ہے ہاں مگر میں سوچ رہا ہوں کہ ہماری حکومت آئی ایم ایف کو ایک خط لکھے کہ پچھلے 76 سالوں میں ہماری اشرافیہ بشمول سول و نان سول نے جو قرضے لئے ہیں وہ آپ ہی کے بینکوں میں پڑے ہیں، لہذا تجویز ہے کہ بدلے میں ہماری اشرافیہ کے بنک بیلنس، اثاثے اپنے قرض کے عوض ضبط کر لیں، اگر پھر بھی قرض ادا نہیں ہوتا تو اشرافیہ کے ان افراد کو آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔

بروز سوموار 9 ربیع الثانی 1445ھ 23 / اکتوبر 2023ء

عظمت کا راستہ

وہ مسلمان نہیں تھا لیکن اس نے لکھا کہ "دنیا میں اگر کوئی پیغمبر یا صالح شخص نہ بھیجا جاتا اور صرف مسلمانوں کی کتاب "القرآن" موجود ہوتی تو یہ کتاب انسانی ہدایت کیلئے کافی تھی"۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ ایسے دولت مند گھرانے میں پیدا ہوا جو 4220 کمروں کے شاندار محل پر مشتمل تھا۔ اس نے کٹر مذہبی گھرانے میں پرورش پائی۔ وہ دو ناول لکھ کر عظمت کی ایسی بلندی پر پہنچ گیا جہاں لوگ اس کو ایک نظر دیکھنے کیلئے اس کے گھر کے سامنے مہینوں ڈیرے ڈالے رہتے۔ اس شخص کی زندگی اور نظریات پر کم و بیش 23 ہزار کتابچے، تین لاکھ 37 ہزار کتابیں اور 5 لاکھ 6 ہزار مضامین تحریر کیے گئے۔ اس قدر عزت، شہرت اور دولت کا حامل ٹالسٹائی قرآن کے پیغام پڑھ کر بے ساختہ پکار اٹھا کہ "میری زندگی میں پیسے اور شہرت نے بڑا کردار ادا کیا ہے لیکن اس کے باعث میں اپنے مقصدِ حیات کو بھول گیا۔ ان دونوں چیزوں کیلئے جینے والوں کو نہیں معلوم کہ ان کو چھوڑ کر جینے میں کتنا لطف اور مزہ ہے"۔ روس کے قدیم رئیسوں کی طرح ناز و نعم میں پرورش پانے والے ادیب نے جب حقیقت کا سراغ لگایا تو قرآن کی تعلیم سے متاثر ہو کر اپنی تمام جائیداد غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دی۔ دولت کی زیادتی کو وہ باعثِ عزت نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ "خدا کو جس انسان سے پیچھا چھڑانا ہو اور دنیا و آخرت میں تماشا بنانا ہو اسے بہت امیر کر دیتا ہے۔ حد سے زیادہ امارت تمام اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے"۔

اس کی کتابیں کروڑوں کی تعداد میں بکتی تھیں لیکن وہ ان کے ذریعے کمائی گئی تمام دولت ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اسی بات پر اپنی بیوی سے اختلاف اتنا بڑھا کہ اس نے گھر چھوڑ دیا اور آخر کار روس کے ایک ریلوے اسٹیشن پر سردی سے لڑتا ہوا نمونیا میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ آخری وقت میں اس کے منہ پر یہ جملہ تھا کہ "خدا بڑا مسبب الاسباب ہے"۔ زندگی کی آخری سانس تک لوگوں کیلئے کی جانے والی اپنی خدمات کو وہ پرکاہ کے برابر بھی نہ سمجھتا تھا۔ 82 سال کی عمر میں "جستجو اور مسلسل جستجو" کے لفظ پکارتا وہ دنیا سے رخصت ہو گیا لیکن عظیم افراد کی عظمت کا راز کھول گیا کہ دولت اور شہرت اصل وجہ عظمت نہیں قرار دی جا سکتی۔ عظمت کا راستہ تو صرف اور صرف انسانیت سے محبت کا راستہ ہے۔ عظیم فرد ہو یا عظیم قوم، بنیادی نکتہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے انسانیت کیلئے کیا کیا؟ جو چیزیں یا نظریات ایجاد ہوئے، ان سے انسانیت کو کس حد تک فلاح حاصل ہوئی۔ لیکن دولت اور طاقت کے حصول کیلئے اسی ٹالسٹائی کے ملک کے فرمانروا نے وصیت کی کہ "تم ہی بالاتر اور برتر قوم ہو اور دنیا پر حکمرانی کا حق تم ہی کو ہے"۔ روسی قوم نے "عظیم پیٹر" کی اس وصیت کو دل و جان سے قبول کیا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد روس توسیع پسندانہ پالیسی پر اس طرح گامزن ہوا کہ خونِ انسانی کو پانی کی طرح بہاتے ہوئے مشرقی یورپ میں البانیہ، ہنگری، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، فن لینڈ مشرقی جرمنی کے علاوہ ترکی۔ چین، جاپان اور ایران کے بھی کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا لیکن ابھی کچھ اور چاہیے تھا لہٰذا ایتھوپیا، اسٹونیا اور افغانستان کے کچھ حصوں پر بھی قبضہ کر لیا تاہم افغانستان پر مکمل قبضے کی خواہش بالآخر اسے لے ڈوبی۔ یوں تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ظلم و سفاکی کے ذریعے عظمت کا حصول دیوانے کے خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا لیکن تاریخ کی اس حقیقت کا ادراک اگر قوموں کو ہو جاتا تو تہذیبِ انسانی کی قباخونِ انسانی سے یوں لتھڑ نہ رہی ہوتی۔

دوسری طرف عالمِ انسانیت کو ایک ایسے انسانی حقوق اور تہذیب کی علمبردار قوم سے بھی واسطہ پڑا جنہوں نے گزشتہ چند برسوں سے دوسروں کے مذہب (مسلم امہ) کا بظاہر اتنا احترام کرنے کا اپنے ہاں ایسا تماشہ سجایتے ہیں کہ قصرِ سفید کے فراعین قرآنی دعاؤں کا انگریزی ترجمہ پڑھ پڑھ کر

مسلمانوں کے ساتھ اپنے قصر ابیض کے لان میں مسلمانوں کے ساتھ خود بھی روزہ افطار کرتے رہے اور اسی شام ساتھ میں افغانستان کیلئے ہزاروں ٹن وزنی بارودی بم "تحفہ رمضان کے نام سے ارسال کرنے میں بھی شرم محسوس نہیں کی اور آج ایک مرتبہ پھر چشم فلک نے دیکھا کہ امریکی وزیر خارجہ اسرائیلی مظالم سے آنکھیں بند کر کے اپنے یہودی ہونے کے اعلان کے ساتھ یہودیوں کو مظلوم ٹھہرانے کی پوری کوشش کرتا رہا۔

دنیا 6/ اگست 1945ء کی صبح سوا آٹھ بجے کا وہ روح فرسا دن کیسے بھول سکتی ہے جب جاپان کے دو شہروں ناگاساکی اور ہیروشیما پر گرائے گئے بموں کے نتیجے میں انسانی صحت، زمین اور چرند پرند کو ملیامیٹ، اور وہاں کے کھنڈرات نوحہ پڑھتے ہیں، اسے افغانستان اور عراق پر برسائے گئے بموں کی تابکاری کے اثرات کا جائزہ لینے کی فرصت نہیں۔ وہ فاختاؤں اور کبوتروں کی موت پر تو نوحہ کناں ہوتے ہیں لیکن غزہ کے ہسپتالوں پر بمباری کر کے اسے صفحہ ہستہ سے مٹا دینے کے عمل کو جائز سمجھتے ہیں۔ افغانستان، عراق، چیچنیا، کشمیر اور فلسطین میں جنگ سے مرنے والے لاکھوں بچوں اور عمر بھر معذوری کی زندگی گزارنے والے معصوموں کیلئے ان کے پاس آنسو ہیں نہ نوحے۔ اسی قصر سفید کے ناک کے نیچے ایک خونخوار درندہ 6 سال کے معصوم بچے پر شکاری چاقو کے 26/ وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور اس کی ماں کو بھی شدید زخمی کر دیتا ہے جو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

افغانستان میں لاکھوں افراد کے پرخطے اڑا دینے والے اپنی بدترین تاریخی اور عبرتناک پسپائی کے بعد اپنی عبرتناک شکست کا بدلہ لینے کیلئے اس غریب ملک کے ساڑھے نو ارب ڈالر ضبط کر لئے جاتے ہیں تاکہ انہیں پھر سے جھکایا جا سکے۔ عظمت کے حصول کی تمنا بہت آسان ہے لیکن اس کا حصول بہت قربانی مانگتا ہے۔ تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ زندۂ جاوید رہنے والے حکمرانوں نے دنیا میں عدل و انصاف اور مساوات کو اپنا اوّلین اصول بنایا تھا۔ مظلوموں اور کمزوروں کیلئے طوق و سلاسل اور مکروہ اذیتی طریقوں کے موجد تو تاریخ میں انسانیت کی توہین کرنے والے متکبر فرعون کے طور پر ہی یاد کیے جاتے ہیں۔

ان دنوں ہماری بدقسمتی جو علم و دانش کے نام پر ہمیں لوٹ رہی ہے وہ آئے دن ہمارے ان پیشہ ور دانشوروں کے ہاتھوں ہو رہی ہے جو اپنے آقا کی تائید میں حماس کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے اپنے بیہودہ علم کی ابکائیاں کر رہے ہیں۔ عمل کے لحاظ سے کورے دانشور قوم کو بتائے ہوئے فارمولوں پر خود جنبش تک نہیں کرتے لیکن قوم سے توقع کرتے ہیں کہ جب یہ اپنی سواریوں سے نیچے اتریں تو اس کا دروازہ کھولنے کیلئے میزبان قطار میں کھڑے ہوں، پھولوں کے ہار پہنا کر نعروں کی گونج میں ان کو جلسہ گاہ کے اسٹیج پر بٹھائیں اور میزبان تعارفی کلمات میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر ان کو دعوتِ خطاب کیلئے بلائے۔

یاد رکھیں کہ وہ علم جو کبھی نیت نہ بن سکا، وہ نیت جو ارادہ نہ بن سکی، وہ ارادہ جو عزم نہ بن سکا، اور وہ عزم جو کسب نہ بن سکا، وہ کسب جو عمل نہ بن سکا، وہ عمل جو نتیجہ نہ لا سکا، وہ نتیجہ جو محاسبہ نہ کرا سکا، وہ محاسبہ جو توبہ نہ کرا سکا، ایسے علم کے بارے میں تو میرا رب ببانگ دہل تنبیہ فرماتا ہے: ان کی مثال گدھے کی سی ہے جن پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں۔

بروز بدھ 11 ربیع الثانی 1445ھ 25/ اکتوبر 2023ء

حافظ دواخانہ

میں پچھلے کئی ماہ سے یہ بری طرح محسوس کر رہا ہوں کہ واقعی کوئی زوردار بد دعا ہمارے تعاقب میں ہے کہ نہ پوری قوم کی دعائیں رنگ لا رہی ہیں اور نہ ہی تہجد گزاروں کا گریہ نیم شب کام آرہا ہے۔ مایوسی ساون کی ہریالی کی طرح وطن عزیز میں اپنا زور بڑھاتی جا رہی ہے۔ بے دلی اور بیزاری جسم و خوں میں اس طرح گھل مل گئی ہے کہ زندہ رہنے کی امنگ اور آس ختم ہوتی جا رہی ہے۔ موجودہ سیاستدانوں اور مقتدر اشرافیہ کی پالیسیوں کے رد عمل میں بے یقینی کی آکاش بیل ذہن و فکر کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے اور ناامیدی کا زہریلا شیش ناگ دن میں کئی مرتبہ آپ کے خوابوں کو ڈستا ہے۔ دن اور رات جیسے آگ کے الاؤ میں بھسم ہو کر رہ گئے ہیں لیکن اس کے باوجود کچھ دوست اب بھی امید کی قندیل جلائے کسی صلاح الدین ایوبی کا انتظار کر رہے ہیں۔

امید اندھی ہوتی ہے اور یقین بھی دلیل نہیں مانگتا۔ ہم بھی کہہ دیتے ہیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور انشاءاللہ حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے لیکن حالات کی حقیقت سے آنکھیں چرا کر ہم اپنے آپ کو دھوکا تو دے سکتے ہیں لیکن ان خطرات کو ٹال نہیں سکتے۔ صرف بارش کی امید سے دہکتی تمازت بھری دھوپ کی اذیت ناکی سے تو بچ نہیں سکتے۔ اس دور دیس میں بھی وطن کی مٹی نے اس قدر اپنے حصار میں جکڑ رکھا ہے کہ شب و روز اس کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں حالانکہ ہر روز خوابوں کی جواں مرگی کی اطلاع موصول ہوتی ہے۔ ہمارے وجود کا ایک قیمتی حصہ پاکستان جہاں ہماری آبرو کو تحفظ اور سروں کی سلامتی کی ضمانت ملی تھی اب خاک میں ملانے کی تدبیریں ہو رہی ہیں (خاکم بدہن)۔

پاکستان کے ساتھ آزاد ہونے والا چین دنیا کی معاشی سپر پاور بن چکا، ہم سے الگ ہونے والا بنگلہ دیش کہاں کھڑا ہے، افغان کرنسی کو اپنے روپے کے مقابلے میں دیکھ کر شرم محسوس ہو رہی ہے۔ ہماری ناکام خارجہ پالیسی کا یہ عالم ہے کہ جس چین کی دوستی ہمالیہ سے اونچی اور سمندر سے گہری کا دن رات نعرہ الاپتے ہیں، وہاں حالیہ منعقدہ سربراہ کانفرنس کی عالمی میڈیا کو جاری تصویر میں ہمارا نگران وزیر اعظم سب سے پچھلی قطار کے کونے میں کھڑا نظر آتا ہے جیسے اسکول کی کلاس میں نالائق بچے کو سزا کے طور ہر پچھلی قطار میں کھڑا ہونے کا حکم ملتا تھا۔

نجانے کیوں وہ ندامت بھرا دن میرا اب بھی تعاقب کر رہا ہے جب فاسق کمانڈو مشرف ہزاروں میل دور بیٹھے قصر سفید کے فرعون کے ایک ہرکارے کی فون کال پر سرنڈر ہو کر سب کچھ ہار کر افغانستان کو تاراج کرنے میں اپنی تمام خدمات پیش کر کے ارضِ وطن کو ایک مستقل دہشتگردی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن گیارہ سال کی سفاکی کے باوجود افغانستان کے مصائب سے جان چھڑانے کیلئے بے چینی کے عالم میں قصرِ سفید مذاکرات کیلئے ہمیں استعمال کر کے بالآخر رسوا کن شکست کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے اور ہمیں اس ساری جنگ اور بعد ازاں افغانستان سے انخلاء کیلئے محفوظ راستہ دینے اور ہماری ساری وفاؤں کے صلہ میں ہماری ملکی سلامتی کو درپیش سازشوں کے انبار کا طوق ہمارے گلے ڈال کر رخصت ہو جاتا ہے۔ افغانستان کو تاراج اور برباد کرنے کیلئے تو ہماری سرزمین استعمال کرتا ہے لیکن افغانستان میں ہمارے ازلی دشمن انڈیا کو باقاعدہ پاکستان میں دہشتگردی کرنے کیلئے چھتری مہیا کر دیتا ہے اور اب اس خطے سے رخصت ہونے کے باوجود اپنے مکروہ اعمال کی باگ ڈور انڈیا کے سپرد کر کے سازشوں میں مصروف ہے اور ہم اب بھی اس کے گن گا رہے ہیں۔

یہ صورت حال آخر کب تک چلے گی، افغان سرحد پر باڑ لگانے کے باوجود مزاحمت کار آپ سے سنبھالے جاتے ہیں نہ قصر سفید کا فرعون آپ کی بات

سنتا ہے۔ امریکا کی پوری کوشش ہے کہ کسی طریقے سے ہمارے حالات اس قدر بدتر کر دیئے جائیں کہ افغانستان کے ساتھ کھلی جنگ کا آغاز ہو جائے ۔ٹرائیکا (امریکا، بھارت اور اسرائیل) کے نمک خوار سرخ استقبالی قالین لئے بے چینی سے انتظار کی گھڑیاں گزار رہے ہیں اور اس سلسلے میں نمرود کی آگ میں بیٹھے ایجنٹ بلوچستان کی آگ پر تیل چھڑکنے کا کام جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن ہماری مقتدر اشرافیہ اپنی سیاسی لیبارٹری میں مختلف تجربات میں مصروف ہے۔ پتہ نہیں کیوں ہم اپنی غلطیوں سے کچھ سیکھنے کیلئے تیار نہیں۔

کیا ہم یہ بھول گئے کہ مشرف نے ملک کی دو جماعتوں کے سربراہان کو ملک بدر کر کے یہ بیان دیا تھا کہ اب ان کی پاکستان واپسی "اوور مائی ڈیڈ باڈی" ہی ممکن ہو گی لیکن کونڈالیزا رائس کی فون کال پر اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے اپنے نائب جنرل کیانی کے ساتھ بے نظیر سے ڈیل کرنے کیلئے دبئی پہنچ گیا اور ملکی عدالتی نظام سے ماورا "این آر او" عطا کر کے خود کو فاتح سمجھ کر داد وصول کرتا رہا لیکن ملک سے کیا گیا سب سے بڑا ظالمانہ مذاق ایسے گلے پڑا کہ مکے دکھانے والا رات کے اندھیرے میں ایسا فرار ہوا کہ اس کی "ڈیڈ باڈی" ہی ملک میں واپس آئی۔ لیکن ملک کے ساتھ ظالمانہ مذاق کرنے والے دھڑلے سے "جمہوریت سب سے بڑا انتقام" کا نعرہ لگا کر ملکی خزانے پر ہاتھ صاف کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ "این آر او" کے عوض مضروب ملکی خودداری کو قصر سفید کے فرعون کے قدموں میں نچھاور کرتے رہے۔

"جمہوریت سب سے بڑا انتقام" کا نعرہ لگانے اور عوامی مینڈیٹ کے افق سے طلوع ہوتے سلطانی جمہور کے آفتاب و ماہتاب کی نمائندگی کرنے والے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے اپنے پہلے امریکی دورہ سے قبل اپنے آقا "بش" کو تحفے میں دینے کیلئے صرف ایک دن قبل ملک کے حساس ادارے کی سربراہی رحمان ملک کے سپرد کرنے کا نوٹفکیشن جاری کر دیا تو اس کے جوابی ری ایکشن کے طور پر چند گھنٹوں میں یہ مقرر کر کے وطن عزیز میں دشمن ایجنٹوں کا راستہ ہموار کرتے پڑ گیا لیکن اس پسپائی کا بدلہ لینے کیلئے غدار حسین حقانی کو امریکا کا سفیر آرڈیننس واپس لینا ہوئے باقاعدہ ویزوں کے ساتھ ان کو داخلے کی سہولت عطا کر دی جنہوں نے ملک میں دہشتگردی کا طوفان کھڑا کرتے ہوئے خاکم بدہن ملک کے ٹکڑے کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پہلی مرتبہ سوات جیسی پرامن وادی کو لہولہان کر دیا گیا جس کے جواب میں پورے سوات کی آبادی کے انخلاء کے بعد اس آگ اور خونی طوفان کے دریا کو عبور کرتے ہوئے ایک بھاری قیمت چکانی پڑی اور اس خطرناک سازش سے سے ملک کو بچایا گیا جبکہ امریکا کے دفاعی تجزیہ نگار کھلے عام پاکستان کے کئی ٹکڑوں کی تقسیم کے نقشے شائع کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخوں کا بھی اعلان کر چکے تھے۔

اس بدنصیب پاکستانی قوم کی کم نصیبی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا بلکہ "جمہوریت سب سے بڑا انتقام" کے موسم گل کا انتظار ہو رہا تھا کہ دکھوں کی ماری اس قوم کا وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی پہلی مرتبہ واشنگٹن میں شہزادی کونڈالیزا رائس کے دربار میں شرف باریابی حاصل کر کے باہر نکلا تو پہلا خوشامدی بیان اپنی حاکمیت اعلیٰ کے دفاع کی بجائے مذاکرات کو بہت بے تکلفانہ، دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ قرار دیکر اپنی غلامی کی سند حاصل کر رہا تھا جبکہ وزیر خارجہ کو شہزادی کونڈالیزا رائس سے ملاقات سے قبل امریکی سرپرستی میں نیٹو افواج کے اس مکروہ حملے کی اطلاع دی جا چکی تھی جس کا اعلان

پاکستانی سپاہ کے ترجمان میجر جنرل اطہر عباس دنیا کے ذرائع ابلاغ کے سامنے کر چکے تھے کہ امریکی حملہ میں پاکستانی علاقے انگوراڈہ کی فوجی چوکی پر پاکستان فرنٹیر کور کے کم از کم 7 سیکورٹی اہلکار شہید اور 6 شدید زخمی کر دیئے ہیں جبکہ نیٹو کی افواج کے پاس غلطی اور لاعلمی کی گنجائش اس لئے نہیں تھی کہ نیٹو کی افواج کو اس علاقے میں قائم تمام پاکستانی چوکیوں کے قیام کی نقشوں کے ذریعے پیشگی اطلاع دی جا چکی تھی۔

اس وقت بھی عام توقع تو یہ تھی کہ وزیر خارجہ جو "جمہوریت سب سے بڑا انتقام" کے نعرے سے لیس اور عوامی مینڈیٹ کے افق سے طلوع ہونے وا لے نئے جمہوری پاکستان کی ترجمانی کرتے ہوئے اس توہین آمیز امریکی رویے پر بھرپور احتجاج کریں گے پاکستانی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے نمائندے بڑی شدت سے منتظر تھے کہ وزیر خارجہ کا تعلق ایک عوامی جذبات اور احساسات کی علمبر دار جماعت سے ہے اس لئے وہ دبنگ لہجے میں صدائے احتجاج بلند کریں گے اور امریکی ایوانوں کو مطلع کریں گے کہ اب یہ مشرف کا نہیں بلکہ کروڑوں باغیرت پاکستانیوں کی سرزمین ہے جو اپنی خود مختاری کی حفاظت کا سلیقہ جانتی ہے۔ قوم اس بیان کی توقع کر رہی تھی کہ وزیر خارجہ قریشی اپنی گرجدار آواز میں یہ بیان دیں گے کہ ہم اس حملے کے بعد اس نام نہاد "وار آن ٹیرر" سے نکل کر اپنا راستہ اپنی آزادانہ مرضی سے چنیں گے لیکن اس 45 منٹ کی ملاقات کے بعد پاکستانی وزیر خارجہ جب اس نمک کی کان سے باہر تشریف لائے تو نمک بن چکے تھے۔

وزیر خارجہ نے شہزادی کونڈالیزا رائس کے ساتھ اپنی ملاقات کو جب بہت بے تکلفانہ، دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ قرار دینے کا جھوٹ بولا تو پاکستانی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں نے پاکستانی علاقے انگوراڈہ کی فوجی چوکی پر حملے کو "غیر دوستانہ" اقدام" سے تعبیر کیا تو وزیر خارجہ نے فوری طور پر اپنے فدویانہ بیان میں شیرینی کی حلاوت گھولتے ہوئے اس کی تصحیح فرمائی کہ اس طرح کے (سخت) الفاظ استعمال نہ کریں۔ شائد وہ پاکستانی سیکورٹی اہلکاروں کے شہدا اور شدید زخمی ہونے کے عمل کو دوستانہ چھیڑ چھاڑ، بے تکلفانہ ہنسی مذاق یا محبوبانہ نازو انداز سے تشبیہ دینا چاہتے تھے۔ وزیر خارجہ کے اس منافقانہ عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ امریکی درندوں کا یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا اور سلالہ کی چوکی پر بے رحمانہ حملے میں انہوں نے ایک بار پھر ہمارے 24 سپوت کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔

اس خفیہ گٹھ جوڑ کے نتیجے میں ممکن تھا کہ امریکیوں کو کوئی بڑا تحفہ بھی مل جاتا لیکن میمو سکینڈل پر سپریم کورٹ کے بروقت اقدامات اور ایبٹ آباد کمیشن کے 2 مئی کے اقدامات کی تحقیقات کے دائرکار کو وسعت دینے سے یہ محسوس ہونا شروع ہو گیا کہ پاکستان کی تاریخ میں کوئی غیر معمولی قدم اٹھانے کی سازش پر عملدرآمد ہونے جا رہا ہے جو وطن عزیز کو کسی نئے سانحے کی طرف دھکیل سکتا ہے۔ عالمی اور مقامی میڈیا میں یہ خبریں منظر عام پر آنے لگیں کہ امریکی طیارہ بردار جہاز "ابراہام لنکن" کو خلیج سے بحیرہ عرب کی طرف بڑھنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ قصر سفید کے فرعون بش نے اپنے پالیسی ساز ادارے میں تقریر کرتے ہوئے صاف صاف اعلان کیا کہ "آئندہ اصل چیلنج عراق اور افغانستان کی بجائے پاکستان ہو گا"۔ تب جا کر قوم کو میمو گیٹ سکینڈل کے پیچھے چھپی ہوئی اس سازش کا پتہ چلا کہ کس طرح ان تمام غداران وطن نے اپنی ہی فوج کے خلاف امریکا سے مدد مانگی تھی جس کے افشاء ہونے پر میمو گیٹ سکینڈل وجود میں آیا لیکن آج تک ان کے ذمہ داران کو کیفر کردار پہنچانے کی بجائے انہی کرداروں نے ملک میں اقتدار کے ایوانوں میں جمہوریت کے نام پر خود کو مظلوم ثابت کرنے کی کوششیں کیں بلکہ قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اسی وزیر خارجہ نے ایک مرتبہ پھر اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کیلئے "سائفر" جیسا ڈرامہ رچایا بلکہ اب اپنے سیاسی سربراہ کے ساتھ اس مقدمے کے انجام کا منتظر ہے۔ میرے لئے ان کا یہ کردار قطعاً

حیران کن نہیں بلکہ ان کے آباؤاجداد بھی ماضی میں اپنے انگریز آقاؤں کو مسلمان مجاہدین آزادی کی مخبری کر کے انعام میں جاگیریں وصول کر چکے ہیں جن کے موصوف گدی نشیں ہیں۔

ملک میں عام انتخابات کا طبل بج گیا ہے اور تمام جماعتیں اقتدار کے حصول کیلئے ایک مرتبہ پھر دودھ اور شہد کی نہریں بہانے کا دعویٰ کریں گی لیکن ہم تمام ان آزمودہ سیاستدانوں کے چہروں کو بے نقاب کرنے کا عمل جاری رکھیں گے۔ مقتدر اشرافیہ کیلئے ضروری ہو گیا ہے کہ ملک کو اس بیدردی کے ساتھ لوٹنے والوں کا قانونی بے رحمی کے ساتھ منصفانہ احتساب کیا جائے اور جو بے گناہی ثابت کر دے تو اسے آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے۔ اس تاثر کو بھی زائل کیا جائے کہ میاں نواز شریف کو انگریز ڈاکٹروں کی بجائے "حافظ دواخانہ" کی ہومیوپیتھک ادویات سے افاقہ ہوا ہے۔ قومی سلامتی کیلئے قصر سفید کے فرعون کو ٹرائیکا کی درپردہ سازشوں کے متعلق واضح پیغام دیا جائے وگرنہ قوم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو گی کہ ہماری مقتدر اشرافیہ بھی انہی بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے ہیں جہاں اس سے پہلے مشرف اور دیگر سیاستدان اپنا سب کچھ قربان کر چکے ہیں۔ نجانے بابا اقبال کیوں یاد آ گئے:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہیں آدم، جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

بروز جمعرات 12 ربیع الثانی 1445ھ 26/ اکتوبر 2023ء

اسرائیل: امریکا کا کرائے کا سپاہی

یہ سوچ بہت عام ہے کہ یہودی یا اسرائیلی اس قدر چالاک اور ذہین قوم ہے کہ امریکا جو اس وقت دنیا کی واحد سپر پاور ہے بظاہر اسرائیل کی مرضی کے کچھ بھی نہیں کرتا یا کر سکتا۔ پوری دنیا کی معیشت پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ میڈیا پر کوئی موضوع یا خبر ان کی مرضی کے بغیر چل نہیں سکتی۔ امریکا میں کوئی شخص کانگریس کا ممبر یا امریکا کا صدر یہودی لابی کے پیسے اور سیاسی مدد کے بغیر نہیں بن سکتا، یہ تاثرات اس وقت اور مضبوط ہو جاتے ہیں جب امریکا مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی حمایت میں نہ تو کسی مخالفت کی پرواکرتا ہے اور نہ ہی اپنے بنائے ہوئے اصولوں کو توڑنے میں شرم محسوس کرتا ہے ،اس کے علاوہ فری میسنز کی کہانیاں، اسرائیل کی خفیہ ایجنسیوں، فوج اور کمانڈوز کی طاقت کے قصے ایسا تاثر پیدا کر دیتے ہیں کہ یہ یقین ہونے لگتا ہے جیسے دنیا کی اصل طاقت تو ایک چھوٹی سی قوم یہود ہے جس نے امریکا یورپ اور دنیا کی تمام بڑی قوموں کو قابو کر رکھا ہے۔ دنیا میں جو بھی فساد ہوتا ہے اس کے پیچھے یہود کا ہاتھ ہوتا ہے اور مسلمانوں پر ہونے والے تمام مظالم کے ذمہ دار یہودی ہیں۔ اس تاثر کے نتیجے میں مسلمانوں میں یہ خیال جڑ پکڑ لیتا ہے کہ اصل برائی امریکا یا اس کا استعماری نظام سرمایہ داریت نہیں بلکہ اسرائیل یا یہود ہیں۔ اگر ان کی طاقت کا خاتمہ کر دیا جائے تو مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ دوبارہ بحال کر لیں گے۔

مسلمان پر اللہ نے یہ لازم کیا ہے کہ وہ دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کریں، اس عمل کی انجام دہی کیلئے ضروری ہے کہ ہم دنیا کی سیاست کو سمجھیں ،طاقت کے مراکز اور مسائل کی جڑ کی صحیح نشاندہی کریں۔ اگر ہم نے اپنے دشمن کا صحیح تعین نہ کیا تو ہماری توانائی غلط ہدف پر ضائع ہو جائے گی اور حقیقی دشمن مزید طاقتور ہو جائے گا۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ سپر پاور اس ملک کو کہا جاتا ہے جس کی مرضی کے مطابق دنیا کے تمام یا بیشتر معاملات چلتے ہوں۔ اس وقت امریکا کو دنیا کی واحد سپر پاور اس لیے کہا جاتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی معاملے میں اس کی مرضی کو چیلنج کرنے والی کوئی دوسری طاقت موجود نہیں ہے۔ امریکا کی معیشت دنیا کی معیشت کا 17 فیصد ہے۔ امریکا کا دفاعی بجٹ روس چین، برطانیہ اور فرانس کے کل دفاعی بجٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح اسرائیل جو کہ سپر پاور نہیں اپنا تحفظ امریکی فوجی اور سیاسی مدد کے بغیر کر نہیں سکتا، جس کی معیشت ہر سال امریکی امداد کی محتاج ہو وہ کس طرح امریکا کو اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور کر سکتا ہے؟ یا پھر یہ کہ اسرائیل کی طاقت کے تمام قصے بے بنیاد ہیں۔

عموعی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ امریکا کی مشرق وسطیٰ سے متعلق پالیسی اسرائیل کی مرضی کے تابع ہوتی ہے۔ امریکا مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کو مضبوط کرنے یا اپنے مفادات حاصل کرنے کیلئے فوجی بغاوتوں اور آمر حکمرانوں کی حمایت کرتا ہے اور کبھی جمہوری قوتوں کی، کسی ملک کے خلاف پابندیاں لگاتا ہے تو کسی ملک کو امداد دیتا ہے، کبھی اقوام متحدہ اور بین الاقوامی قوانین نافذ کروانے کیلئے سیاسی اور فوجی اثر ورسوخ استعمال کرتا ہے تو کبھی اقوام متحدہ اور بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے، اب امریکا کے ان اعمال کا یہ جواز پیش کرنا کہ ایسا وہ صرف اور صرف اسرائیل کے دباؤ کی وجہ سے کرتا ہے، غلط ہو گا۔ ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ امریکا افریقی ممالک لاطینی امریکا اور مشرق بعید میں بھی اپنے مفادات کے حصول کیلئے ایسے ہی تمام اقدامات اٹھاتا ہے جیسا کہ وہ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں کرتا ہے۔ اگر امریکا مشرق وسطیٰ کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی ایسے ہی اقدامات کرتا ہے جہاں کوئی اسرائیلی مفاد نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکا اتنی طاقت رکھتا ہے کہ وہ اپنی من مانی مرضی سے پالیسیاں بناتا ہے چاہے جن سے دوسرے اتفاق نہ کرتے ہوں۔

اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ امریکا کئی بین الاقوامی امور میں جن کا اسرائیل کی سلامتی یا مفادات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، پوری دنیا کی رائے کی مخالفت کرتا ہے چاہے اس وجہ سے اس کو پوری دنیا میں شدید تنقید کا نشانہ ہی کیوں نہ بننا پڑے۔ پوری دنیا نے زیرِ زمین بارودی سرنگوں کے خاتمے بین الاقوامی عدالت برائے جنگی جرائم کے قیام اور دنیا میں بڑھتے ہوئے درجہ حرارت کو روکنے کیلئے ان پر دستخط کیے لیکن امریکا نے ان معاہدوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس تجزیے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ امریکا مشرقِ وسطیٰ میں بھی ایسے اقدامات اس لیے کرتا ہے کیونکہ بنیادی طور پر یہ اس کے مفاد میں ہوتے ہیں نہ کہ اس وجہ سے کہ اس پر اسرائیل کا کوئی دباؤ ہوتا ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ امریکا میں موجود تمام یہودی اسرائیل کی حمایت میں ایک ہو کر امریکا پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ یہ تصور معلومات کی کمی کا نتیجہ ہے جہاں امریکا میں یہودیوں کی ایک بڑی تنظیم "امریکا اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی" اور اس سے منسلک کئی درجنوں ایسی یہودی تنظیمیں ہیں، ان میں (American،s fo Peace Now, Israel Policy Forum,Brit Tzedek V،shadom) ایسی معروف تنظیمیں ہیں جو امریکی کانگرس پر اسرائیل کے حق میں پالیسیاں بنانے کیلئے دباؤ ڈالتی ہیں جو بظاہر اسرائیل کے وجود کے خلاف تو نہیں ہیں لیکن اسرائیل کی یہودی آبادکاروں کے حوالے سے پالیسی، نئے علاقوں پر قبضہ کرنے، دیوار کھڑی کرنے اور امریکا کی اسرائیل کی ہر حال میں حمایت کی شدید مخالفت بھی کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کانگریس کے اراکین کی بہت بڑی اکثریت کو اپنے حلقوں سے جیتنے کیلئے نہ تو یہودی ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی ان کے پیسوں کی۔

ایسے تمام اراکین کانگرس جو کہ اسرائیلی پالیسیوں کی مکمل حمایت کرتے ہیں ان کا تعلق ان علاقوں سے ہوتا ہے جو ان کے محفوظ ترین حلقے ہوتے ہیں اور وہ وہاں سے کئی دہائیوں سے جیتتے آرہے ہوتے ہیں مثلاً امریکی اسپیکر کانگریس نینسی پلوسی جو کہ اسرائیل کی کھل کر حمایت کرتی تھی، ہر دفعہ 80 فیصد سے زائد ووٹ لے کر منتخب ہو جاتی تھیں۔ یہ کہنا کہ یہودی لابی بہت مالدار ہے اور پیسے استعمال کر کے امریکی اراکین کانگرس پر دباؤ ڈالتے ہیں ،بالکل غلط مفروضہ ہے پیسوں کے لحاظ سے سب سے طاقتور لابی امریکا میں دفاعی یا اسلحہ بنانے والے اداروں، تیل کی کمپنیوں اور ادویات بنانے والے اداروں کی ہے صرف "اے آئی پی اے سی" اور "لاک ہیڈ مارٹن" اپنے اداروں کی لابنگ پر "نارتھ گرومین اور "جنرل الیکٹرک بوئنگ" کے مقابلے میں بالترتیب سات اور پانچ گنا زیادہ خرچ کرتے ہیں اسی طرح کی لابنگ کا خرچہ اور دوسرے ایسے کئی اداروں سے بہت کم ہے جو دفاعی دفاعی صنعت سے منسلک ہیں۔ امریکا میں یہودیوں کی آبادی 5 فیصد سے بھی کم ہے اس میں سے بھی جب ایک معقول تعداد اسرائیل کی ہر حال میں حمایت کی مخالفت کرتی ہو۔ یہودی ووٹ امریکا کے 99 فیصد سے زیادہ حلقوں میں کوئی اہمیت نہ رکھتے ہوں، دولت کی بنیاد پر یہودیوں سے زیادہ مضبوط لابیز موجود ہوں تو ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ دو یا تین فیصد یہودی امریکا انتظامیہ پر کتنا زور ڈال سکتے ہیں؟ ان تمام حقائق کے باوجود اگر ہم اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ امریکا اسرائیل کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتا تو میں یہاں کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں تاکہ یہ بھی خیال ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے۔

کسی بھی امریکی صدر نے جب یہ دیکھا کہ اسرائیل لابی کی طرف سے جس پالیسی کو اپنانے کیلئے دباؤ ڈالا جا رہا ہے وہ امریکی مفاد میں نہیں تو امریکی صدر نے ہمیشہ اسرائیل کو مجبور کر دیا کہ وہ امریکی پالیسی کو اختیار کرے۔ 1956ء میں جب اسرائیل برطانیہ اور فرانس نے نہر سوئز پر قبضہ کرنے کیلئے جنگ کا آغاز کیا تو اس وقت کے امریکی صدر آئزن ہاور نے اس جنگ پر شدید ناراضی کا اظہار کیا اور اسرائیل کو دھمکی دی کہ اگر اس نے مصری

علاقوں سے قبضہ ختم نہ کیا تو امریکا میں اسرائیلی بونڈز اور نجی طور پر اسرائیل بھجوائی جانے والی، رقوم پر ٹیکس کی چھوٹ ختم کر دی جائے گی۔ امریکی صدر آئزن ہاور نے اسرائیل کو یہ دھمکی اس وقت دی تھی جب صرف چند ہفتوں بعد امریکا میں صدارتی انتخابات ہونے جا رہے تھے۔ امریکی صدر آئزن ہاور کی اس دھمکی کے نتیجے میں اسرائیل نے چند مہینوں میں تمام مصری علاقے خالی کر دیئے۔

اسی طرح جب 1978ء میں جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا اور دریائے لیتانی تک آ گیا تو امریکی صدر جمی کارٹر نے اسرائیل کو امداد بند کرنے کی دھمکی دیکر مجبور کر دیا کہ وہ لبنان کی سرحد میں چند کلو میٹر تک محدود رہے۔ اس کے بعد اگلے امریکی صدر رونالڈ ریگن نے 1981ء میں "اے آئی پی اے سی" کے بھرپور دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے فوکس طیارے سعودی عرب کو بیچے۔ اس کے 10 سال بعد بش سنئیر نے "اے آئی پی اے سی" کے بھرپور دباؤ کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور اسرائیل کی ناک رگڑتے ہوئے 10 / ارب کا قرضہ جاری نہیں کیا جب تک مشرقِ وسطیٰ میں امریکی امن منصوبے کی راہ میں رکاوٹ "یزٹحاک شمیر" کو شکست نہیں ہو گئی کیونکہ یہ امریکی منصوبے میں رکاوٹ تھا۔

2004ء میں بش جونیئر نے اسرائیل کو نہ صرف چین سے اس معاہدے کو توڑنے پر مجبور کر دیا جس کے تحت اسرائیل نے طیاروں کو جدید بنایا تھا بلکہ اسرائیلی وزارت دفاع کے ڈائریکٹر جنرل "آموس یارون" کو بھی استعفیٰ دینا پڑا۔ اسی طرح اسرائیل پچھلے کئی سالوں سے امریکا کو ایران پر حملے کیلئے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن نہ صرف یہ کہ امریکا اس کی اس خواہش کو پورا نہیں کر رہا بلکہ امریکا نے اسرائیل کو بھی سختی سے ایران پر کسی بھی قسم کے حملے سے روک دیا ہے۔

ان تمام حقائق کے باوجود آخر امریکا کیوں اسرائیل کی اس قدر حمایت کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ امریکا ایک نظریاتی ریاست اور دنیا کی واحد سپر پاور ہے۔ امریکا جو بھی فیصلے کرتا ہے اپنی ضرورت اور مفادات کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کا علاقہ کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا کے تمام تجارتی بحری قافلے اس کے بحری علاقوں سے گزرتے ہیں، دنیا کے 66 فیصد سے زائد تیل و گیس کے ذخائر اس علاقے میں موجود ہیں اور ان تمام باتوں سے بڑھ کر یہ علاقے مسلم اکثریتی آبادی رکھتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے سابق برطانوی وزیر اعظم "ہنری کیمپ بل (بینر مین) کا ایک ہی تبصرہ کافی ہے:

"یہاں پر وہ لوگ (مسلمان) رہتے ہیں جو اس زبردست علاقے اور اس زمین میں موجود ذخائر کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ان کی زمین انسانی تہذیب اور مذاہب کا گہوارہ ہے، ان لوگوں کا عقیدہ زبان، تاریخ اور جذبات ایک سے ہیں۔ کوئی قدرتی رکاوٹ ان لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی اور اگر کبھی جدا ہو بھی جائیں تو یہ دوبارہ ایک مملکت میں ضم ہو جائیں گے۔ پھر یہ دنیا کی قسمت کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے اور یورپ کو باقی دنیا سے کاٹ دیں گے۔ ان وجوہات کو سنجیدگی سے لیا جائے تو ضروری ہے کہ ایک بیرونی اکائی کو اس قوم کے دل میں پیوست کر دیا جائے تاکہ اس قوم کی صلاحیتوں کو کبھی نہ ختم ہونے والی جنگوں میں ضائع کر دیا جائے۔ یہ بیرونی اکائی مغرب کیلئے ایک ایسے پلیٹ فارم کا کام بھی کرے گی جہاں سے وہ اپنے خفیہ منصوبوں کو انجام دے سکے گا"۔

یہ ہیں وہ بنیادی وجوہات جن کی بناپر پہلی جنگ عظیم کے بعد اس وقت کی سپر پاور برطانیہ نے مشرق وسطیٰ کے علاقے میں یہودی مملکت کی کوششوں کا آغاز کیااور پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد جب امریکا سپر پاور بن گیاتو اس کے مفاد کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اسرائیل کی ریاست قائم کی جائے اوراس کو مضبوط بنایا جائے۔ اسرائیلی ریاست کے ذریعے اس علاقے کو مسلسل جنگوں میں مبتلار کھا جاتا ہے جس سے ایک طرف امریکی اسلحے کی فیکٹریاں چلتی رہتی ہیں تو دوسری طرف ان ممالک کی کمزوری کے سبب امریکاان ممالک میں اپنے اثرورسوخ کو بڑھاتا اور برقرار رکھتا ہے۔

دنیا کی واحد سپر پاور امریکا ہے جو سرمایہ داریت کے نظریے کا علم بردار ہے۔ مسلمانوں اوراسلام کا حقیقی دشمن یہودی یا اسرئیلی ریاست نہیں بلکہ امریکا اور سرمایہ داریت کا نظام ہے، اسرائیل تو محض امریکی مفادات کو پورا کرنے والا ایک کھلاڑی ہے۔ اس کھلاڑی کی یہ جرأت اور طاقت نہیں ہوسکتی کہ وہ وقت کی واحد طاقت کو اپنے مفادات کے مطابق چلاسکے۔ اسرائیل کی اس حقیقت کو ایک اسرائیل استاد اورامن کیلئے کام کرنے والے کارکن نے اس طرح سے بیان کیاہے:

اسرائیل اپنے قبضوں کو اس لیے برقرار رکھ پاتا ہے کیونکہ وہ مغرب خصوصاًامریکا کے استعماری مفادات کو پورا کرنے کیلئے تیار رہتا ہے اور حقیقت میں اب اسرائیل امریکا کا ایک آزمودہ سپاہی بن چکا ہے۔ سابق امریکی وزیر خارجہ الیگزینڈر ہیگ نے اسرائیل کے متعلق بڑا اہم بیان دیا تھا: اسرائیل امریکا کا واحد سب سے بڑا بحری وہوائی بیڑہ ہے جو ڈوب نہیں سکتا۔

تاریخی اعتبار سے یہود اپنی سازشوں، مال واسباب اور سیاسی اثرورسوخ کے باوجود کبھی بھی اپنے سیاسی اہداف بغیر کسی بیرونی طاقت کی مدد کے بغیر حاصل نہیں کرسکے۔ پچھلے چودہ سو سال میں یہود عباسی خلافت، عثمانی خلافت، اسپین کی اموی حکومت، یورپ اورامریکا میں معاشی لحاظ سے ہمیشہ خوش حال رہے ہیں لیکن کبھی بھی کسی علاقے میں یہود کوئی قابل ذکر سیاسی مقام نہیں بناسکے۔ ریاست مدینہ میں بنو قریضہ، بنو ناصر، بنو قینو قاہ اور خیبر کے یہود اپنی معاشی سیاسی اور فوجی قوت کے باوجود کبھی بھی مدینہ کی ریاست کو براہ راست چیلنج نہیں کرسکے بلکہ ہمیشہ قریش مکہ کی مدد کا انتظار کرتے تھے اورآخر میں اپنی سازشوں اوروعدہ خلافیوں کی بناء پر ان کو بے دخل ہونا پڑا۔

یہود یورپ میں ہمیشہ دوسرے درجہ کے شہری رہے اور جب کسی حکمران نے ان پر ظلم وستم کرناچاہاتوان کی معاشی طاقت کبھی کام نہ آئی۔ جب عثمانی خلافت اپنے کمزورترین دور سے گزررہی تھی تو یہودیوں نے خلیفہ عبدالحمید دوئم کو اس بات کی پیش کش کی کہ اگر انہیں فلسطین کی زمین دے دی جائے تو خلافت عثمانہ کے تمام قرض وہ ادا کردیں گے لیکن اپنی معاشی قوت اور خلافت کی کمزوری کے باوجود یہود اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے ۔وہ قوم جو پچھلے ڈھائی ہزار سال سے اپنی تمام ترسازشی ذہنیت اور مال واسباب کے باوجود دربدر تھی، بالآخر برطانوی وزیر اعظم ہنری کیمپ بل کی وفات کے چالسیس سال بعد اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے برطانیہ عربوں کے سینے میں خنجر گھونپ کر فلسطین میں اسرائیل مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ خطے میں اسرائیل کا قیام اس وجہ سے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے منقسم رکھنے اور خطے میں اپنے مفادات کے مستقل حصول کیلئے یہ ضروری ہے کہ یہود کو ایک ریاست کی شکل میں طاقت دی جائے۔ اللہ سورہ آل عمران میں یہود کیلئے فرماتے ہیں۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَاثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿111-112﴾

یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے، پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی، کہیں اللہ کے ذمّہ یا انسانوں کے ذمّہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے، اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔

اللہ نے قوم یہود پر ہمیشہ ہمیشہ کی ذلت مسلط کر دی ہے۔ یہود سیاسی، معاشی اور فوجی لحاظ سے کبھی بھی مسلمانوں کے ہم پلہ نہیں رہے، آج اگر یہود مسلمانوں پر غالب ہیں تو صرف اپنے استعماری آقا امریکا کی قوت کی وجہ سے، ہم مسلمانوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ امریکا دانستہ اس نظریے کو فروغ دیتا ہے کہ یہودی لابی اس قدر طاقتور ہے کہ امریکا جیسی طاقت بھی اس کے آگے مجبور ہو جاتی ہے، اس بات کو فروغ دینے سے امریکا دو فائدے حاصل کرتا ہے۔

(1) وہ مسلمانوں کی امریکا سے نفرت کا رخ یہود کی طرف موڑ دیتا ہے۔

(۲) مسلمان اسرائیل کو اپنا اصل دشمن سمجھ کر صرف اسرائیلی قوت کو ختم کرنے کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں، اس طرح نہ تو امریکا ختم ہوتا ہے اور نہ ہی اسرائیل، امریکا غدار مسلم حکمرانوں کے ذریعے اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ اسرائیل کے مقابلے میں مسلمانوں کی فوجی قوت منتشر رہے اور پھر یہ مسلم افواج آپس میں بھی قومیت اور وطنیت کی کفریہ بنیادوں پر لڑتی رہیں، مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ جب تک وہ اپنی گردنوں پر مسلط غدار امریکی ایجنٹ حکمرانوں سے نجات حاصل نہیں کرتے امریکا اور اس کے سرمایہ داری نظام سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔

یہاں یہ بتانا بھی بہت ضروری ہے کہ یہاں امریکا اور اسرائیل حکومتوں کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح اسلامی حکومتیں مسلم عوام کی خواہشات کی علمبردار نہیں بلکہ اسی طرح مغرب اور امریکا کی حکومتیں بھی یہاں کے عوام کی مکمل خواہشات کی آئینہ دار نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیں کہ جب امریکا، برطانیہ اور ان کے دیگر اتحادیوں نے عراق پر حملہ کرنے کا اعلان کیا تو یورپ کی تاریخ کا سب سے بڑا "ملین افراد" کا مظاہرہ برطانیہ میں ہوا جہاں ہر مکتبہ فکر کے افراد نے اس حملے کی بھرپور مخالفت کی اور آج بھی آئے دن برطانیہ، یورپ اور امریکا میں ہزاروں افراد سڑکوں پر بے گناہ فلسطینیوں کے قتل عام روکنے کیلئے سراپا احتجاج ہیں لیکن یہاں بھی سب سے بڑی رکاوٹ اس سرمایہ داری نظام کی پیدا کردہ جمہوری نظام ہے جس کیلئے ضروری ہے کہ دنیا میں جاری اس ظلم و ستم کے خلاف جو ادراک پیدا ہو رہا ہے، اس کو فوری طور پر بہتر اور جاری جمہوری انداز میں حاصل کرنے کیلئے یہاں کی تمام سیاسی جماعتوں میں عملاً شمولیت اختیار کی جائے اور سیاسی سفر میں قانون ساز اداروں میں پہنچ کر حق و صداقت کیلئے قانون سازی میں اپنا کردار ادا کیا جائے۔ یقیناً ایک دن ضرور آئے گا کہ جب مظلوم کو انصاف ملے گا اور یہی افراد جو آج سڑک پر دنیا میں ہونے والے اسرائیلی، امریکی جارحیت کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کروا رہے ہیں، وہ آئندہ انتخابات میں اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے ہر امیدوار سے یہ وعدہ ضرور لیں گے کہ وہ پارلیمنٹ میں جا کر ایسی قانون سازی کریں جن کی بنیاد پر ہر ظالم کو لگام ڈالی جا سکے۔

یقیناً رسول اللہ ﷺ کی وہ پیش گوئی بھی پوری ہو گی جس کے تحت مسلمان بیت المقدس پر قابض یہودیوں کو چن چن کر جہنم رسید کریں گے اور وہ ان یہودیوں کے ظلم و ستم کا آخری دن ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسلمان یہودیوں سے لڑیں گے اور پھر ان کو قتل کریں گے یہاں تک کہ ایک

یہودی کسی پتھر یا درخت کے پیچھے پناہ لے گا تو وہ پتھر یا درخت پکارے گا، اے مسلم اے اللہ کے بندے یہ یہودی میرے پیچھے ہے، آؤ اور اسے قتل کرو۔

کچھ بھی تو نہیں رہے گا، کچھ بھی تو نہیں، بس نام رہے گا اللہ کا!

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

بروز ہفتہ 14 ربیع الثانی 1445ھ 28/ اکتوبر 2023ء

موت سے ڈر کیسا؟

کیا کوئی چیز، یا کوئی شخص ہمیں سوئچ آف کر سکتا ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کہیں، کوئی وجود محض ایک بٹن دبائے اور جو کچھ بھی دکھائی دے رہا ہے وہ ختم ہو جائے؟ بات بہت عجیب سی لگتی ہے، مگر ماہرین نے اس سوال پر صدیوں غور کیا ہے کہ انسان کی زندگی کیا ہے، حقیقت یا افسانہ۔ کیا ہم اس تصور پر یقین کر سکتے ہیں کہ ہماری دنیا، ہمارا وجود کوئی کمپیوٹر پروگرام ہے، ہولوگرام ہے یا کسی کا خواب ہے؟ کیا آپ کو کبھی کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ جو کچھ بھی ہم دیکھ رہے ہیں وہ کسی نہ کسی اعلیٰ ہستی کا تصور یا خواب ہے؟ کبھی کبھی حالات ایسا رخ اختیار کرتے ہیں کہ ہمیں کسی بھی امر پر یقین کرنے کی تحریک نہیں ملتی، اور جی چاہتا ہے کہ ہر چیز پر سے اپنا اعتقاد اٹھا دیں! فلسفیوں اور سائنسدانوں نے اس سوال پر غیر معمولی حد تک غور و خوض کیا ہے کہ ہمارے ارد گرد جو کچھ بھی ہے وہ سب کچھ اور خود ہمارا وجود بھی واقعی وجود رکھتا ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال سر اٹھائے کہ یہ تمام سوالات بے معنی ہیں، اس لیے کہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے، محسوس ہو رہا ہے وہی اصلی ہے، حقیقت ہے اور جو کچھ ہمارے حواس کی حدود میں نہیں وہ در حقیقت نہیں ہے۔ جو لوگ صرف حواس کی حد میں رہ کر بات کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ واقعی ہے۔ اس کے بارے میں یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ بیک وقت ہو بھی سکتا ہے، اور نہیں بھی ہو سکتا!

سب سے پہلے آپ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ جسے ہم حقیقت کہتے ہیں وہ کچھ اتنی زیادہ حقیقی نہیں! حقیقت کے مضافات میں ہم آپ کا استقبال کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فلسفہ اور نظریاتی طبعیات گلے ملتے ہیں، اور جہاں سائنس اور مذہب کسی حد تک اپنی بساط لپیٹ کر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ اپنے ذہن کی نشست پر اچھی طرح، جم کر بیٹھ جائیے، حفاظتی بیلٹ کس لیجیے، کیوں کہ جو کچھ بھی اب آپ کے سامنے آنے والا ہے وہ دماغ کی چولیں ہلا دینے والا ہے! یہ بھی ممکن ہے کہ آپ بہت پریشان ہو اٹھیں اور اپنے وجود اور کائنات کے بارے میں آپ نے جو تصورات یا عقائد قائم کر رکھے ہیں ان کے بارے میں آپ کا عزم متزلزل ہو جائے! جسے ہم حقیقت کی دنیا کہتے ہیں وہ اتنی حقیقی نہیں جتنی ہم سمجھتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم چند دائروں میں رہتے ہوئے سوچتے ہیں۔ جب آپ کسی بھی شے کو زیادہ قریب سے دیکھیں تو اس کی دراڑیں زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ کوئی اداکار سیٹ پر کھڑا ہو اور دیوار سے ڈر رہا ہو، مگر پھر اسے اندازہ ہو جائے کہ جسے وہ دیوار سمجھ رہا ہے وہ تو گتے کے ٹکڑے ہیں جنہیں دیوار کی شکل دے دی گئی ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ سب تو سائنس فکشن کی فلموں میں ہوتا ہے! آپ نے اگر "دی میٹرکس" دیکھی ہو تو اندازہ ہو گا کہ جو کچھ ہمیں اپنے ارد گرد دکھائی دے رہا ہے وہ اس حد تک موجود نہیں جس حد تک موجود محسوس ہو رہا ہے۔ "دی میٹرکس" میں یہی تصور پیش کیا گیا ہے کہ ہم کہنے کو تو موجود ہیں، مگر در حقیقت موجود نہیں ہیں اور ممکنہ طور پر ہماری حیثیت اس سوفٹ ویئر کی سی ہے جسے کسی کمپیوٹر پر چلایا جا رہا ہو، اور کمپیوٹر آف کرتے ہی وہ سوفٹ ویئر بھی آف ہو جائے! ہو سکتا ہے کہ ہم سے کہیں زیادہ ذہانت کی حامل کوئی نسل یہ کمپیوٹر گیم چلا رہی ہو، اور پھر وہ اس گیم سے بیزار ہو کر اسے سوئچ آف کر دے! یعنی آپ ابھی ہیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے نہیں ہیں! کہیں یہ سب کچھ پڑھ کر آپ پریشان تو نہیں ہو رہے؟ اگر ایسا ہے تو ذہنی طور پر الجھنے سے گریز کرتے ہوئے پڑھتے رہیے لیکن یاد رکھیے کہ آنے والی سطور میں آپ جو کچھ پڑھیں گے وہ زندگی کے بارے میں آپ کے نظریے کو شاید مکمل طور پر بدل کر رکھ دے! ہم "فائن ٹیوننگ والی کائنات؟" کی بات کرنے جا رہے ہیں۔

ہو سکتا ہے بہت سوں کو یہ بات بہت عجیب محسوس ہو مگر سچ تو یہ ہے کہ ہمیں قدم قدم پر محسوس اور غیر محسوس دونوں سطحوں پر، یہ گمان گزرتا ہے کہ ہماری کائنات اس مقام تک خود بخود نہیں پہنچی۔ کسی برتر وجود نے اِسے ہمارے لیے "فائن ٹیون" کیا ہے، حالات کو اس طرح تبدیل کیا ہے کہ روئے ارض پر کہکشاں میں یا پھر اس کائنات میں کہیں بھی زندگی کا وجود ممکن ہو سکا ہے۔ کیا آپ کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس کائنات کو فعال رکھنے والے طبعی قوانین کسی کے تیار کردہ ہیں؟ کیا ہر معاملے میں ناقابل یقین حد تک قطعیت اور موزونیت خود بخود پیدا ہو جایا کرتی ہے؟ ہم جس کائنات کا حصہ ہیں اس کے تمام طبعی معاملات انتہائی موزونیت کے حامل ہیں۔ کہیں بھی کوئی ایسی کھوٹ دکھائی نہیں دیتی جس کی موجودگی میں زندگی کے میلے کی رونق برقرار رہ سکتی ہو۔

اسکول میں آپ کو طبعیات کا مضمون شاید خشک ترین محسوس ہوا ہو۔ طبعیات کے قوانین کا مدار کسی نہ کسی معین حقیقت پر ہے۔ چند ایک امور معین ان کی عدم موجودگی کائنات کی تفہیم کو شدید مشکل بنا سکتی ہے۔ برقی مقناطیسی قوت، جو کڑکتی ہوئی بجلی اور کمپیوٹرز کی روح رواں ہے، طبعی ہیں۔ قوانین کے تابع ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے سے طے شدہ ان قوتوں کی وہ خاصیت اتنی کیوں ہے؟ یہ خاصیت کچھ کم یا زیادہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ برطانوی ہیئت داں فریڈ ہوئلے ان سائنسدانوں میں سے ہے، جنہوں نے پہلے پہل یہ دریافت کیا کہ کائنات میں جو بھی خاصیت پائی جاتی ہے وہ حادثاتی نوعیت کی نہیں۔ یعنی جو کچھ بھی معین حیثیت سے موجود ہے، وہ خود بخود معین نہیں ہو گیا بلکہ اسے اس مقام تک لایا گیا ہے! اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اگر اپنی موجودہ شکل سے ذرہ بھر بھی مختلف ہوتا تو کہکشائیں، ستارے، چاند، سورج، زمین کچھ بھی نہ ہوتا اور ہم بھی نہ ہوتے۔

ذرے (ایٹم) کے سینے میں چھپی ہوئی قوت کا اندازہ لگائیے۔ اگر یہ خفیف سی بھی زیادہ ہوتی تو کائنات کی تشکیل کے وقت ستاروں کے معرض وجود میں آنے کا عمل شاید اگلے ہی سیکنڈ میں ختم ہو جاتا کیونکہ ستارے اپنی ہی گرمی کے باعث پھٹ جاتے! ہمارا سورج بھی نہ ہوتا، اور یوں ہمارے ہونے کی راہ بھی ہموار نہ ہوئی ہوتی۔ اور اگر ذرات کے سینے میں قوت ذرا بھی کم ہوتی تو یہ مختلف گیسوں کے سالموں کو باہم متحد رکھنے میں کامیاب نہ ہوئے ہوتے۔ اس صورت میں ستارے اپنی توانائی سے محروم ہو جاتے اور ہمارے معرض وجود میں یا منصہ شہود پر آنے کی راہ بھی مسدود ہو جاتی۔

یہ تو ہوا ذرات کی ماہیت کا معاملہ۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں کوئی بھی شے ایک خاص تناسب کے بغیر دکھائی نہیں دیتی۔ برطانوی ہیئت داں سر مارٹن ریز کہتے ہیں ہمیں کائنات میں جابہ جا اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اسے ہمارے لیے "فائن ٹیون" کیا گیا ہے، یعنی حالات ساز گار بنائے گئے ہیں۔ کسی نے تمام امور کو ایک طے شدہ تناسب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہمارے ذہنوں کو ہلا دینے والا سوال یہ ہے کہ اگر کائنات میں کوئی بھی معاملہ ایک خاص تناسب اور عدل کے بغیر دکھائی نہیں دیتا، تو ایسا کیوں ہے؟ ہیئت دان اس امر پر متفق ہیں کہ یہ سب کچھ محض حسن اتفاق کا نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تو پھر کون ہے جس نے قوانین طے کیے، اصول مرتب کیے؟

سب سے پہلے تو اس تصور کو اپنائیے کہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے صرف وہی حقیقت نہیں ہے۔ آپ کہیں گے کہ کرسی ایک ٹھوس حقیقت ہے جس پر بیٹھ کر آپ یہ مضمون پڑھ رہے ہیں۔ اسی طور آپ یہ دلیل بھی پیش کر سکتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے کمپیوٹر کی اسکرین ایک حقیقت ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ ہر حقیقت کی پشت پر ایک اور یعنی حقیقی حقیقت موجود ہے جس کی موجودگی میں آپ کی اپنی حقیقت (جو آنکھوں کے سامنے ہے) محض ایک سراب کی سی ہے۔ آپ کسی بھی شے کی حقیقت تک کس طرح پہنچتے ہیں؟ ظاہر ہے اس کا تجزیہ کر کے! تجزیے سے مراد کسی بھی شے کے اجزا کا جائزہ

الگ الگ کر کے ان کا لینا، ان پر غور کرنا۔ فرض کیجیے آپ نے کسی بھی چیز کے ٹکڑے کیے تو اس کے سالموں تک پہنچے۔ سالموں کو چیرا تو ذرات تک پہنچے۔ اگر کسی ذرے کا دل چیر کر دیکھا تو اس میں مرکزی حصہ ملا جس کے گرد الیکٹران گردش کرتے ہوئے پائے گئے۔ اب اگر آپ ذرے کے مرکزی حصے کو چیر کر دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے، کہ وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب تک آپ نے کیا دیکھا اور کیا پایا؟ کچھ بھی نہیں! بات بہت حیرت انگیز ہے مگر حقیقت پر مبنی ہے کہ ہم جو کچھ بھی دیکھ رہے ہیں، حتمی تجزیے میں اس کی کوئی بھی حیثیت نہیں۔

سائنس دان کہتے ہیں کہ ایٹم کا مرکزی حصہ جن ریزوں پر مشتمل ہوتا ہے انہیں انگریزی میں "پارٹیکل" کہا جاتا ہے مگر یہ لفظ اس لئے استعمال ہو رہا ہے کہ اور کوئی موزوں لفظ میسر ہی نہیں۔ "پارٹیکل" کا لفظ سنتے ہی ہمارے ذہن میں گیند کا تصور ابھرتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کوانٹم فزکس میں گیند جیسی کسی بھی ایسی ٹھوس چیز کا کوئی تصور موجود نہیں جسے آپ دیکھ اور چھو سکیں۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ ایٹم کا مرکزی حصہ جن ریزوں پر مشتمل ہوتا ہے انہیں انگریزی میں "فوٹون، الیکٹرون اور کوارکس" کہا جاتا ہے۔ یہ اتنے عجیب و غریب اور ہمارے دائرہ علم میں موجود کسی بھی دوسری شے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کیلئے ہمارے پاس کوئی موزوں لفظ ہے ہی نہیں۔ پارٹیکلز بیک وقت دو مقامات پر ہو سکتے ہیں اور وہ لہر کی صورت سفر کرنے کے علاوہ مادے کے جز کے طور پر بھی اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس کا مدار اس بات پر ہے کہ آپ ان کے ساتھ کس نوعیت کا تفاعل چاہتے ہیں۔ پارٹیکلز اچانک معرض وجود میں آ سکتے ہیں، اور پھر اتنی ہی تیزی کے ساتھ غائب بھی ہو سکتے ہیں۔ پارٹیکلز کو گرفت میں لے پانا انتہائی دشوار ہے اور اب تک ناممکن ثابت ہوا ہے۔ بیک وقت یہ بتانا ممکن نہیں کہ اس وقت کوئی پارٹیکل کہاں ہے اور اس کی حرکت کی رفتار کیا ہے۔

مگر خیر، پارٹیکل بھی تو کوئی نہ کوئی چیز ہی ہے! یہی سبب ہے کہ طبیعات داں "سٹرنگ تھیوری" کی طرف لپک رہے ہیں۔ اس نظریے کی رو سے مادے کا تصور موہوم سے دائروں کے تصور سے وابستہ ہے۔ یہ دائرے ارتعاش پیدا کرتے ہیں مگر ان کا پیدا کیا ہوا ارتعاش ہماری معلومات کے دائرے میں کسی بھی دوسری چیز کے پیدا کردہ ارتعاش سے یکسر مختلف ہوتا ہے، کیوں یہ ارتعاش دس مختلف سمتوں میں ہوتا ہے! ہم جنھیں پارٹیکلز کہتے ہیں وہ موجود دراصل ان دائروں یعنی سٹرنگ کے ارتعاش سے پیدا شدہ موسیقی کے سوا کچھ نہیں! یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ مادہ دراصل کسی اور شے کا اظہار یا کسی عمل کا نتیجہ ہے!

سائنس ایک قسم کی ایکٹیوٹی نہیں ہے۔ اس کو کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ (پارٹیکل فزکس بمقابلہ نیوروبائیولوجی) یا اس سے ہے کہ سسٹم کا اپنا تعلق ہسٹری سے کتنا ہے (کیمسٹری بمقابلہ آسٹرونومی)۔ جتنا سادہ آبجیکٹ ہو گا، اتنے زیادہ پریسائز جوابات ہوں گے۔ جتنا پیچیدہ ہو گا، اتنی زیادہ شماریاتی اپروکسیمیشن پر انحصار کرنا ہو گا۔ اس کا تعلق اس بات سے نہیں کہ کس شعبے میں سائنسدان زیادہ قابل ہیں یا کس کے پاس طریقہ بہتر ہے بلکہ اس سے ہے کہ ہمارے تصوراتی اوزار اور پیمائشی آلات ہماری کتنی مدد کر سکتے ہیں۔ سخت اور نرم سائنس کا ایک سپیکٹرم ہے، جو یہ نہیں بتاتا کہ سائنس کتنی اچھی مطالعہ موضوع کی اپنی نیچر کیا ہے لیکن ہر قسم کی سائنسی انکوائری میں مشترک چیز ایسی تھیوری اور ہائپوتھیسس کی تعمیر ہے جس کی ہے بلکہ یہ کہ زیرِ تصدیق ایمپیریکل طریقے سے کی جا سکے۔

تین عناصر ہیں جو سائنس کو دیگر انسانی ایکٹیوٹی سے جدا کرتے ہیں۔ نیچرل ازم، تھیوری اور ایمپیریسزم۔ سائنس کا تعلق "نیچرل فینامینا" اور پراسس سے ہے۔ اس کی اپنی تعریف کے مطابق اس کا سپرنیچرل ازم سے کچھ لینا دینا نہیں۔ سپرنیچرل کی موجودگی یا عدم موجودگی کو ثابت کرنے کی کوشش

سائنسی نہیں ہے کیونکہ سائنس کے ذریعے یہ ممکن ہی نہیں۔ اس بارے میں کسی بھی رائے کا تعلق سائنس سے نہیں، خواہ ایسا کام سائنسدان ہی کیوں نہ کریں۔ نیچرل عوامل کی وجہ نیچرل ہے۔ یہ فقرہ سائنس کی مرکزی بنیاد ہے۔ (اور یہ وجہ ہے کہ کری ایشن ازم کا خیال اصولی طور پر بھی سائنس نہیں ہو سکتا)۔

یہاں انفلیشن تھیوری کا ذکر بھی ضروری ہو گیا ہے۔ یہ تھیوری وہ نظریہ ہے جس کے مطابق کائنات کی ابتدا اچانک پھیلاؤ سے ہوئی اور اب سائنسی تحقیق کے مطابق یہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔ گزشتہ صدی کے دوسرے عشرے میں ہبل دوربین نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔ کائنات کے اس مسلسل پھیلاؤ میں جو بات نہائت اہم ہے کہ یہ پھیلاؤ ہر طرف یکساں ہے۔ اس پھیلاؤ کو سمجھانے کیلئے جدید فلکیات کے اساتذہ ایک ایسے غبارے کی مثال دیتے ہیں جس پر بہت سے رنگارنگ نقاط اور دائرے نقش ہیں۔ آپ اس غبارے میں جوں جوں ہوا بھرتے ہیں اس دائرے ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جائیں گے لیکن اس پھیلاؤ میں جو بات نمایاں رہے گی، وہ ان کے آپس کے فاصلوں پر موجود نقطے اور دائرے اپنے مخصوص فاصلوں کا تناسب برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے دور بھاگیں گے اور اس وجہ سے کائنات کے کا تناسب ہے۔ وہ نقاط اور پھیلاؤ میں موجود تناسب سائنسدانوں کیلئے بے پناہ توجہ کا باعث بن گیا۔ اس یکساں پھیلاؤ کی نیچر کو سمجھتے سمجھتے ماہرین طبیعات ایک عجیب و غریب نتیجہ پر پہنچے کہ کوئی برتر ایسی طاقت ہے جو کائنات کے اس یکساں پھیلاؤ کو ایک قاعدے کے ساتھ کسی غبارے کی طرح باہر کی طرف مسلسل تیزی کے ساتھ بڑھا رہی ہے۔

فطرت کا ایک عجب مظہر ہے کہ مادے کا انتہائی باریک پیمانے پر ملاحظہ کیا جائے تو وہاں کوئی مادہ موجود نہیں، وہاں فقط توانائی کی لہریں ہیں۔ توانائی کی ان لہروں کو جدید تھیوریٹکل فزکس میں سٹرنگز کہا جانے لگا۔ یہ سٹرنگ اتنی باریک چیز ہے کہ اگر ہم ایک ایٹم کو اپنے نظام شمسی جتنا بڑا کر لیں تو ایک سٹرنگ ہماری زمین پر موجود کسی درخت کے برابر ہو گی۔ اتنی چھوٹی چیز کے تصور کا امکان سرِ دست صرف ریاضی کیلئے ہی ممکن ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ کائنات کی پیدائش "بگ بینگ" سے ہوئی اور یہ بگ بینگ کس طرح پیش آیا؟ سب سے پہلے ایک سٹرنگ جتنا باریک ذرہ نجانے کیسے "انفلیٹ" ہو گیا۔ ڈکشنری میں لفظ "انفلیٹ" کا مطلب ہے کسی غبارے یا ٹائر یا ٹیوب کا ہوا یا گیس سے اس طرح بھر جانا کہ وہ پھول کر کپا ہو جائے۔ چنانچہ ہم بجائے یوں کہنے کے کہ وہ چھوٹا سا ذرہ اچانک پھٹ گیا، انفلیشن تھیوری کی وجہ سے یوں کہیں گے کہ وہ چھوٹا سا ذرہ اچانک پھٹ کر بگ بینگ کہلایا۔ قرآن میں دی ہوئی یہ اطلاع "وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے (انعام:101)" دورِ حاضر کی سائنس کی دریافتوں کے عین مطابق ہے۔ آج کی فلکی طبیعیات اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ پوری کائنات اپنی پوری مادی وسعتوں سمیت ایک عظیم دھماکے کے نتیجے میں ظہور ہوئی تھی۔ اس واقعے کو بگ بینگ یا "انفجارِ عظیم" کہا جاتا ہے۔

اب ایک بار پھر کائنات کی طرف آیئے۔ ہمارے سروں پر جو ستارے جگمگا رہے ہیں اور ہم جس خلائے بسیط میں پائے جاتے ہیں وہی کائنات ہے۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ کائنات سے پرے کیا ہے؟ ماہرین کے خیال میں یہ تصور اب تک ممکن نہیں۔ ایک لمحہ وہ بھی تھا جب کچھ بھی نہ تھا اور پھر بقول ڈارون تھیوری یا ایسے کئی اور سائنسدانوں کے مطابق ایک دھماکا ہوا جسے بگ بینگ کہتے ہیں۔ اس کے بعد کائنات کے پھیلنے کا عمل شروع

ہوا جو اب تک جاری ہے۔ یہ توسیع "لاشیئیت" کے سمندر میں موجزن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کائنات سے پرے ہے (یا ہو سکتا ہے) اس کیلئے ہم "لاشیئیت" کا لفظ بھی استعمال نہیں کر سکتے۔ ایک تصور یہ ہے کہ دو بڑے بلبلے ٹکرائے تو ہماری کائنات معرض وجود میں آئی۔ ماہرین اب اس تصور کو اہمیت دے رہے ہیں کہ کائنات ایک نہیں بلکہ کئی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ہماری کائنات میں کئی کائناتیں گڈ مڈ کر دی گئی ہوں! اب ایک نظریہ یہ بھی سامنے آیا ہے کہ جسے ہم "مکانیت" کہتے ہیں ممکن ہے کہ وہ صرف نظر کا دھوکا ہو۔ ممکن ہے کہ چند جہتیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر مکانیت کا تصوراتی دھوکا پیدا کر رہی ہوں اور کسی کائنات کو معرض وجود میں لانا کون سا بڑا مسئلہ ہے؟ ماہرین کہتے ہیں غیر معمولی مقدار میں توانائی لے کر بہت چھوٹی سی جگہ میں اسے جمع کیجیے، ایک بڑا دھماکا ہو گا (جو ایک اور بگ بینگ کہلائے گا) اور یوں ایک نئی کائنات معرض وجود میں آجائے گی! مگر یہ سب کچھ آپ دیکھ نہیں پائیں گے، کیوں کہ اس کے نتیجے میں جو بلبلہ پیدا ہو گا وہ ہمارے بلبلے (کائنات) سے بہت مختلف ہو گا۔

اگر آپ الجھ رہے ہیں تو کوئی بات نہیں، ٹھہر جایئے اور ایک دوسرے پہلو سے معاملات کا جائزہ لیجیے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہماری کائنات کسی اور ذہین تر تہذیب کی تیار کردہ ہو؟ اس پہلو پر غور کرنے سے اندازہ ہو سکے گا کہ ہماری کائنات اس قدر ساز گار کیوں ہے۔ ہم جس مکانیت میں ہیں وہ مکانیت ہے ہی نہیں۔ ہم جس مادے سے بنے ہیں اس کا کوئی وجود نہیں۔ جو کچھ ہے وہ محض نظر کا دھوکا معلوم ہوتا ہے مگر اس کے باوجود آپ کو ایک بات سے ضرور اطمینان ہوتا ہو گا کہ آپ کا وجود تو اصلی ہے! آپ چاہیں تو ایسا سمجھ سکتے ہیں۔ لوگ آپ کو چھو سکتے ہیں، آپ کی بات سن سکتے ہیں، آپ کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا وجود ہے۔ مگر ٹھہریے، زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔

آئینے میں اپنا چہرہ دیکھیے اور دیر تک دیکھتے رہیے۔ آخر کار آپ کو ایسا محسوس ہونے لگے گا کہ آئینے میں جو چہرہ ہے وہ آپ کا ہی نہیں، کسی اور کا بھی ہے۔ آپ کو اپنے آپ کسی اور کے وجود کا گمان ہونے لگے گا۔ یہی معاملہ شعور کا بھی ہے۔ ہمارا ذاتی وجود ہمارے ذہن کی پیداوار ہے۔ دماغ ہمیں جو کچھ دکھاتا اوسناتا ہے وہی کچھ ہمارے شعور کا حصہ بنتا جاتا ہے۔ شعور "پانچ حواس" اور ان کے ذریعے آنے والی معلومات کے تجزیے سے مل کر بنا ہے۔ شعور خواہ کچھ ہو، درحقیقت اس کا وجود دماغ کا مرہون منت ہے۔ یہ معاملہ بھی بہت حد تک سوفٹ ویئر جیسا ہی ہے۔ یعنی کمپیوٹر کی اسکرین پر جو کچھ دکھائی دے رہا ہے وہ ہے تو سہی مگر نہیں ہے، کیوں کہ سب کچھ "ورچوئل" ہے یعنی حقیقت نہیں بلکہ حقیقت نما ہے۔ ہم میں سے بیشتر کا عقیدہ ہے کہ روح نام کی کوئی شے بھی ہے۔ مگر طبیعیات دان اور ہیئت دان کہتے ہیں کہ ایسا کچھ نہیں۔ ہم جو کچھ کہتے، کرتے یا محسوس کرتے ہیں وہ صرف ذہن کی کارفرمائی ہے، اور کچھ بھی نہیں! اور تجربات سے یہ بات کسی حد تک ثابت بھی کی جا چکی ہے۔

دماغ کو اگر چھیڑا جائے تو خیالات برہم ہو جاتے ہیں، اور پھر ہمارا وجود اجنبی سا محسوس ہونے لگتا ہے اور یہ کیفیت برقرار رہے تو ہمیں اپنا وجود اپنے ہی جسم سے باہر محسوس ہونے لگتا ہے۔ اِسی کو "جسم کے تجربے سے باہر" کہتے ہیں۔ کچھ لوگ اِسے موت کی چوکھٹ تک ہو آنا بھی کہتے ہیں۔ موت کا مزا چکھنے کیلئے مرنا ضروری نہیں۔ لیبارٹری میں ایک ایسا ہیلمٹ سر پر لگایئے جس میں گھومنے والے مقناطیس لگے ہوں۔ جب یہ مقناطیس حرکت کرتے ہیں تو ذہن کی فعالیت میں اچھا خاصا خلل واقع ہوتا ہے۔ آپ کو یہ محسوس ہونے لگے گا جیسے آپ اپنے جسم کے دائرے میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف احساس ہے، ورنہ آپ تو اپنے جسم کی حدود میں ہی رہتے ہیں! اور اس تجربے سے گزرنے کیلئے مقناطیس والا ہیلمٹ بھی درکار نہیں۔ جہاں زمین کی کشش کم ہو اس مقام پر بھی یہ تجربہ کیا جا سکتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ سب کچھ اس مقام پر بھی ہوتا ہے جہاں آکسیجن کا تناسب کم ہو۔

ذہن کی مخصوص کیفیت آپ کو جسم کی حد سے باہر موجود ہونے کا احساس دلا سکتی ہے۔ مراقبے یا عمیق عبادت کے دوران بھی ایسا ممکن ہے۔ جو لوگ پورے خشوع و خضوع سے حج کا فریضہ ادا کرتے ہیں انہیں بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوا کرتا ہے۔ ذہن سے باہر کی اس کیفیت میں آپ کو ایسا محسوس ہو سکتا ہے جیسے آپ سے کسی نے ملاقات کی ہے۔ مثلاً اگر آپ مذہبی اعتقادات رکھتے ہیں تو آپ کسی عظیم مذہبی ہستی سے ملاقات محسوس کریں گے۔ اگر آپ بھوتوں پر یقین رکھتے ہیں تو محسوس ہو گا کہ کسی مردہ شخص کی روح آپ سے ملنے آئی ہے۔ کچھ لوگوں کا ذہن اس کیفیت میں انہیں یہ یقین دلاتا ہے کہ ان سے ملنے کوئی غیر ارضی مخلوق آئی ہے! حقیقت یہ ہے کہ آپ کا ذہن آپ کو جو کچھ دکھا رہا ہوتا ہے، وہی کچھ آپ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

لاکھ کوشش کے باوجود سائنسدان اور فلسفی اب تک حقیقت کی حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہے ہیں۔ وقت، جہتوں، خلا اور دوسری بہت سی "حقیقتیں" کسی بھی وقت فنا ہو سکتی ہیں، وجود سے محروم ہو سکتی ہیں۔ کائنات میں کب کیا ہو جائے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ جو چند سانسیں ہیں، غنیمت ہیں! آپ سوچیں گے کہ جب کسی بھی شے کا کوئی حقیقی وجود ہے ہی نہیں، اور اگر سب کچھ دھوکا یا سراب ہے تو پھر موت یا معدومیت سے کیا ڈرنا؟ ہمارا خواب اچانک ختم ہو جائے تو خواب میں آنے والے ہم سے ناراض ہوتے ہیں؟ نہیں! اگر ہم کمپیوٹر گیم روک دیں تو اس کے کردار ہم سے خفا ہوتے ہیں؟ نہیں، نا! بس تو پھر ہم بھی اگر کسی کا خواب، یا کوئی کمپیوٹر گیم ہیں تو سوئچ آف کیے جانے پر کیوں ناراض ہوں گے؟ مختصراً یہ کہ:

ساقی مرے بھی دل کی طرف ٹک نگاہ کر
لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا
ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
چل سکے بس جب تلک ساغر چلے

ہم کیوں قبر کی نعمتوں کے بارے میں بات نہیں کرتے، ہم یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ سب سے بہترین دن ہو گا جب ہم اپنے رب سے ملیں گے۔ ہمیں یہ کیوں نہیں بتایا جاتا کہ جب ہم اس دنیا سے کوچ کریں گے تو ہم ارحم الراحمین کی لامحدود اور بے مثال رحمت اور محبت کے سائے میں ہوں گے، وہ رحمان جو ماں سے بھی 70 گنا زیادہ مہربان ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک جانور کو دیکھا جو اپنا پاؤں اپنے بچے پر رکھنے سے بچا رہی تھی، تو آپ نے صحابہ سے فرمایا "بے شک ہمارا رب ہم پر اس ماں سے کہیں زیادہ مہربان ہے۔ کیوں ہمیشہ، صرف عذاب قبر کی باتیں ہو رہی ہیں، کیوں ہمیں موت سے ڈرایا جا رہا ہے، یہاں تک کہ ہمیں، معاذ اللہ، پختہ یقین ہو گیا کہ ہمارا رب ہمیں مرتے ہی ایسا عذاب دے گا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہم کیوں اس بات پر مصر ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صرف عذاب ہی دے گا، ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہمارا رب ہم پر رحم کرے گا۔ ہم یہ کیوں نہیں کہتے کہ جب قبر میں مومن صالح سے منکر نکیر کے سوال جواب ہو جائیں گے تو ہمارا رب کہے گا "میرے بندے نے سچ کہا، اس کیلئے جنت کا بچھونا بچھاؤ، اس کو جنت کے کپڑے پہناؤ اور جنت کی طرف سے اس کیلئے دروازہ کھول دو اور اس کو عزت کے ساتھ رکھو۔ پھر وہ اپنا مقام جنت میں دیکھے گا تو اللہ سے گڑگڑا کر دعا کرے گا: پروردگار قیامت برپا کر تاکہ میں اطمینان سے جنت چلا جاؤں۔ (احمد، ابو داؤد)

ہم یہ بات کیوں نہیں بتاتے کہ ہمارا عمل صالح ہم سے الگ نہ ہو گا اور قبر میں ہمارا مونس و غمخوار ہو گا۔ جب کوئی نیک آدمی وفات پا جاتا ہے تو اس کے تمام رشتہ دار جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، اس کی طرف دوڑیں گے اور سلام کریں گے، خیر مقدم کریں گے۔ اس ملاقات کے بارے میں نبی اکرم

ﷺ نے فرمایا کہ "یہ ملاقات اس سے کہیں زیادہ خوشی کی ہوگی جب تم دنیا میں اپنے کسی عزیز سے طویل جدائی کے بعد ملتے ہو اور وہ اس سے دنیا کے لوگوں کے بارے میں پوچھیں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا اس کو آرام کرنے دو، یہ دنیا کے غموں سے آیا ہے۔ (صحیح الترغیب لالبانی)
موت دنیا کے غموں اور تکلیفوں سے راحت کا ذریعہ ہے۔ صالحین کی موت در حقیقت ان کیلئے راحت ہے۔ اس لئے ہمیں دعا سکھائی گئی ہے۔ اللھم اجعل الموت راحة لنامن كل الشر (اے اللہ موت کو ہمارے لئے تمام شرور سے راحت کا ذریعہ بنادے)۔

ہم لوگوں کو یہ کیوں نہیں بتاتے کہ موت زندگی کا دوام ہے اور یہ حقیقی زندگی اور ہمیشہ کی نعمتوں کا دروازہ ہے۔ ہم یہ حقیقت کیوں چھپاتے ہیں کہ روح جسم میں قیدی ہے اور وہ موت کے ذریعے اس جیل سے آزاد ہو جاتی ہے اور عالم برزخ کی خوبصورت زندگی میں جہاں مکان وزمان کی کوئی قید نہیں ہے، رہنا شروع کر دیتی ہے۔ ہم کیوں موت کو رشتہ داروں سے جدائی، غم اور اندوہ کے طور پر پیش کرتے ہیں، کیوں نہیں ہم یہ سوچتے کہ یہ اپنے آباؤاجداد ،احباب اور نیک لوگوں سے ملاقات کا ذریعہ ہے۔ قبر سانپ کا منہ نہیں ہے کہ آدمی اس میں جائے گا اور سانپ اس کو چبا تا رہے گا بلکہ وہ تو حسین جنت اور حسیناؤں کا عروس ہے جو ہمارے انتظار میں ہیں۔ اللہ سے نیک امید رکھو اور اپنے اوپر خوف طاری مت کرو۔ ہم مسلمان ہیں، اس لئے ہم اللہ کی رحمت سے دور نہیں پھینک دیئے گئے ہیں۔

اللہ نے ہمیں عذاب کے خاطر پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کی رضا کے کام کون سے ہیں اور ناراضگی کے کون سے ہیں اور ہم دنیا میں آزاد ہیں جو چاہے کریں۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ خَیْرَ عُمْرِیْ اٰخِرَہٗ وَخَیْرَ عَمَلِیْ خَوَاتِیْمَہٗ وَخَیْرَ اَیَّامِیْ یَوْمَ اَلْقَاکَ فِیْہِ: اے میرے پروردگار! میری عمر کا بہترین حصہ اس کے آخری وقت کو بنایئے اور میرے آخری اعمال کو بہتر بنایئے اور میری زندگی کے دنوں میں سب سے اچھا اور بہترین دن وہ بنایئے جس دن میں آپ سے ملوں۔

علامہ اقبال نے مومن کی کیفیت بوقت وفات بہترین انداز میں بیان کی ہے۔
نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست
(مرد مومن کی تو نشانی یہی ہے کہ جب موت آتی ہے تو مسرت کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے)

بروز منگل 17 ربیع الثانی 1445ھ 31/ اکتوبر بر 2023ء

یہ دردناک مناظر

غزہ فلسطین پر ہونے والی اسرائیلی بربریت سے ہر ذی شعور دہل کر رہ گیا ہے۔ رباط مراکش میں درد مند مسلمانوں نے اس سلسلے میں مسلم امہ کے پچاس ملکوں کے سفرا اور دیگر کئی اسکالرز کو دعوت دی گئی۔ وہاں فلسطینی نژاد ڈاکٹر خالد کے خطاب نے دہلا کر رکھ دیا۔ جس دلسوزی کے ساتھ غزہ فلسطین پر اسرائیلی بربریت میں خونِ انسانی کی ارزانی بیان کی تمام سامعین کو پرنم اور غمزدہ کر دیا۔ یقیناعالمِ اسلام کے عوام بڑے کرب میں یہ دن گزار رہے ہیں لیکن امت مسلمہ کے بے حس حکمران امریکا کی غلامی کا طوق پہنے کانپتے ہوئے بیانات پر اکتفا کر رہے ہیں۔ برادرم خالد نے اس خونی جنگ کی خوفناک صورتحال اور اس قیامت صغریٰ کا ذکر جس انداز میں سنایا، وہ تو شائد کبھی بھی ضبط تحریر میں میں نہ لایا جاسکے لیکن اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں:

"اگر اللہ صرف چند لمحوں کیلئے آپ کی آنکھوں سے موجودہ پردہ ہٹا کر فلسطین کے آسمان کو دیکھنے کی سعادت عطا فرمادے تو آپ کو حیرت کن مناظر نظر آئیں گے۔ فرشتوں کے گروہ در گروہ خاص جشن میں شہدا کی روحوں کے ساتھ اللہ سے رجوع کیلئے دوڑ رہے ہیں۔ وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، آسمان عطر کی خوشبو سے بھرا ہوا ہے، یہ لوگ اس دنیا میں اپنا امتحان پورا کر چکے ہیں، اللہ نے انہیں جنت کیلئے چنا ہے۔ آپ دردناک تصویریں دیکھتے ہیں، ہے نہ؟ لیکن ہم سب کے آقا محمد ﷺ نے اللہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ شہید کو چٹکی کے سوا تکلیف نہیں ہوگی، لہذا جس طرح میں آپ کو ہاتھ سے چٹکی کاٹوں۔ مت ڈرو، میں جانتا ہوں کہ تم غمگین ہو، تو یاد رکھو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا..... اس دنیا میں کوئی نہیں مرتا اور دنیا میں واپس آنا چاہتا ہے سوائے شہید کے، شہید کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس کی خاطر مرے۔ ہزار بار، میں اب غزہ میں ایسی چیزیں دیکھ رہا ہوں کہ اگر تم انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو تم خوشی سے مر جاؤ گے اور اللہ سے غزہ میں شہید ہونے کی تمنا کرو گے۔ یہ شہدا زندہ اور ہمیشہ کیلئے ان کے پالنے والے کی طرف سے فراہم کیے گئے ہیں۔

انبیا کی پاک سرزمین جس کا میرے رب نے قرآن میں پوری سورہ اتار کر اس کا تقدس بیان فرمایا اور ہم سب کے آقا نبی اکرم ﷺ کو مسجد اقصی میں انبیا کی امامت عطا فرمائی، وہاں سے مجھے 31 سال قبل جبراً نکال دیا گیا لیکن میں ایک لمحے کیلئے بھی اپنے مادر وطن غزہ فلسطین کو اس لئے نہیں بھول پایا بلکہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرے خاندان کے سب ہی افراد شہید ہو گئے بلکہ ہر شہید ہونے والا میرا ہی عزیز ہے اور میں وہاں نہ ہونے کی وجہ سے اس سعادت سے محروم ہو گیا ہوں لیکن میں آپ سب کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں ان سے جلد ملنے کی خواہش کی تمنا لئے ہر روز اپنے رب سے مناجات کرتا ہوں۔

آپ سے مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ ہمارے شہدا کی نماز جنازہ اب آپ پر واجب نہیں کیونکہ نماز جنازہ زندہ افراد پڑھتے ہیں جس کیلئے ہم ابھی زندہ ہیں، باقی امت مسلمہ تو کب کی مر چکی ہے۔ ویسے بھی تمام مسلمانوں پر دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں لیکن ہم کئی سال سے روزانہ چھ نمازیں پڑھ رہے ہیں یعنی ہر روز نماز جنازہ بھی ادا کرتے ہیں۔ ہمیں آپ کی طرف سے خوراک اور دیگر اشیا کی مدد کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ ہم گداگر نہیں ہیں۔ ہمارے رب کا وعدہ ہے کہ شہدا زندہ ہیں اور میں انہیں رزق مہیا کرتا ہوں۔

آپ میڈیا پر اسرائیل کی بمباری کے ہولناک مناظر بھی دیکھ رہے ہیں کہ بمباری سے بچ جانے والے افراد فوری طور پر اپنے شہدا کے جنازوں اور ان عمارتوں کے ملبے پر کھڑے ہو کر صرف اللہ کی کبریائی کے نعرے لگا رہے ہیں اور ان میں شہید ہونے کی تمنا لئے وہ ننھے بچے بھی نظر آتے ہوں گے۔ کیا آپ نے کسی ایک کے منہ سے سنا کہ وہ کسی اور مسلمان ملک کے حکمران سے مدد طلب کر رہے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مردوں سے کچھ طلب کرنا میرے رب کی غیرت کے خلاف ہے، اس لئے ہم صرف اپنے رب سے مدد کے طلب گار ہیں۔

آج یہاں اس اجتماع میں درجنوں ممالک کے افراد بیٹھے ہیں اور میں اپنے کسی ایک لفظ پر بھی معذرت نہیں کروں گا لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ آج کی تقریب کا ایک ایک لفظ فرشتے ریکارڈ کر رہے ہیں اور ان کی گواہی ہی مجھے مطلوب ہے۔ اللہ نے صرف ایک مسلمان ملک پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے نوازا ہے اور جس دن پاکستان نے عملی طور پر یہ دہما کہ کیا تو میں نے سب سے پہلے برادرم سمیع اللہ ملک کو اپنی خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ نہ صرف مبارکباد دی تھی بلکہ ہم سب نے اللہ کے حضور سجدہ شکر بھی ادا کیا تھا لیکن دو دن قبل جماعت اسلامی کے طرف سے فلسطین سے یکجہتی کے جلوس پر اسلام آباد میں جس طرح لاٹھی چارج کیا گیا، یہ بھی ریکارڈ ہو گیا ہے لیکن مجھے پاکستانی قوم پر پورا یقین ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کھڑی ہے اور میں اس عمل کیلئے ان سب کا شکر گزار ہوں۔

برادرم خالد کے اس مختصر خطاب کے بعد قیامت کی سی خاموشی تھی، ہر کوئی ندامت کے مارے نظریں چرا رہا تھا لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ ہم اس دنیا میں سانس لے رہے ہیں جہاں عالمی میڈیا پر صہیونی خود کو مظلوم بنا کر پیش کر رہے ہیں اور اسرائیل کی طرف سے ہونے والے وحشیانہ مظالم کو دنیا سے اوجھل رکھا جا رہا ہے۔ اسرائیلی درندوں نے نہ صرف رہائشی بستیوں، ہسپتالوں اور ایمبولنس کے علاوہ اقوام متحدہ کی طرف سے قائم کئے گئے پناہ گزینوں کے کیمپوں پر بھی بمباری کر کے اب تک 9 ہزار سے زائد غزہ کے مکینوں کو شہید کر چکا ہے، جن میں 4 ہزار سے زائد بچے اور دو ہزار سے زائد خواتین شامل ہیں۔ پچھلی کئی دہائیوں سے یہاں کے باسیوں کو خوشیوں کا ایک لمحہ میسر نہیں آسکا اور مسلمانوں کے مذہبی تہوار ہوں یا کوئی دیگر موقع، اسرائیلی درندے بیدردی سے ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں۔ حالیہ اسرائیلی جارحیت کے موقع پر ہسپتالوں تک کو نہیں بخشا گیا اور سینکڑوں مریض جو علاج کیلئے یہاں موجود تھے، جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ فلسطینی محکمہ صحت کے حکام کے مطابق ان حملوں میں کم از کم 463 فلسطینی شہید ہو گئے ۔ فلسطین میں طبی عملے کے ایک اہلکار ایمن شہابی اور غزہ پولیس کے آپریشن روم کا کہنا ہے کہ اس بے رحمانہ اور انسانیت سوز حملے کے بعد ہسپتال بند ہو گیا ہے۔ اسرائیلی وزیر اعظم بنیامن نیتن یاہو کے حکم پر بیوریجی مہاجر کیمپ سمیت غزہ کے گلی کوچوں، اسکولوں پر زمین، سمندر اور فضا سے شدید قسم کی بمباری کی جا رہی ہے۔

اسرائیل نے غزہ پٹی جو سات میل چوڑی اور 26 میل لمبی ہے، ویاں روزانہ کی بنیاد پر 60 فضائی حملوں میں ہزاروں ٹن بارود کی برسات کر رہا ہے۔ حماس کے ٹی وی چینل، ریڈیو اور دیگر عمارتوں کو نشانہ بنا کر کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ فلسطینی حکام کے مطابق حالیہ اسرائیلی جارحیت کے نتیجے میں ٹھ ہزار سے زائد فلسطینی مرد وزن اور بچے شہید کر دیئے گئے۔ اب تک غزہ کی تمام عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن چکی ہیں گویا غزہ کا ملبہ لاشیں اگل رہا ہے اور ایک اندازے کے مطابق دو ہزار سے زائد افراد ان ملبے کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

ان قیامت خیز مناظر میں ہر آنے والا دن سب سے زیادہ خونریز دن ثابت ہو رہا ہے، جب وحشیانہ فضائی حملوں، گولہ باری اور فائرنگ سے بلا تمیز بے

گناہ بچے، مرد وزن کے پرخچے اڑا دیئے گئے ہیں۔ اسرائیلی خونی درندے فوجیوں کے روپ میں معصوم بچوں، خواتین، جوانوں اور بوڑھوں کو بلا تفریق خون میں نہلا رہے ہیں اور اب تو اجتماعی قبروں کے گڑھے کھود کر اندر زندہ انسانوں کو دھکا دیکر گولیوں کا نشانہ بنایا جارہا ہے لیکن انسانی حقوق کے علم برداروں کو گویا سانپ سونگھ گیا اور زبانیں گنگ ہو گئیں اور انتہائی بے حیائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی کو اسرائیل کو تنبیہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ وسطی غزہ میں اسپتال پر بھی گولہ باری کرنے سے گریز نہیں کیا گیا۔ جیٹ طیارے شہری آبادیوں کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر رہے ہیں، رہی سہی صہیونی سنائپر زنے پوری کر دی جو راہ چلتے ہر شہری پر گولیاں برسا کر موت بانٹ رہے ہیں۔ کئی گھروں میں لاشوں پر ماتم کرنے والے خود خون میں نہا گئے اور کوئی رونے والا بھی نہیں بچا۔ غزہ کے ہسپتالوں میں گنجائش اور ادویات ختم ہونے سے زخمیوں نے تڑپ تڑپ کی جان دے دی ہے اور آنے والے دنوں میں باقی ماندہ زخمی بھی شائد اللہ کی طرف لوٹ جائیں۔

اسرائیلی بمبار طیاروں نے وسطی غزہ میں واقع اقصیٰ ہسپتال کو نشانہ بنایا جس میں مریضوں سمیت 207 افراد شہید اور 183 زخمی ہو گئے۔ خان یونس میں گھر پر بمباری سے بیس افراد موقع پر شہید ہو گئے اور بعد ازاں 15 شدید زخمی بھی اپنے پیاروں سے جا ملے، رفاہ میں بھی فضائی حملے میں چار بچوں سمیت ایک ہی خاندان کے 10 / افراد اسرائیلی شقاوت کا شکار ہو گئے جبکہ شجائیہ میں گھروں کے ملبے سے اب تک 68 لاشیں بر آمد ہوئی ہیں اور ابھی اس ملبے میں کتنی باقی ہیں، کوئی نہیں جانتا ہم سب انسان ہیں، ہم میں سے بہت سے تو اپنی آنکھیں خشک پا رہے تھے مگر ایسے بھی ہیں جو فلسطینی بھائی، بہنوں اور بچوں کی المناک شہادتوں پر اپنے آنسوں پر قابو نہیں رکھ پا رہے تھے اور ان کا جی چاہتا تھا کہ کوئی ایسا طریقہ میسر ہو کہ وہ خود کو اس ظلم کے خلاف عملاً کچھ ایسا کر سکیں کہ وہ بھی اپنے پیاروں سے جا ملیں۔ اسرائیلی درندگی کے سب سے ہولناک مناظر غزہ کے علاقے شجائیہ میں نظر آئے جہاں کی تاریک گلیوں کے ہر گھر میں جابجا خون بکھرا ہوا ہے اور ابھی تک سیاہ دھواں کے نشانات بھی موجو ہیں۔ درخت گرے پڑے اور ہر قسم کے کھمبے ٹیڑھے میڑھے ہو کر اپنی تباہ حالی کی داستاں اپنی زباں میں پیش کر رہے ہیں۔ سڑکوں پر ملبے کے ڈھیر اور اسرائیلی بمباری سے سڑکوں پر جگہ جگہ گڑھے اسرائیل کے ظلم و ستم کا ماتم کر رہے ہیں۔

گولہ باری میں ذرا سا وقفہ ہوتے ہی ایک کے بعد دوسری، تیسری اور پھر لگاتار خون میں لت پت لاشیں نکالی جارہی ہیں۔ ایک گلی میں لاشیں ہی لاشیں ہیں لیکن ان کے اعضا بکھرے پڑے ہیں اور بعض لاشیں تو ناقابل شناخت ہیں، تاہم ان کے ہاتھوں کی مہندی سے شناخت کیا گیا کہ یہ کسی خاتون یا بچی کا لاشہ ہے۔ اگلی نکڑ پر میاں بیوی بھاگتے ہوئے جارہے تھے، باپ نے شیر خوار بچے کو سینے سے لگا رکھا تھا اور لاشوں پر سے گزرتے ہوئے ان کے قدم تھم جاتے تھے، زرد چہروں کو کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، انہی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں زندگی محفوظ ہو۔ جونہی باپ ایک دوکان کے شیلٹر کے نیچے پہنچ کر اپنی بیوی کو آواز دیتا ہے کہ اچانک ایک گولہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھٹتا ہے جو اس کی بیوی اور تین سال کی بچی کو ہوا میں پرزے پرزے کر کے اڑا دیتا ہے۔ یہ مناظر دیکھ کر میرے ہوش و حواس جواب دے جاتے ہیں اور مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ مزید دیکھ سکوں اور کچھ لکھ سکوں

مجھے یاد ہے کہ جنگ کے دنوں میں ٹی وی پر ایسا ہی مناظر دکھائے جارہے تھے کہ بمباری ہو رہی تھی اور ایمبولنس کا پہنچنا ناممکن ہو رہا تھا۔ لوگوں کے پاس دو ہی راستے تھے، گھروں میں رہ کر اپنی زندگی کی باقی ماندہ سانسیں اور گھڑیاں گنیں یا جان بچانے کیلئے بھاگنے کا خطرہ مول لیا جائے۔ بھاگنے والے اپنے روتے بلکتے بچوں کا اٹھائے ننگے پاں کسی محفوظ مقام کی تلاش میں ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں کہ جہاں سے

واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ تین افراد اپنی بوڑھی ماں کو اٹھائے جارہے تھے، جب ان سے پوچھا: کیا دیکھا ہے؟ ان کا مختصر جواب تھا"خوف اور موت"۔

اسرائیلی جارحیت کے خلاف مسلم ممالک سمیت عالمی قیادت تو مجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے تاہم اہل غزہ کے حق میں دنیا بھر کے عوام کے سراپا احتجاج نے اسرائیل کی بربریت اور مغربی طاقتوں کی بے حسی اور جانبدارانہ رویے کے خلاف مظاہرے ہورہے ہیں۔ فرانس میں نکالی جانے والی ایک ریلی کا پولیس سے بھی تصادم ہوا۔ مشتعل مظاہرین نے احتجاج کے دوران میں توڑ پھوڑ بھی کی۔ حکومت فرانس بھی اسرائیل کے خلاف عوام کا غم وغصے سے معمور احتجاج کچل نہیں سکی۔ یورپ کے دیگر شہروں لندن، برمنگھم، مانچسٹر، گلاسگو، ویانا، ایمسٹرڈیم اور سٹاک ہوم اور خود امریکا کے کئی بڑے شہروں میں اسرائیلی جارحیت کے خلاف ریلیاں احتجاج کررہی ہیں لیکن صد افسوس کہ بعض عرب ممالک سے میرے رب نے یہ توفیق ہی سلب کرلی ہے۔

غزہ کی صورتحال پر سلامتی کونسل نے اجلاس میں جنرل سیکرٹری کا کہنا تھا: فلسطین میں بہنے والے خون کو روکنا ہوگا۔ ایک نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اسرائیل پر زور دیا گیا کہ وہ فلسطینی شہریوں کی ہلاکتیں روکنے کیلئے فوری اقدامات کرے امریکی صدر کی اسرائیل کے حق دفاع کی بودی دلیل نے اقوام عالم کو ایک مرتبہ پھر بہت مایوس کیا۔ ادھر وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: اسرائیل اور فلسطین کے درمیان کشیدہ صورتحال کی اصل ذمہ داری حماس پر عائد ہوتی ہے اس لئے اسرائیل کو حق ہے کہ وہ اپنے دفاع میں حماس کو بالکل ختم کردے۔

یہی وجہ ہے کہ نیتن یاہو نے ایک مرتبہ پھر دھمکی دی ہے کہ ہلاکتوں کے باوجود آپریشن جاری رہے گا اور اس آپریشن کیلئے انہیں عالمی طاقتوں کی مضبوط حمائت حاصل ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی مرتبہ حماس کی راکٹوں کی بارش نے نہ صرف اسرائیل بلکہ اس کے تمام حمائتیوں کو ششدر کرکے رکھ دیا ہے۔ یہ سب تگ ودو فلسطینیوں کی مسلسل پامالی روکنے کی مساعی ہیں۔ نہتے فلسطینیوں کا قصور یہ ہے کہ وہ اپنی ہی سرزمین کے ایک حصے میں آباد ہونے کی جدوجہد کررہے ہیں اور اپنے لئے آزادی کا حق مانگتے ہیں، وہ حق جسے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں میں تسلیم کیا جاچکا ہے لیکن اس جدوجہد آزادی کے دوران میں اگر کبھی کبھار عدم تشدد کا کوئی واقعہ پیش آجائے تو اسرائیل کو اپنے دفاع کے نام پر قتل عام کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے حالانکہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں محکوم قوموں کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر ان پر پرامن جدوجہد کے تمام دروازے بند کردیئے جائیں تو وہ اپنے تسلیم شدہ حقوق کی خاطر ہتھیار اٹھاسکتی ہیں۔

ہر روز میرا خوف بڑھتا جارہا ہے کہ اگر اس ظلم کی آندھی کو روکا نہ گیا تو ایک ایسی جنگ شروع ہونے کا امکان ہے جہاں ساری دنیا تاریک ہوسکتی ہے۔ اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ان خطرات کا تدارک کرنے کیلئے دنیا کے صاحب عقل وفراست افراد مل کر اس دنیا کو بچانے کیلئے اپنی منصفانہ آواز اٹھائیں تاکہ ہم اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کو ایک بہترین دنیا دیکر رخصت ہوں۔

بروز ہفتہ 21 ربیع الثانی 1445ھ 4 نومبر 2023ء

عالمی امن اور نسل پرست اسرائیل

اسرائیل نے بھی نسل پرستی کو اسی طور اپنایا ہے جس طور جنوبی افریقا میں سفید فام اقلیت نے سوویٹو میں اپنایا تھا۔ سوویٹو کے انجام بد کے بعد اسرائیل میں بھی نسل پرستی پر مبنی نظام ایک دن فنا ہو گا۔ 21 مارچ 1960 کی بات ہے، یکساں حقوق کیلئے آواز بلند کرنے اور احتجاج کرنے والے سیاہ فام باشندوں پر جرمنی افریقا کی نسل پرست انتظامیہ کے تعینات کردہ پولیس اہلکاروں اور فوجیوں نے گولیاں برسائیں۔ یہ واقعہ شرپے ولے کا ہے۔ 16 جون 1976 کو یہی سب کچھ سیاہ فاموں کی بستی سوویٹو میں ہوا۔ 24 مئی 2018 کو یہ سب کچھ غزہ میں اسرائیلی اہلکاروں کے ہاتھوں ہوا اور ان کا نشانہ بنے فلسطینی، اور آج ایک مرتبہ پھر چشم فلک دیکھ رہا ہے کہ غزہ میں تاریخ کی بدترین خونریزی اسرائیل کے ہاتھوں ہو رہی ہے اور بظاہر دنیا میں جمہوریت اور انسانی حقوق کے چیمپئن کس طرح اسرائیل کی پشت پر کھڑے اس ظلم و ستم میں شریک ہیں۔

اسرائیل نے پہلے تو وہی اطوار اپنائے ہیں، جو جنوبی افریقا کی نسل پرست انتظامیہ نے اپنائے تھے مگر اب تو اس نے ہلاکو اور چنگیز خان کو بھی مات کر دیا ہے۔ ایک طرف تو فلسطینیوں کا مکمل بائیکاٹ کیا گیا، انہیں کام کرنے اور ڈھنگ سے کمانے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ دوسری طرف ان کے علاقوں میں سرمایہ کاری نہیں ہونے دی گئی۔ تجارتی اور صنعتی اعتبار سے فلسطینی انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں ہیں۔ ان کیلئے باعزت طریقے سے اپنے اور اہل خانہ کیلئے تین وقت کی روٹی کا اہتمام کرنا بھی انتہائی دشوار ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ طرح طرح کی پابندیاں بھی عائد ہیں۔ یہ بنیادی حقوق کی صریح خلاف ورزی ہے کیونکہ غزہ اور دیگر فلسطینی علاقوں میں پابندیوں کے ہاتھوں صحتِ عامہ کا بحران پیدا ہو چکا ہے۔ ادویات اور ضروری طبی سامان کی قلت نے ہزاروں فلسطینیوں کو موت کی راہ دکھا دی ہے اس وقت ہزروں زندگیاداؤ پر لگی ہوئی ہیں۔ اسرائیل نے جو سلوک فلسطینیوں سے روا رکھا ہے اس کی دنیا بھر میں مذمت کی جا رہی ہے۔ ایسے میں یہ بات بہت عجیب دکھائی دیتی ہے کہ کوئی اسرائیلی پالیسیوں کو غلط قرار نہ دے اور ان کی حمایت کرے۔ رچرڈ گولڈ اسٹون کا یہی معاملہ ہے۔ جنوبی افریقا کے ڈیسمنڈ ٹوٹو نے کہا تھا کہ جو کچھ جنوبی افریقا میں ہوا کرتا تھا، وہی کچھ اسرائیل کر رہا ہے۔ رچرڈ گولڈ اسٹون جنوبی افریقا کے سفید فام یہودی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ اسرائیل کچھ غلط نہیں کر رہا بلکہ اس کے اقدامات کو کسی اور رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

جنوبی افریقا میں جو نسل پرستی اپنائی گئی تھی اس کی بنیاد دو باتوں پر تھی۔ اول یہ کہ سیاہ فام آبادی کو برابر کے شہری نہ سمجھا جائے یعنی انہیں چند بنیادی حقوق سے محروم رکھا جائے اور دوسرے یہ کہ انہیں ووٹ کا حق کسی بھی حال میں نہ دیا جائے۔ ووٹ کا حق ملنے کا مفہوم اس کے سوا کیا ہے کہ انسان اپنے لیے اپنی مرضی سے نمائندہ منتخب کرے اور اپنی مرضی کی حکومت تشکیل دینے میں کلیدی کردار ادا کرے۔ یہی سبب تھا کہ جنوبی افریقا میں سیاہ فام باشندوں کو الگ تھلگ رکھا جاتا تھا۔ انہیں حکومتی امور سے متعلق کچھ کہنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ معاشی معاملات میں کچھ بھی کہنے کے حقدار نہ تھے۔ سیاسی معاملات میں تو اُنہیں اُف بھی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایسے ماحول میں پروان چڑھنے والی نسلیں فطری طور پر کمزور ہوتی ہیں۔ ان میں اعتماد نہیں ہوتا۔

تاریخ کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ نسل پرستی کا آغاز امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں ہوا۔ سفید فام یورپی باشندے جب ان ممالک میں پہنچے تو تعداد میں

بہت کم تھے۔ لازم تھا کہ مقامی آبادیوں کو کسی نہ کسی طور منقسم اور الگ تھلگ رکھا جائے۔ افریقا میں بھی یورپ کے لوگوں نے یہی کیا۔ وہاں آباد ہونے والے یورپی باشندوں نے سیاہ فام باشندوں کو گرفتار کر کے غلام بنایا اور پھر بیگار کیلئے یورپ اور امریکا بھیج دیا۔ اس صورت میں یورپی آباد گاروں کیلئے افریقی سرزمین پر باقی ماندہ لوگوں کو کنٹرول کرنا بہت آسان ہو گیا۔ مئی 1948ء میں جنوبی افریقا میں سفید فام یورپی اقلیت کو سیاہ فام اکثریت اور مئی 1948ء میں فلسطین میں سفید فام یورپی نسل کے یہودیوں کو فلسطینی اکثریت کا سامنا کرنا پڑا۔

جنوبی افریقا میں سفید فام اقلیت کے سامنے انتہائی امتیازی سلوک پر مبنی پالیسی اپنانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس نے سیاہ فام اکثریت کو تمام بنیادی حقوق سے یکسر محروم کر دیا۔ ووٹ کاسٹ کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ دوسری طرف اسرائیل میں معاملہ یہ تھا کہ نسل پرستی کو ڈھکے چھپے انداز سے اپنایا گیا سات لاکھ عرب باشندوں کو ان کی سرزمین سے بے دخل کرنے کے بعد وہ علاقہ اسرائیل کا حصہ بنالیا گیا۔ اقوام متحدہ کے طے کردہ تمام اصولوں کو یکسر بالائے طاق رکھتے ہوئے اسرائیلی حکومت نے ان عرب باشندوں کو واپسی کا حق دینے سے بھی محض اس دلیل کی بنیاد پر انکار کر دیا کہ یہ نسلی یہودی نہیں، اس لیے ان علاقوں پر ان کا کوئی حق نہیں۔ اکثریت یقینی بنانے کے اس طریق کار کو دنیا بھر میں شدید تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے، بھرپور مذمت کی جاتی رہی ہے۔ جن علاقوں میں عرب 55 فیصد تھے وہاں اسرائیلی اقدام کے بعد یہودی 80 فیصد ہو گئے۔

آج غزہ میں انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں زندگی بسر کرنے والے فلسطینی دراصل وہی عرب باشندے اور ان کی اولادیں ہیں جنہیں اسرائیلیوں نے 1948ء میں اپنی سرزمین سے بے دخل کر دیا تھا۔ جب یہ فلسطینی غزہ اور 1949ء سے 1967ء تک کے اسرائیل کی سرحد پر جمع ہو کر اپنی آبائی زمین کی طرف مارچ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو نسل پرستانہ نظام کو چیلنج کرتے ہیں۔ بنیادی حقوق سے متعلق بین الاقوامی قانون (بشمول قبرص، آرمینیا اور آذربائیجان سے متعلق یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس کے فیصلے) کسی بھی نسلی آبادی کو اُس کی آبائی سرزمین سے نزدیک ترین علاقوں کو واپس جانے کا حق دیتا ہے۔

بیشتر اسرائیلی اس بات کے خلاف ہیں کہ فلسطینیوں کو ان کی زمینوں پر واپسی کا حق دیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے ان کی اکثریت قائم ہو جائے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ غلط ہے تو پھر 1948 میں مصنوعی طریقے سے معرض وجود میں لائی جانے والی یہودی اکثریت کو برقرار رکھنا کیوں درست ہے؟ اسرائیل نے 1967ء میں جنوبی افریقا کی نسل پرست پالیسی اپناتے ہوئے غرب اردن، مشرقی بیت المقدس اور غزہ پر قبضہ کرنے کے بعد اسرائیل نے وہاں کے شہریوں کو شہریت کے حق سے بھی محروم کر دیا۔ واضح رہے کہ جنوبی افریقا میں سفید فام اکثریت کا امتیازی نظام 46 سال برقرار رہا تھا جبکہ اسرائیل میں اپنایا جانے والا امتیازی نظام نصف صدی پوری کر چکا ہے۔ اسرائیل کی حکومت اب تک اس پورے معاملے کو "عارضی" قرار دیتی آئی ہے۔ غرب اردن میں نئی بستیاں بسا کر پانچ لاکھ سے زائد یہودیوں کو آباد کیا جا چکا ہے۔ غزہ میں رہنے والے اگرچہ اسرائیل کے ماتحت ہیں مگر انہیں اسرائیل کی شہریت دی گئی ہے، نہ ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا ہے۔

اسرائیل کی حدود میں اب بھی ایسے لاکھوں عرب باشندے ہیں جنہیں شہریت ملی ہوئی ہے اور ووٹ ڈالنے کا حق بھی دیا گیا ہے۔ ایسے میں اسرائیل پر نسل پرستی کا الزام کیوں کر عائد کیا جا سکتا ہے؟ بات کچھ یوں ہے کہ 1948ء میں عرب باشندوں کو ان کے علاقوں سے نکالنے کے بعد اسرائیلی حدود میں جو عرب رہ گئے تھے انہیں شہریت دیے بغیر چارہ نہ تھا اور یوں بھی بہت بڑے پیمانے پر ناانصافیاں کرنے کے بعد چند ایک منصفانہ اقدامات سے

تلافی ممکن نہیں۔

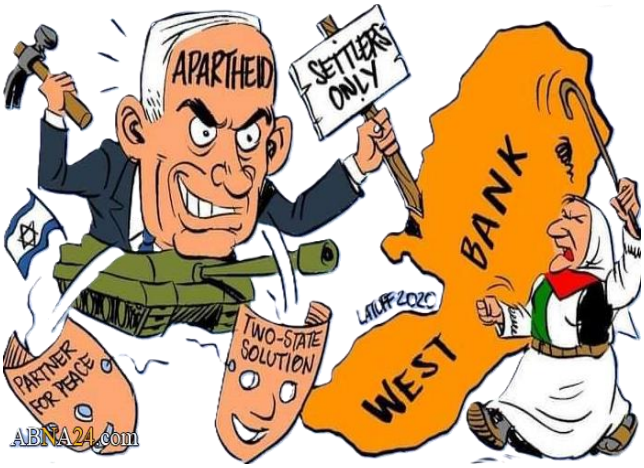

جنوبی افریقا کی نسل پرست حکومت پر جب غیر معمولی بین الاقوامی دباؤ پڑا تب اس نے طے کیا کہ سیاہ فام باشندوں کو 10 چھوٹے چھوٹے خود مختار علاقوں میں بسا دیا جائے اور باقی ماندہ زمین یعنی بڑا ٹکڑا سفید فام اقلیت کے تصرف میں رکھا جائے۔ اقوام عالم نے یہ تجویز فوراً مسترد کر دی کیونکہ اس میں کہیں بھی انصاف نہیں تھا۔ اسرائیل نے بھی کچھ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایسا ہی طریق کار دکھایا جاسکے کہ اسرائیل نے فلسطینیوں کو ریاست کے فلسطینیوں کو الگ تھلگ علاقوں میں بسا کر تھوڑی بہت خود مختاری دے دی جائے تاکہ دنیا کو قیام کا حق دے دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت فلسطینیوں اور دیگر عرب باشندوں کو زیادہ سے زیادہ منقسم رکھنا چاہتی ہے تاکہ وہ کبھی ایک ہو کر اسرائیل کے خلاف کچھ نہ کر سکیں۔

اسرائیل نے سات عشروں کے دوران فلسطینیوں اور دیگر عرب باشندوں کو کچل کر رکھنے کی جس پالیسی پر عمل جاری رکھا ہے اسے بالکل درست قرار دینے والوں کی اسرائیل میں بھی کمی نہیں۔ وزیر تعلیم نفتالی بینیٹ کہتا ہے کہ اسرائیل نے جس طور مشرقی بیت المقدس، گولان کی پہاڑیوں اور غزہ پر قبضہ کیا تھا بالکل اسی طرح پورے غرب اردن پر بھی قبضہ کر لے۔ اس تجویز پر عمل کی صورت میں اسرائیل کی نسل پرستانہ پالیسی زیادہ شفاف ہو کر دنیا کے سامنے آئے گی۔

یورپ نے صدیوں تک یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے تھے اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جس طور یہودیوں کو قتل کیا گیا اس نے یورپ کی سفید فام اقوام میں شدید احساسِ جرم پیدا کیا اور اس احساسِ جرم سے چھٹکارا پانے کیلئے انہوں نے طریقہ یہ سوچا کہ یہودیوں کو ایسی جگہ بسایا جائے جہاں مستقبل میں یہودی ریاست یورپ کے مفادات کیلئے ایسے ایجنٹ کے طور پر کام کرے جو عربوں کو ان کے زیر نگیں رکھنے کے کام آسکے۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کو فلسطینیوں کو تختہ مشق بنانے کی اسے کھلی چھٹی دی گئی۔ جو کچھ یورپی اقوام نے یہودیوں سے کیا، وہی سب کچھ فلسطینیوں سے ہونے دیا جارہا ہے۔ سات عشروں سے فلسطینی اور عرب باشندے شدید امتیازی سلوک، تشدد اور قتل وغارت کا سامنا کر رہے ہیں۔ اسرائیل کو فلسطینیوں سے کھل کر ناانصافی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل نے زیادہ نسل پرستی کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ بھی زیادہ طویل مدت تک جو ابھی تک جاری ہے۔

اسرائیل کے خلاف رائے عامہ ہموار ہوتی جارہی ہے۔ امریکی جامعات میں پڑھنے والے یہودی طلبہ بھی اب اس بات کو سمجھتے ہیں کہ فلسطینیوں سے سات عشروں سے زائد تک ناانصافیاں روا رکھی گئی ہیں۔ اسرائیل کی نسل پرستانہ پالیسیاں اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اسرائیل پر بڑھتا ہوا دباؤ بالآخر فلسطینیوں کیلئے کسی ریاست کے حق کو لیے بغیر چین سے نہ بیٹھے گا۔ امریکا، یورپ اور دیگر خطوں میں اسرائیل کے خلاف فضا تیار ہوتی جارہی ہے اور بالخصوص حالیہ غزہ پر اسرائیل کے بے رحمانہ اور وحشیانہ حملوں کے بعد مغربی ممالک میں اسرائیل کے خلاف مظاہروں میں دنیا بھر کی اقوام بشمول

یہودی افراد کی شمولیت اس بات ی مظہر ہے کہ اگر اسرائیل کی نسل پرستی کی پالیسیوں کو نہ روکا گیا تو اس کے اتحادیوں کی سلامتی کیلئے بھی کئی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں اور دنیا پھر ایک نہ رکنے والی ایک ایسی جنگ میں داخل ہو سکتی ہے جس کے نتیجے میں ساری دنیا تاریک ہو سکتی ہے۔

اس وقت اقوام متحدہ میں دو ریاستوں کے قیام کی قراردادوں کو آخر کیوں پس پشت ڈال کر دنیا کے امن کو تباہ کیا جارہا ہے۔ اسرائیل کی حمائت میں امریکا اور اس کے اتحادیوں کو آخر کار اپنے عوام کے دباؤ پر سر جھکانا پڑے گا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ اگر ایسی ہی اقوام متحدہ کی قراردادیں کسی مسلم ممالک کے خلاف ہوتیں تو کیا امریکا اور اس کے اتحادی اس قدر انتظار کرتے ؟ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ اسرائیل کے پشتیبان امریکا اور اس کے اتحادیوں نے پچھلے پانچ عشروں میں دنیا میں 37 ممالک پر جارحیت سے قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن کسی ایک ملک سے بھی عزت کے ساتھ واپس نہیں لوٹا بلکہ جس قدر ذلت ور سوائی اسے ویتنام اور افغانستان میں اٹھانی پڑی ہے، اس کے بعد یقین ہو چلا تھا کہ اب امریکا اپنی ان وحشیانہ پالیسیوں پر غور کر کے آئندہ دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے میں تعاون کرے گا لیکن جاری پالیسیاں اس بات کی چغلی کھا رہی ہیں کہ شائد ان طاقتوں کیلئے کوئی ایسا بندوبست ہونے جارہا ہے کہ جس کے بعد ماسوائے پچھتاوے کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

ادھر سوشل میڈیا پلیٹ فارم ایکس پر ایران کے صدر ابراہیم رئیسی نے اسرائیل کے غزہ کے خلاف اٹھائے گئے اقدامات پر متنبہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسرائیل نے اب حد سے تجاوز کر لیا ہے جو کسی کو بھی اس کے خلاف کارروائی پر مجبور کر سکتا ہے۔ واشنگٹن ہم سے کچھ بھی قدم نہ اٹھانے کو کہتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ اسرائیل کی وسیع حمایت جاری رکھے ہوئے ہے۔ ان کے مطابق امریکا نے مزاحمتی اتحاد کو پیغامات بھیجے لیکن ان کا جواب انہیں واضح طور پر میدان جنگ میں مل گیا ہے۔ مزاحمتی اتحاد سے مراد پورے مشرق وسطیٰ میں ایران کی حمایت یافتہ فورسز کا نیٹ ورک ہے جس کا حماس ایک حصہ ہے۔ واضح رہے کہ امریکی حکام ایران کو خبردار کرتے رہے ہیں کہ وہ اسرائیل اور حماس جنگ سے دور رہے کیونکہ وہ وسیع تر علاقائی تنازع کو روکنے کا خواہاں ہے جبکہ وہ پہلے ہی دن اپنی امریکی بحری بیڑے سمیت اسرائیل کی تائید میں پہنچ چکا ہے اور برطانوی انڈین نژاد ہندو وزیر اعظم تو اسلحہ کے بھرے ہوئے جہاز کے ساتھ اسرائیل کے ساتھ یکجہتی کیلئے اپنی حاضری لگوا چکا ہے۔ اسرائیل نے خود اس جنگ کو وسعت دینے کیلئے شام اور لبنان پر فضائی حملوں سے اپنے ناپاک ارداوں کا اظہار کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ لبنان میں ایران کا حمایت یافتہ حزب اللہ گروپ حالیہ ہفتوں میں اسرائیل کے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ جاری ہے۔ تیسری عالمی جنگ کے خدشات یقین میں بدلتے نظر آرہے ہیں!

بروز سوموار 23 ربیع الثانی 1445ھ 6 نومبر 2023ء

ایمان کا کمزور ترین درجہ

روز روشن کی طرح واضح ہو چکا ہے کہ حق باطل کی طاقت سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوا اور حق و باطل کی کشمکش روزِ اوّل سے قیامت تک جاری رہے گی لیکن اللہ کی نصرت ہمیشہ حق کے ساتھ رہی ہے۔ باطل قوت کی مختلف شکلیں و صورتیں ہوتی ہیں جس کا سورہ اعراف میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

(1) نظام باطل نے قانون شرعی کی بالادستی سے انکار کر دیا اور حکم خداوندی کی مخالفت کی۔

(2) اس نے تکبر کیا یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھا اور ذاتی بالادستی اور مطلق العنانیت کو اختیار کیا۔

(3) اور تھا کافروں میں سے "یعنی کافروں کے مقابلے میں کافروں کو ترجیح دینا"۔

(4) اس نے کہا کہ اب میں تیری سیدھی راہ پر انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا یعنی انسانوں کو اغوا اور گمراہ کرنے کی ہر صورت کوشش کرتا رہوں گا۔

(5) مخلوق خدا کو دھوکا دینا اور جھوٹ کو سچ کی صورت میں پیش کرنا ابلیس کی پسندیدہ پالیسی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

لیکن اللہ رب لعالمین نے انسانوں کی راہنمائی کیلئے رسول مبعوث فرمائے۔ رسولوں کے ساتھ حق کی صورت میں تورات، انجیل، زبور صحیفے نازل کیے۔ بالخصوص امتِ محمدی ﷺ کیلئے 30 پاروں کی صورت میں قرآن نازل کیا تاکہ انسان صراطِ مستقیم پر ہمیشہ گامزن رہے اور باطل سے کبھی مرعوب نہ ہو۔ قرآن میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کا کئی مقام پر ذکر کیا تاکہ مسلمان کو کامل یقین ہو جائے کہ اللہ کی نصرت حق کے ساتھ ہوتی ہے چنانچہ سورہ مریم میں حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ اس طرح بیان کیا "بے شک ابراہیم بڑا سچا پیغمبر تھا، اس نے اپنے باپ آذر سے کہا: ابا ان کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ تو سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی تجھ سے کفایت کر سکتے ہیں۔

اس مقام پر حضرت ابراہیمؑ نے مردہ بتوں کی نفی کر دی تو فوری باطل کی طرف سے دھمکی ملی کہ یہاں سے نکل جاؤ ورنہ پتھروں سے مروا دوں گا۔ قرآن نے واضح بیان کیا کہ حق باطل سے مرعوب اور خوفزدہ نہیں ہوا بلکہ مزید حضرت ابراہیمؑ نے زندہ بتوں کی یعنی نمرود کی اور اس کے باطل نظام کی نفی کر دی بلکہ ان کے مردہ بتوں کو پاش پاش کر دیا اور باطل کے مقابلے کیلئے ڈٹ گئے، گھبرائے نہیں۔ باطل نے بہت بڑا فریب کیا، آگ کا الاؤ تیار کیا۔ بظاہر زمینی حقائق پر نظریں دوڑانے والوں نے دیکھا کہ حضرت ابراہیمؑ پورے ملک میں اکیلے ہیں، کمزور ہیں، جماعت نہیں، قوت نہیں، اسلحہ نہیں جبکہ دوسری طرف تمام تر وسائل موجود ہیں لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ حق غالب ہو گیا اور باطل مٹ گیا، کیونکہ حق کبھی باطل سے مرعوب اور خوفزدہ نہیں ہوا۔

حضرت موسیٰؑ نے زندہ اور مردہ بتوں کی نفی کر دی۔ فرعون کی اور اس کے باطل نظام بلکہ تمام پالیسیوں کا انکار کر دیا۔ فرعون میدانِ عمل میں جادوگروں کو مقابلہ کیلئے لے آیا۔ ایک طرف پوری سلطنت مخالف، حکمران مخالف، بظاہر نظام باطل بڑی قوت اور طاقت کا مالک ہے، دولت سرمایہ، رعب و دبدبہ تھا، دوسری طرف دو بھائیوں کی صورت میں حق اکیلا اور کمزور نظر آ رہا تھا۔ مقابلہ ہوا لیکن حق غالب آ گیا۔ اللہ نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا لیکن باطل کی صورت میں ابوجہل اور ابولہب مقابلے میں آ گئے۔ مکہ میں کشمکش شروع ہوئی، باطل اپنی پوری قوت کے

ساتھ حق کو کچلنے اور مٹانے کیلئے بر سرِ پیکار رہا، مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کیے لیکن مسلمان کبھی باطل قوت سے خوفزدہ نہیں ہوئے، مقابلہ کرتے رہے۔

مکہ سے مدینہ ہجرت کی لیکن کفر کی طاقت نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ سب سے پہلے معرکہ جنگ بدر ہوا۔ زمینی حقائق یہ تھے کہ ایک طرف زبردست طاقت، اسلحہ اور افرادی قوت ہے، دوسری طرف بظاہر حق کمزور و بے سروسامان ہے۔ اس پیر کہن نے دیکھا، فضاء نے دیکھا کہ اللہ کی نصرت اور مدد فرشتوں کی صورت حق کیلئے آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کفر کی کمر ٹوٹ گئی، حق غالب ہوا یہاں تک کہ مکہ فتح ہوا۔ باطل ہمیشہ کیلئے شکست فاش سے دوچار ہوا۔ اللہ کے رسول ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ ان کے مردہ بتوں پر ضربیں بھی لگا رہے تھے اور قرآن کی آیت تلاوت فرما رہے تھے کہ "حق آگیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے"۔ خلاصہ یہ کہ اللہ کی زمین پر عدل وانصاف کا نظام قائم ہوا۔ اسلامی ریاست کا دستور قرآن اور سنت محمدی ﷺ مقرر ہوتے ہی ظلم اور بے انصافی ختم ہوگئی، اخوت و محبت کا چرچا عام ہوا، عریانی فحاشی ختم ہوگئی۔

جس کا مفہوم اور مقصد یہ ہے کہ

(1) حاکمیت اللہ کی ہوگی۔

(2) قرآن مجید ضابطہ حیات ہوگا اور رسول ﷺ کی سنت اور شریعت ماخذ ہوں گے۔

(3) عدل بین الناس کا نظام قائم ہوگا۔

(4) مساوات بین الناس یعنی مسلمانوں کے تمام حقوق بلالحاظ رنگ، نسل، زبان و وطن برابر ہوں گے۔

(5) قانون سے بالاتر کوئی نہیں ہوگا۔

(6) تمام خزانے حکومت کے پاس اللہ کی امانت ہوں گے، عدل وانصاف سے تقسیم کیے جائیں گے۔

(7) نظام شوریٰ قائم رہے گا جس کا مقصد یہ ہے کہ سربراہ ریاست کا تقرر مسلمانوں کے مشورے اور رضامندی سے ہوگا۔

(8) نظام اطاعت ہوگا جس کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کی اطاعت معروف میں واجب ہوگی، معصیت یعنی گناہ میں حکمرانوں کی اطاعت کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

(9) اقتدار کی طلب و حرص کا ممنوع ہونا، جس کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کے اعلیٰ منصب اور عہدوں کیلئے بالعموم اور خلافت کے مناصب کیلئے وہ لوگ سب سے زیادہ غیر مناسب اور غیر موزوں ہوں گے جو خود مناسب اور عہدوں کے طالب اور اس کیلئے کوشش کریں گے۔

(10) اسلامی ریاست کا مقصد نیکیوں اور بھلائیوں کو پروان چڑھانا، عریانی، فحاشی، ظلم، بدامنی کو مٹا کر صالح معاشرہ قائم کرنا ہوگا۔ (11) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلم معاشرے کے ہر فرد کا فرض منصبی ہے کہ حق سے تعاون کرے، ظلم اور گناہ میں کسی سے تعاون نہ کرے۔ یہ اللہ کا حکم ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ (العمران:110)

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کیلئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔

لیکن خلفاء راشدین کے بعد اسلامی ریاست کے دستور میں بے شمار تغیرات آئے مثلاً طریقہ اقتدار میں تبدیلی واقع ہوگئی، حکمران طبقہ شاہی محلات میں عیش و عشرت کی زندگی میں مشغول ہوگیا، اسلامی بیت المال کو قومی خزانہ سمجھا گیا یہاں تک کہ شاہی خاندان اور بادشاہوں کی ملکیت ہوگیا۔ آزادی اظہار رائے کا خاتمہ ہوگیا۔ حق بات کرنے والے لوگوں کو جیل میں بند کر دیا جاتا۔ عدلیہ کی آزادی کا خاتمہ ہوگیا۔ نظام شوریٰ مکمل ختم ہوگیا، نسلی اور قومی عصبیتوں کا ظہور شروع ہوگیا، قانون یعنی دستور کی بالادستی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس دوران یزید کی حکومت قائم ہوگئی جس کی زبردستی بیعت لے جارہی تھی۔ حضرت امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا لیکن کچھ ایسے ظالم اور بدنصیب ایسے تھے جنہوں نے یزید کی حمائت میں نواسہ رسول ﷺ اور سارے خاندان کو شہید کر دیا۔ ابن زیاد نے کوفہ کی جامع مسجد میں امام حسینؑ کے سر کی نمائش کرتے ہوئے کہا: حسینؑ آپ ہار گئے اور یزید جیت گیا لیکن لیکن یہ فضا زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ یزید جیت کر ہار گیا اور امام حسین ہار کر جیت گئے کیوں کہ قدرت کا قانون یہی ہے کہ فتح اور نصرت حق کی ہوتی ہے۔

نہ شمر کی وہ جفا رہی نہ ابن زیاد کا وہ ستم ہی رہا
رہا تو نام حسین کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

آج ایک مرتبہ پھر غزہ میں اک نئی کربلا جاری ہے اور کئی احباب برملا کہہ رہے ہیں کہ کیا حماس کو اسرائیل کے شدید ردعمل کا علم نہیں تھا تو پھر یہ خود کشی کا عمل کیوں کیا گیا؟ میں ان تمام کے سامنے صرف چار اسباب کا ذکر کر دیتا ہوں اس کے بعد فیصلہ آپ خود کر لیں:

پہلا سبب تو یہ ہے کہ اسرائیل مسجدِ اقصیٰ کی بے حرمتی، اسے یہودی شناخت دینے، اور ہیکل کی تعمیر کے اپنے ایجنڈے پر ماضی کے مقابلے میں بہت زیادہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اپنے اس ایجنڈے کو پورا کرنے کیلئے ماضی میں دو یا تین سالوں میں وہ جو اقدامات کرتا تھا اب وہ دو تین ہفتوں میں ہی وہ سب پورا کر رہا ہے۔ ساتھ ہی اہلیانِ شہر القدس کو ذلیل و رسوا کرنے، ہراساں کرنے اور ان کے اہلِ علم و فضل کو جیلوں میں بھرنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ صرف یہی نہیں، اس کی حرکتیں اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ اب وہ مسجدِ اقصیٰ میں نماز سے لوگوں کو روک رہا ہے، اس کی رکاوٹوں کی وجہ سے لوگ نماز کیلئے مسجد تک نہیں پہنچ سکتے۔ مسجد کے اندر تقریباً 50 علمی حلقے منعقد ہوتے تھے لیکن اب سالوں سے ان پر بھی پابندی عائد ہے۔ میں یہاں یہ بھی بتادوں کہ حماس کے اس آپریشن سے چند دن قبل 5 ہزار یہودی مسجد اقصیٰ میں گھس کر مسجد سمیت خواتین نمازیوں کی بے حرمتی کی گئی اور اب تک 100 سے زیادہ فلسطینی اپنے ساتھ لے گئے جو ابھی تک ان کی قید میں ہیں۔ کئی دنوں سے ان کی یہی حرکات جاری تھیں۔ مسجد کی بے حرمتی کے ایسے مظاہر گزشتہ 20 سالوں میں بھی سامنے نہیں آئے تھے۔ مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی، اور اسے یہودی رنگ دینے کی بڑھتی ہوئی حرکتوں کے رد میں مجاہدین نے اپنے آپریشن کو انجام دیا۔ معرکہ کے نام سے ہی اس کا مقصود ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہودی گزشتہ 15 سالوں سے دھیرے دھیرے موت کی طرف دھکیلنے کے اپنے منصوبے پر کاربند ہے۔ فلسطینی نوجوانوں کی ایک پوری نسل ایسی ہے جس نے اسی بحران کے درمیان آنکھ کھولی ہے۔ بیس، تیس سال کی عمر کو پہنچے ہوئے اکثر نوجوان زندگی کے ہر گوشے سے

دور، روزگار سے محرومی کی زندگی جی رہے ہیں، وہ اپنی تعلیم پوری نہیں کر سکتے، شادی نہیں کر سکتے، گھر نہیں بنا سکتے اور انہیں کوئی روزگار بھی نہیں ملتا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ میں طرح طرح کی سماجی مشکلات پھیل چکی ہیں، بے روزگاری ہے کہ بڑھتی ہی جا رہی ہے، شادیوں کا سلسلہ رک گیا ہے، یوں سمجھیں کہ سماجی اور معاشی مسائل کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ قریبی دنوں میں ہزاروں کی تعداد میں نوجوانوں نے اس امید پر مغربی ممالک کی طرف ہجرت کی کوشش کی کہ انہیں زندگی گزارنے کیلئے روزگار کے کچھ مواقع میسر آئیں گے۔ وہ ایک مشکل سے نکل کر دوسری مشکل کی طرف جانا چاہتے تھے لیکن بحری راستے میں ایسے سینکڑوں نوجوان سمندر اور مچھلی کا لقمہ بن گئے۔

تیسرا اہم سبب یہ ہے کہ ہزاروں فلسطینی دشمن کی قید میں ہیں، ان کے ساتھ اس کا رویہ وحشیانہ ہے، وہ ایسی شدید اذیتوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ گویا ہر دن کئی کئی بار موت کی چکی میں پیسے جا رہے ہیں۔ آپ تصور کریں کہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو ڈیڑھ میٹر کے سیل میں 13 سالوں سے قید ہیں، کچھ قیدیوں کو بول و براز و گندگی سے لت پت سیل میں ڈالا جاتا ہے۔ وہ درد و الم کا مارا، نفسیاتی اذیت سے دوچار قیدی دو تین دن تک لگ کر اس کی صفائی کرتا ہے کہ اس کے بعد اس میں رہ سکے، اس دوران اس کے کپڑے اتارے جاتے ہیں، اسے زدوکوب بھی کیا جاتا ہے۔ پھر جب سیل صاف ہو جاتا ہے تو اسے اسی طرح کے دوسرے گندے سیل میں منتقل کر دیا جاتا ہے تاکہ اذیت کا وہی سلسلہ پھر شروع ہو۔ ماضی قریب میں قیدیوں کے ساتھ ہونے والا اذیت ناک سلوک برداشت کی حدوں سے بھی باہر جا چکا ہے۔ ان میں یہ اِحساس پیدا ہونے لگا ہے کہ امت انہیں بھول بیٹھی ہے، کسی کو ان کی مصیبت اور ان کے حالات کی فکر نہیں بلکہ کسی کو یہ بھی نہیں پتہ کہ ان کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے۔

صہیونی حکومت کے اندر بن غفیر اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی قیادت میں انتہا پسند یہودیوں کی مضبوط گرفت کی وجہ سے قیدیوں کی زندگی کو اس طرح جہنم بنا دیا گیا ہے کہ عملاً ان کیلئے یہ سب وہ ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے۔ گزشتہ کئی ماہ سے یہ آواز اٹھ رہی تھی کہ ان قیدیوں کی رہائی اور اس جہنم سے ان کی آزادی کیلئے جدوجہد ضروری ہے۔ اس مصیبت میں ہماری فلسطینی قیدی بہنوں کی اذیت کا اضافہ بھی کر لیجیے۔ ہماری بہنوں کو رسوا کیا جا رہا ہے، ان کے دین، عفت اور ان کی حیا کو جس طرح تار تار کیا جا رہا ہے میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ ایسے مرحلے میں یہ آپریشن کیا گیا تاکہ مظالم کے اس لامتناہی سلسلے پر بند باندھا جائے۔

چوتھا اہم سبب یہ ہے کہ مزاحمتی حلقوں کی طرف سے یہ وضاحت آ چکی ہے کہ انہیں موصول خفیہ معلومات کی روشنی میں یہ انکشاف ہوا تھا کہ دشمن غزہ کو تباہ کرنے کیلئے اس کے خلاف ایک بھرپور حملہ کی تیاری کر رہا ہے۔ چنانچہ مزاحمتی قوت نے یہ طے کیا کہ دشمن کو اچانک حملہ کا موقع نہیں دینا چاہیے، اچانک حملہ کر کے دشمن جو اہداف حاصل کرنا چاہتا ہے اسے روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس کارروائی کا آغاز خود مزاحمتی قوت کی طرف سے اچانک ہو نہ کہ دشمن کی طرف سے، چنانچہ ایک ساتھ کئی مقاصد اور اہداف کو سامنے رکھتے ہوئے بھرپور کارروائی کی۔ ہم 2014ء میں بھی اس قسم کا تجربہ دیکھ چکے ہیں۔ اس وقت بھی مزاحمتی قوت کو جب یہ اندازہ ہو گیا کہ دشمن غزہ کو تباہ کرنے کیلئے حملے کی تیاری کر رہا ہے تو انہوں نے جنگ کا رسمی اعلان کیے بغیر دونوں کے اندر دسیوں میزائل سے دشمن کو نشانہ بنایا تاکہ وہ اپنے منصوبہ سے پہلے ہی جنگ میں داخل ہونے پر مجبور ہو اور اچانک حملہ کر کے دشمن اپنے جو مقاصد پورا کرنا چاہتا ہے (مثلاً اہم قائدین کو قتل کرنا یا سینکڑوں مجاہدین کو ان کی تربیتی مشقوں کے درمیان گرفتار کرنا وغیرہ) انہیں پورا نہ کر سکے۔

آخر میں یہ بھی عرض کروں کہ دشمن کے مقابلے میں کھڑے لوگ اپنے اَحوال سے بہتر واقف ہیں، جو ان اَحوال سے واقف نہ ہو اسے چاہیے کہ وہ کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے صحیح صورتِ حال دریافت کرلے۔ یہی حکمت کا تقاضہ ہے۔ یاد رکھیں کہ گھٹن کے اس ماحول میں ہمیں تنقید سے پہلے تمام اسباب پر بھی غور کرلینا چاہئے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ایمان کے آخری اور کمزور ترین درجہ سے محروم ہوگئے ہیں؟ مذکورہ حدیث مبارکہ میں ایمان کے درجات کو بڑے ہی احسن پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

مَنْ رَأي مِنْكُم مُنكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِه، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِه، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِه، وَ ذَالِكَ اَضْعَفُ الْإِيْمَان.
مسلم، الصحيح،كتاب الايمان،باب بيان كون النهي عن المنكر من الايمان،1:69،رقم:49

”تم میں سے جو شخص خلافِ شریعت کام دیکھے تو اپنے ہاتھوں سے اس کی اصلاح کرے، اور اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کا ردّ کرے، اور اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل سے اسے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔“

بروز بدھ 25 ربیع الثانی 1445ھ 8 نومبر 2023ء

67 الفاظ نے نقشہ بدل دیا

حقیقتاً اسرائیل اور حماس کے درمیان جنگی طاقت کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے کیونکہ اسرائیل جدید ترین خطرناک اسلحے سے لیس جبکہ حماس تقریباً نہتے لیکن بھرپور جذبہ شہادت کی ایک مرتبہ پھر ناقابل یقین مثال کے ساتھ میدان میں موجود ہے۔ 7/اکتوبر سے شروع جنگ تادم تحریر ابھی تک جاری ہے۔ اس سے حماس کے جذبہ شہادت اور پختہ عزم کی برتری ظاہر ہوتی ہے اور اس چیز کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ فتح اور کامیابی حاصل کرنے کیلئے قربانیاں دینا ناگزیر ہے۔ جنگ کے نتیجے میں دونوں طرف ہونے والی ہلاکتوں کے تناسب میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔

اسرائیل اور حماس کے درمیان 7/اکتوبر سے جاری اسرائیلی جارحیت کے دوران اب تک تقریباً 1400 اسرائیلی اور غیر ملکی ہلاک ہو چکے ہیں جن میں 308 آئی ڈی ایف فوجی، 10 شن بیٹ ایجنٹ اور 58 پولیس اہلکار اور کم از کم 5,132 زخمی ہوئے ہیں۔ ہلاک شدگان میں تقریباً 70 ہلاک یا لاپتہ اسرائیلی شہری بھی شامل ہیں جبکہ غزہ میں شہداء کی تعداد 9700 سے تجاوز کر چکی ہے جن میں چار ہزار بچے ہیں جن کی لاشوں کے ٹکڑے اٹھانے کیلئے صرف ان کے نحیف ونزار ضعیف بزرگ باقی بچے ہیں۔ 2500 سے زائد خواتین ہیں اور زخمیوں کی تعداد 26 ہزار سے زائد ہو چکی ہے جن کے علاج معالجہ کیلئے ادویات ختم ہو چکی ہے اور بجلی منقطع ہونے کی وجہ سے 1600 سے زائد بچوں کی انکیوبیٹر میں ہلاکت کو کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق نامعلوم ہزاروں کی تعداد میں ملبے میں دبے ہوئے ہیں جن کے بچنے کی اب کوئی امید باقی نہیں۔ ادھر اسرائیلی درندگی کی وجہ سے جبالیہ کیمپ میں پانی کے سب سے بڑے ذخیرے کو بھی تباہ کر دیا گیا ہے۔

اسرائیل کی اندھا دھند بمباری کے نتیجے میں غزہ میں بڑے پیمانے پر جو تباہی ہوئی ہے اور املاک کا جو نقصان ہوا ہے، اس کا تو اب تک اندازہ نہیں لگایا جا سکا تاہم اب بھی اسرائیلی بمباری کا منہ بولتا ثبوت سیکڑوں رہائشی عمارتیں، اسکول، اسپتال اور پناہ گزیں کیمپس آج بھی کھنڈرات کی شکل میں مغرب اور امریکا کے انسانی حقوق کے چہرے پر ایک بدنما داغ بنے نوحہ کناں ہیں۔ 22 لاکھ افراد کا گھر، غزہ کی پٹی ایک گنجان آباد انکلیو ہے، 41 کلومیٹر (25 میل) لمبا اور 10 کلومیٹر چوڑا، ایک طرف بحیرہ روم سے گھرا ہوا ہے اور اس کی سرحدوں پر اسرائیل اور مصر سے باڑ لگی ہوئی ہے۔ غزہ کے فلسطینی باشندوں کی اکثریت مسلمان ہے، حالانکہ وہاں ایک چھوٹی سی عیسائی اقلیت بھی ہے۔ غزہ کی آبادی بہت کم عمر ہے، جس میں تقریباً 75٪ کی عمر 25 سال سے کم ہے۔ شہر اس وقت 14 رکنی میونسپل کونسل کے زیر انتظام ہے۔

اسرائیل حماس حالیہ جنگ کے نتیجے میں اہل فلسطین کو بہت سے فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ عالمی تجزیہ نگار اب بھی اور آئندہ کافی دنوں تک ان کا تجزیہ کرتے رہیں گے۔ مثال کے طور پر اپنوں ہی کی بے وفائی سے قضیہ فلسطین پس پشت چلا گیا تھا، اس جنگ کے نتیجے میں وہ پھر ابھر گیا ہے۔ عالمی سطح پر فلسطین کے حمایتی ممالک میں اضافہ ہوا ہے۔ تمام ممالک میں اسرائیل کے خلاف اور فلسطین کی حمایت میں زبردست مظاہرے ہوئے ہیں۔ اسرائیل اپنی درندگی، حیوانیت اور دہشتگردی کے سبب اقوامِ عالم میں مبغوض ٹھہرا ہے اور اس کے خلاف بین الاقوامی نفرت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کی ڈپلومیسی پوری دنیا میں کمزور ہوئی ہے۔ اسرائیل کو ناقابلِ تسخیر سمجھے جانے کا مفروضہ غلط ٹھہرا، اور حماس کو ایک قابلِ لحاظ طاقت تسلیم کیا گیا ہے۔ اسرائیل کی اقتصادیات پر کاری ضرب لگی ہے، اس لیے کہ حماس کے راکٹوں کو روکنے کیلئے اسرائیل کے آئرن ڈومس سے فائر کیے جانے والے راکٹس

کی قیمت کا اندازہ کروڑوں ڈالر میں لگایا گیا ہے جبکہ حماس کے تباہی پھیلانے والے خود ساختہ راکٹ انتہائی غیر معمولی قیمت سے تیار کئے گئے تھے۔ اس طرح متعدد پہلوؤں سے اہل فلسطین کو اسرائیل پر سیاسی، عسکری اور نفسیاتی برتری حاصل ہوئی ہے۔

حالیہ جنگ نے یہود کے بارے میں قرآن کریم کے اس بیان کی تصدیق کر دی ہے کہ وہ زندگی کے بڑے حریص اور موت سے بہت زیادہ خوف زدہ رہنے والے ہیں۔ قرآن کریم میں یوں نقشہ کھینچا گیا ہے:

قُلۡ اِنۡ کَانَتۡ لَکُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ عِنۡدَ اللّٰہِ خَالِصَۃً مِّنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿94﴾ وَ لَنۡ یَّتَمَنَّوۡہُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿95﴾ وَ لَتَجِدَنَّہُمۡ اَحۡرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ ۚۛ وَ مِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا ۚۛ یَوَدُّ اَحَدُہُمۡ لَوۡ یُعَمَّرُ اَلۡفَ سَنَۃٍ ۚ وَ مَا ہُوَ بِمُزَحۡزِحِہٖ مِنَ الۡعَذَابِ اَنۡ یُّعَمَّرَ ؕ وَ اللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿96﴾ (البقرہ)

اِن سے کہو اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے مخصوص ہے، تب تو تمہیں چاہیے کہ موت کی تمنّا کرو، اگر تم اس خیال میں سچّے ہو تو یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنّا نہ کریں گے، اس لیے کہ اپنے ہاتھوں جو کچھ کما کر انھوں نے وہاں بھیجا ہے، اس کا اقتضا یہی ہے ﴿کہ وہاں جانے کی تمنّا نہ کریں﴾ اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔ تم انہیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے حتّٰی کہ یہ اس معاملے میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیے، حالانکہ لمبی عمر بہر حال اُسے عذاب سے تو دُور نہیں پھینک سکتی۔ جیسے کچھ اعمال یہ کر رہے ہیں، اللہ تو انہیں دیکھ ہی رہا ہے۔

چنانچہ حماس کی طرف سے جیسے ہی راکٹ داغے جاتے ہیں، پورے اسرائیل میں سائرن بج اٹھتے ہیں اور یہود آبادی کی غالب اکثریت بنکروں میں جا چھپتی ہے۔ روزروز کی اس صورتحال سے اسرائیلیوں پر کتنے گہرے منفی نفسیاتی اثرات پڑے ہیں، اس کا بخوبی اندازہ ایک امریکی ماہر نفسیات کی اس رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس جنگ کے بعد کئی افریقا اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے یہودیوں نے اسرائیل کو چھوڑ کر دوبارہ واپسی کا رختِ سفر باندھ لیا ہے اور درجنوں کی تعداد میں یہودی اب واپس اپنے ان گھروں کو جانے کیلئے تیار نہیں جن کے گردوپیش میں حماس کی طرف سے راکٹ برسائے گئے تھے جبکہ اسرائیل کے بموں سے غزہ کی کوئی رہائشی عمارت زمیں بوس ہوتی ہے تو اس کے مکین ملبے پر بیٹھ کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے اور فتح کا نشان بناتے دکھائی دیتے ہیں اور اب دوبارہ اپنے گھروں کے ملبے کی صفائی کے بعد ان کو رہائش کے قابل بنانے کیلئے میدان عمل میں موجود ہیں۔

عصر حاضر میں "وطنیت" کی بنیادیں اتنی گہری کر دی گئی ہیں کہ دنیا بھر کے مسلمانوں نے اپنے فلسطینی بھائیوں کی کچھ مدد کرنی چاہی تو بھی نہیں کر سکے۔ اس موقع پر انہوں نے ان کے حق میں دعائیں کی ہیں اور زبان و قلم اور سوشل میڈیا کے ذریعے ان کے حق میں آواز بلند کی ہے۔ مسلم ممالک بہت کچھ کر سکتے تھے، لیکن وہ بھی اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے کیلئے مذمتی قراردادوں سے آگے نہیں بڑھ سکے لیکن غزہ کے مجاہدوں نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کر کے امت کی لاج رکھ لی ہے۔ اللہ ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے۔ ان کی جدوجہد سے ثابت ہو گیا کہ فتح و کامرانی صرف زبانی جمع خرچ سے نہیں حاصل ہو سکتی، بلکہ اس کیلئے قربانیاں ناگزیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا سورہ الصف میں ارشاد ہے: یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ہَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿10﴾ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ تُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿11﴾ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ وَ یُدۡخِلۡکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ وَ مَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿12﴾ وَ اُخۡرٰی تُحِبُّوۡنَہَا ؕ نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَتۡحٌ قَرِیۡبٌ ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿13﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیا میں بتاؤں تم کو وہ

تجارت جو تمہیں عذابِ الیم سے بچادے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو وہ بھی تمہیں دے گا، اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبی ﷺ! اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو۔

ایک سادہ کاغذ پر لکھے 67 / الفاظ نے مشرق وسطیٰ میں ایک ایسے تنازع کا آغاز کیا جو اب تک حل نہیں ہو سکا۔ بالفور اعلامیہ کو 106 سال بیت چکے ہیں۔ یہ ایک ایسی دستاویز تھی جس نے اسرائیل کو جنم دیا اور مشرق وسطیٰ کی تاریخ کو ہمیشہ کیلئے بدل دیا۔ 2 نومبر 1917 کو پہلی عالمی جنگ کے دوران لکھی جانے والی اس تحریر میں پہلی بار برطانوی حکومت نے فلسطین میں یہودیوں کیلئے ایک ریاست کے قیام کی حمایت کی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب سلطنت عثمانیہ کو شکست دینے کے بعد برطانیہ فلسطین پر کنٹرول حاصل کر چکا تھا۔ عرب اس دستاویز کو "برطانوی دغا" سمجھتے ہیں کیونکہ سلطنت عثمانیہ کو شکست دینے میں انہوں نے برطانیہ کا ساتھ دیا تھا۔ بالفور اعلامیہ کے بعد تقریباً ایک لاکھ یہودی فلسطین پہنچے تھے۔

یہ اعلامیہ اس وقت کے برطانوی سیکریٹری خارجہ آرتھر بالفور نے بیرن لیونیل والٹر روتھس چائلڈ کو بھجوایا تھا جو برطانیہ میں یہودی کمیونٹی کے ایک رہنما تھے۔ اس اعلامیہ میں لارڈ روتھس چائلڈ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

"برطانوی حکومت کی جانب سے میں آپ کو صیہونی یہودیوں کی حمایت میں یہ بیان بھجوا رہا ہوں جو کابینہ کے سامنے رکھا گیا اور اس کی منظوری دی گئی۔ برطانوی حکومت فلسطین میں یہودیوں کیلئے ایک ریاست کے قیام کو مثبت نظر سے دیکھتی ہے اور اس مقصد کے حصول کیلئے اپنی پوری کوشش کرے گی ۔ تاہم یہ واضح رہے کہ فلسطین کی موجودہ آبادی کے سول اور مذہبی حقوق کیخلاف کوئی اقدام نہیں ہو گا اور نہ ہی کسی اور ملک میں یہودیوں کے حقوق اور سیاسی سٹیٹس متاثر ہو گا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس اعلامیے کو صیہونی فیڈریشن کے علم میں لائیں۔" آرتھر جیمز بالفور

اس اعلامیے کا نام برطانیہ کے ایک متمول خاندان کے فرد کیمبرج یونیورسٹی سے فارغ التحصیل برطانوی سیکریٹری خارجہ آرتھر جیمز بالفور کے نام پر پڑا جو کنزرویٹو پارٹی کے رکن تھے۔ سکاٹش خاندان سے تعلق رکھنے والے آرتھر جیمز 1902 سے 1905 تک برطانیہ کے وزیر اعظم بھی رہے اور انہوں نے ملک کی خارجہ پالیسی میں اہم خدمات سرانجام دیں۔ آرتھر جیمز بالفور کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت کو "صیہونی ایجنڈا" کی مکمل حمایت کرنی چاہیے ۔ یہ ایک سیاسی تحریک تھی جس نے 19 ویں صدی کے اختتام پر یورپ میں زور پکڑ لیا تھا اور فلسطین میں ایک یہودی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہی تھی۔ آرتھر جیمز بالفور کو اس بات کا سہرا دیا جاتا ہے کہ انہوں نے ہی برطانوی کابینہ کو اعلامیے کی حمایت پر راضی کیا۔ برطانیہ میں یہودی کمیونٹی کے بااثر رہنما لیونیل والٹر روتھس چائلڈ اور چائم ویزمین نے ان کی بھرپور مدد کی۔ چند لوگوں کا خیال ہے کہ آرتھر جیمز بالفور نے یہودیوں کی حمایت سیاسی فوائد کیلئے کی تھی۔

لیونیل روتھس چائلڈ ایک طاقتور بنکاری خاندان کے سربراہ تھا اور یہودی کمیونٹی کا بااثر رہنما بھی تھا۔ یہ امیر اور طاقتور خاندان فلسطین میں یہودیوں کی

ریاست کے قیام کیلئے سرمایہ کاری کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اسی خاندان کے ایک اور رکن، ایڈمنڈ روتھس چائلڈ نے فلسطین میں بڑی تعداد میں زمین خریدی اور 19 ویں صدی کے اختتام تک یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے میں مدد فراہم کی۔ اس زمانے میں یہ خاندان دنیا کے امیر خاندانوں میں سے ایک شمار ہوتا تھا۔ ایڈمنڈ کی جانب سے یہودیوں کی فلاح کے مقاصد کیلئے امداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کو "سینیفیکٹر" (مددگار) کا لقب دیا گیا۔ بہت بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ یہ اعلامیہ لیونیل روتھس چائلڈ کے نام کیوں لکھا گیا جبکہ اس زمانے میں برطانوی یہودی کمیونٹی کے بورڈ آف ڈپٹیز کے صدر سٹوارٹ سیموئل تھے جو ملک میں سرکاری طور پر یہودی کمیونٹی کی نمائندہ تنظیم تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں میں بھی دھڑے بندی تھی اور ایک گروہ اس ایجنڈے کی مخالفت کر رہا تھا۔ روتھس چائلڈ کے پاس کوئی سرکاری عہدہ تو نہیں تھا لیکن وہ "صیہونی ایجنڈا" کی حمایت کرنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ آرتھر جیمز بالفور سے ان کے تعلقات کی وجہ سے یہ خط ان کے نام ہی لکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دستاویز کی تحریر میں بھی روتھس چائلڈ نے حصہ لیا تاہم اس دعوے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

برطانوی حکومت کو امید تھی کہ اس اعلامیے کے بعد امریکا اور باقی دنیا میں بسنے والے یہودی پہلی عالمی جنگ میں مکمل طور پر جرمنی کے خلاف اتحادیوں کا ساتھ دیں گے۔ مؤرخین کا ماننا ہے کہ برطانیہ سمیت یہودی کمیونٹی معاشی اثر ورسوخ رکھتی تھی اور خصوصاً عالمی سرمایہ کاری میں بااثر ہونے کی وجہ سے برطانیہ کو ان کی مدد درکار تھی۔ چند ماہرین کا یہ بھی ماننا ہے کہ برطانیہ نے جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ میں اپنا اثر ورسوخ برقرار رکھنے کیلئے یہ اقدام کیا۔ اس تحریر کا مقصد جو بھی ہو، بالفور اعلامیہ نے 1948 میں اسرائیل کو جنم دیا اور خطے سے لاکھوں فلسطینیوں کو بے دخل کر دیا گیا۔

تاہم تاریخی اور زمینی حقائق اس بات کا ثبوت ہیں کہ ظلم اور جارحیت کے جتنے بھی منصوبے بنے بالآخر شکست اور رسوائی ان کا مقدر بن کر رہی۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ افغانستان میں 20 سال تک امریکا اپنے تین درجن اتحادیوں، نیٹو کی افواج اور جدید ترین اسلحے اور ٹیکنالوجی کے زور پر بدترین ظلم وستم کے بعد بدترین شکست وپسپائی کے ساتھ رخصت ہونا پڑا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ سپر پاور صرف میرے رب کی ہے۔ وہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے کہ کون اس کی محبت میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ افغانستان اس صدی میں تین سپر طاقتوں کا قبرستان بن چکا ہے۔

تاریخ اس بات کی بھی گواہ ہے کہ سب سے پہلے دنیا بھر میں برطانوی نوآبادیوں کو آزادی کی نعمت حاصل ہوئی اور اس کے بعد سوویت یونین کے بطن سے چھ مسلمان ریاستوں کا وجود عمل میں آیا اور اب ہزاروں میل دور سے آئے ہوئے ظالم جارح کو اپنے اتحادیوں سمیت چھ کھرب ڈالر کے خطیر نقصان کے ساتھ ہزاروں فوجیوں کے تابوت اندھیرے میں واپس اپنے ملک میں لیجا کر نئے قبرستان آباد کرنے پڑے۔ ارشاد فرمایا کہ: "اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ" (البروج:12) اے پیارے حبیب ﷺ بے شک تیرے رب کی پکڑ بہت سخت ہے"۔ اگرچہ یہ پکڑ کچھ عرصہ ظالموں کو مہلت دینے کے بعد ہو کیونکہ انہیں مہلت دینا عاجز ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ حکمت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اب وہ وقت دور نہیں جب کشمیر اور فلسطین بھی ظالموں سے مکمل نجات حاصل کر کے اللہ کے قرآن کی حکومت قائم کریں گے، ان شاء اللہ۔

بروز جمعۃ المبارک 27 ربیع الثانی 1445ھ 10 نومبر 2023ء

مشترکہ دشمن

دنیا امن وسلامتی کی آرزومند ہے، کم سے کم زبان سے تو سب اسی امن اور سلامتی کے دعویدار ہیں لیکن اس امن وسلامتی کی ایک شرط اور بنیاد ہے۔ جب بنیاد میسر نہ آئے، یہ شرط پوری نہ ہو تو ہماری انسانی دنیا کا امن اور سلامتی فقط ایک دعویٰ اور خالی آرزو ہی رہے گی۔ وہ شرط اور بنیاد عدل ومساوات ہے۔ جب تک عدل قائم نہ ہو اور سب کے ساتھ برابر کا سلوک نہ ہو تو امن وسلامتی کا دعویٰ جھوٹا ہے اور اس کیلئے آرزو بھی خام خیالی ہے کیونکہ امن و سلامتی سے پہلے عدل ومساوات ضروری ہے اور عدل وانصاف کے بغیر قیامِ امن ناممکن ہے۔

بدقسمتی سے دنیا میں ظلم وناانصافی اور تصادم کی فضا ہے اور سب سے یکساں سلوک مفقود ہے۔ یہ بھی عجب ستم ظریفی ہے کہ یہ ظلم اور ناانصافی صرف مسلمانوں سے روا رکھی جارہی ہے۔ ظالمانہ تصادم کی فضا کا عملی شکار بھی مسلمان ہیں اور عجیب ترین بات یہ ہے کہ اس تصادم اور ظلم وفساد کی جڑ بھی مسلمانوں کو ٹھہرایا جارہا ہے۔ مزید بدنصیبی یہ ہے کہ مسلمانوں نے یہ کیفیت چپ چاپ برداشت کرلی ہے، کم سے کم دنیا بھر کے مسلم حکمران تو بالکل چپ ہیں، اس پر احتجاج بھی نہیں کررہے جیسے کچھ دیکھتے سمجھتے نہ ہوں۔ اس المناک صورت حال کا سبب یہاں عوام اور حکمرانوں کے درمیان وسیع خلیج حائل ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہمارے حکمراں اسلام مخالف قوتوں کے رحم وکرم پر ہیں اور عالمِ اسلام ظالم لٹیروں کی زد میں ہے۔

اگر صحیح اسلامی نظام کی فضا ہوتی تو دنیا بھر کے مسلم عوام اور اسلامی دنیا کی یہ حالت نہ ہوتی۔ آج بھی اگر مسلم عوام اور ان کے حکمراں متحد ہو کر اس امتیازی سلوک کے خلاف زوردار آواز اٹھائیں تو یہ فضا بدل سکتی ہے۔ امن وسلامتی کے جھوٹے دعویدار اپنی اپنی قوم کے سامنے رسوا ہو کر بے اثر ہو سکتے ہیں کیونکہ حسنِ اتفاق سے ان کے اپنے اپنے ملک کے عوام جمہوری قوتوں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں اور یہ عوامی جمہوری قوتیں جس طرح اپنے جھوٹے حکمرانوں کو برداشت نہیں کرتیں، وہ پسماندہ قوموں سے ظلم وناانصافی اور ڈبل معیار کی بھی مخالف ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اسلامی دنیا کے عوام دنیا کے جمہوری عوام تک رسائی اور ربط کی صورت پیدا کریں تو پھر وہی ہو سکتا ہے جو عراق میں بش اور ٹونی بلیئر کے ساتھ ہوا۔

گو عراق ابھی تک مکمل آزاد نہیں ہوا لیکن عراقی عوام آزاد ہوگئے ہیں کیونکہ انہوں نے ظلم کو مسترد کردیا ہے اور ان کی اور ان کے قاتل کی حقیقی صورتحال دنیا کے جمہوری عوام تک پہنچ گئی ہے جو اپنے حکمرانوں سے حساب لے رہے ہیں۔ اگر آپ کی نظر تاریخ پر ہے تو آپ محض مسلمان ہونے کے سبب اس ظالمانہ تہمت اور تصادم سے بچ بھی سکتے ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ پر جارحانہ چڑھائی سے صلیبی جنگوں کا آغاز کس نے کیا اور کس نے کروایا؟ 400 سال تک انسانیت کا خون پانی کی طرح بہتا رہا جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، مال لوٹا گیا، ملک چھینے گئے، یہ سب سلوک مسلمانوں سے تھا اور یورپ کے صلیبیوں نے کیا تھا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگیں کس نے شروع کیں؟ پرانے سامراجیوں نے۔ آج یہ ظالمانہ تصادم کی فضا کس نے پیدا کی؟ آج کے نئے سامراجیوں نے۔ مگر یہ سب کچھ کس نے کرایا؟ مسلمانوں کے اصلی دشمن یہودیوں نے، جی ہاں! خفیہ وسیہ کاریوں میں صہیونیوں کا جواب نہیں۔

یقین نہیں آتا تو دیکھ لیجئے ہٹلر کے آنے تک مسیحی دنیا خصوصاً یورپ یہودیوں کا دشمن تھا، ان سے نفرت کرتا تھا، اپنے معاشرے سے انہیں نکال چاہتا

تھا۔ دونوں عالمی جنگوں میں اگر سود خوروں کے قرضے نہ ہوتے تو یہ جنگیں ایک باہر کرنا قدم بھی آگے نہ بڑھ سکتی تھیں۔ سودی کاروبار کس کے پاس تھا؟ انہی یہودیوں کے ہاتھ میں۔ دونوں جنگوں میں لگنے والے یہودی سرمائے نے مغرب کو پنجۂ یہود میں جکڑ دیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد آج تک ساری دنیا سود کے جال میں پھنس گئی ہے اور یہ جال یہودیوں شکاریوں کے ہاتھ میں ہے!

گزشتہ صدی کے دوران سود خوروں نے سودی پیسے سے مسلمان حکمرانوں کو خریدنا چاہا تھا مگر منہ کی کھائی، یہی پیسہ مغرب کے حکمرانوں کو جکڑنے کیلئے دیا گیا۔ پہلے یورپ کو پھر امریکا کو، چنانچہ آج سب پنجہ یہود میں ہیں لیکن یہودی وسیہ کاری ملاحظہ ہو کہ وہ انہی پرانے اور نئے سامراجیوں سے مسلمانوں کو پٹوا رہا ہے اور مسلمان سوتے رہے یا سلا دیئے گئے، آج بھی سو رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں سے یہودی عداوت اور حسد ایک فطری ردِّ عمل ہے۔ اس عداوت اور حسد کی ایک لمبی تاریخ ہے جو طویل اور تلخ بھی ہے۔ ایک وقت تھا جب مکہ اور عرب کے تمام بت پرست اور یہودی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متحد تھے، آج بھی متحد ہیں، پہلے مشرکین مکہ اور یثرب و خیبر کے یہودی اسلام کے خلاف متحد تھے۔ آج بھی تل ابیب اور نئی دہلی نے ایک مدت کے بعد ایک دوسرے کو پہچان لیا ہے۔ پہلے اتحاد خفیہ تھا لیکن ایڈوانی اور شیرون نے اسے ایک کھلی حقیقت بنا کر مسلمان دنیا کو پیغام دیا اب مودی و نیتن شیر و شکر ہیں کہ کل بھی دونوں کا دشمن مشترک تھا اور آج بھی مشترک ہے۔

اس اشتراک، عداوت اور حسد نے یہود و ہنود کو مسلمانوں کے خلاف ایک بنا رکھا ہے۔ یہود و ہنود دونوں کی خواہش ہے کہ نئے اور پرانے سامراجی انہیں تعاون کیلئے اپنے مہرے بنائیں تو خونِ مسلم میں ہاتھ رنگ کر من کو شانتی اور لوٹ مار میں سے کچھ حصہ بھی ملے مگر قدرت نے نئے سامراجیوں کو ننگا کر دیا ہے اور امریکا اور مغرب کے جمہوریت پرست عوام انہیں تاریخ کی گمنامی میں دھکیل رہے ہیں مگر یہ یہود و ہنود اب بھی نہیں بدلے۔ وہ عدل و انصاف کی ہر آواز پر تلملا اٹھتے ہیں، وہ ہر صورت میں فلسطین اور کشمیر میں کسی نہ کسی بہانے مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں۔ مسلمانوں کیلئے یہ موقع ہے کہ مغرب کے امن پسند اور انصاف کے داعی تنظیموں سے اپنا رابطہ از سرِ نو مرتب کریں۔ یہود و ہنود کو خطرہ صرف پاکستان کے ایٹمی اسلحے سے ہے۔

مودی کشمیر میں وہی کھیل کھیل رہا ہے جو اسرائیل کا جنونی دہشتگرد فلسطین میں کھیل رہا ہے۔ آزادی مانگنے والا ہر کشمیری بھارت کے نزدیک پاکستان کا ایجنٹ ہے جس کیلئے اس کی 9 لاکھ فوج مارنے میں حق بجانب ہے۔ لیکن کشمیری اب اس بات سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ اگر افغانستان جیسا ملک دنیا کی سب سے بڑی سپر طاقت اور اس کے اتحادیوں کو شکستِ فاش پر مجبور کر سکتا ہے تو بھارتی بنیا تو اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کشمیریوں نے اپنے خون کے ساتھ جو حریت کی داستانیں رقم کی ہیں اور اپنی آزادی کی خاطر جو بیش بہا قربانیاں دی ہیں، وہ کبھی رائیگاں نہیں ہو سکتیں اور وہ دن بہت قریب ہے جب کشمیری اور فلسطینی آزادی جیسی نعمت وصول کر کے رہیں گے انشاء اللہ!

بروز 2 اتوار 29 ربیع الثانی 1445ھ 12 نومبر 2023ء

ہمیں انسان سمجھو

انسانی حقوق کے چیمپئن بننے کے دعویدار تمام مغربی ممالک اوراوران سب کا باپ امریکا طاقت کے نشے میں چور بھرپور سفاکی کے ساتھ انسان دشمن اسرائیل کے ساتھ کھڑے ہیں اور غزہ کو انتہائی بہیمیت کے ساتھ بچوں، عورتوں اور عام شہریوں سمیت، ہسپتالوں اور غزہ کو کھنڈر بنادیا گیاہے۔ امریکا اوراس کے تمام اتحادیوں کا ایک ہی بیانیہ کہ اسرائیل کو اپنے دفاع کا حق حاصل ہے۔ یہ سوال کوئی نہیں اٹھارہا کہ جائز حق دار فلسطینیوں کے حقوق کیا ہیں؟ ہم اسرائیل اور فلسطین میں تشدد کا نوٹس صرف اس وقت کیوں لیتے ہیں جب فلسطینیوں کے داغے ہوئے راکٹ اسرائیل میں گر رہے ہوتے ہیں ؟ ہمیں یہ بات سمجھناہوگی کہ اگر اسرائیل کی طرف داغے جانے والے حماس کے راکٹ ناقابل قبول ہیں تو پھر آج کا یہ سنگین تنازع ان راکٹس سے پیدا نہیں ہوا۔

دور نہ جائیں، گزشتہ برس 2022ء کا سال آخری سانسیں لے رہاتھااور بین الاقوامی میڈیا کے مطابق اسرائیلی سکیورٹی فورسز کے ہاتھوں صرف مقبوضہ غربِ اردن میں 250 سے زیادہ فلسطینی ہلاک ہوگئے۔ حقوقِ انسانی کی تنظیمیں مکمل شواہد کے ساتھ اسرائیل پر طاقت کے غیر متناسب استعمال کا الزام لگاتی رہیں۔ بیت المقدس کے علاقے شیخ جراح میں کئی فلسطینی خاندان ایک مدت سے جبری نکالے جانے کے خطرے سے دوچار حالت میں جی رہے تھے۔ ایک ایسا قانونی نظام وضع کرکے نافذ کردیا گیا جس میں انہیں جبراً بے گھر کرنا ممکن بنادیا گیا۔ چند ہفتوں کے دوران انتہاپسند یہودی آباد گاروں نے ان فلسطینیوں کو بے گھر کرنے سے متعلق اپنی کوششیں تیز کردی اورالمیہ یہ کہ صدیوں سے مقیم فلسطینیوں کو ان کی زمینوں یاعلاقوں سے بے دخل کرنے کا یہ عمل سیاسی اور معاشی دباؤ کے ایک بڑے نظام کا محض ایک حصہ قرار دیکر انہیں دربدر کردیا گیا۔ ہم ایک مدت سے دریائے اردن کے مغربی کنارے اور مشرقی بیت المقدس میں اسرائیلی آباد گاروں کے قبضے اور غزہ کی اقتصادی ناکہ بندی دیکھتے آئے ہیں، جس نے فلسطینیوں کیلئے حالات کو ناقابلِ برداشت بنایاہے۔ غزہ کی آبادی کم و بیش بیس لاکھ ہے اور وہاں 70 فیصد نوجوان بے روزگار ہیں۔ ان میں مستقبل کے حوالے سے قطعاً کوئی واضح امید بھی باقی نہیں رہی۔

ساتھ ہی ساتھ ہمیشہ کی طرح ہر یہودی حکومت کو اسرائیل میں آباد فلسطینیوں کیلئے بہتر مستقبل کے امکانات کو کم سے کم کرنے اورانہیں زیادہ سے زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کرتے دیکھاہے۔ نیتن یاہو کی حکومت نے فلسطینیوں کے علاقوں پر قبضہ کرکے وہاں یہودیوں کو آباد کرنے کی پالیسی پر عمل جاری رکھااوراب دوریاستوں والا حل اب کم و بیش ناممکن ہوکر رہ گیاہے۔ ایسے قوانین وضع کیے گئے ہیں جن کے تحت اسرائیل کے یہودی اور غیر یہودی شہریوں کے درمیان بہت واضح خطِ امتیاز کھینچ گیاہے۔

کیاان تمام حقائق سے حماس کے حملوں کو جواز نہیں ملتا؟ حماس نے (مقبوضہ) بیت المقدس میں پائی جانے والی بے چینی اور بدعنوان، ناکام فلسطینی اتھارٹی کی ناکامیوں سے بھی فلسطینی نوجوانوں میں بے چینی بڑھتی جارہی ہے۔ اسرائیل میں ایک عشرے سے بھی زائد مدت میں انتہائی دائیں بازو کی حکومت کی قیادت میں عدم رواداری اور مطلق العنانیت پر مبنی نسل پرست قوم پرستی کو فروغ دینے کیلئے مجرمانہ کام کیا گیا۔ اقتدار کو طول دینے اور کرپشن پر محاسبے سے بچنے کیلئے نیتن یاہو نے اتمار بین گوِراور اس کی انتہاپسند جیوئش پاور پارٹی کو جائز حیثیت دینے کی بھرپور کوشش کی۔ انہیں حکومت

کا حصہ بنایا گیا۔ یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ جن نسل پرستوں نے (مقبوضہ) بیت المقدس کی سڑکوں پر ٹولوں کی شکل میں فلسطینیوں کو قتل کیا وہ آج اسرائیل کی پارلیمان میں بیٹھے ہیں۔ یہ خطرناک رجحانات اسرائیل کے حوالے سے کسی بھی طور منفرد یا حیرت انگیز نہیں۔ یورپ ،ایشیا، جنوبی امریکا اور امریکا میں، مطلق العنان قومی تحریکوں کو تیزی سے ابھرنے اور مقبولیت پانے کی تاریخ سے کسی نہیں کچھ نہیں سیکھا۔ یہ تحریکیں بہت سوں کیلئے خوشحالی، انصاف اور امن یقینی بنانے کی کوشش کرنے کے بجائے نسلی اور لسانی بنیاد پر پائی جانے والی نفرت کو بروئے کار لاکر چند ایک کیلئے اقتدار اور کرپشن کی راہ ہموار کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان دنوں سیاسی کارکنوں کی ایک ایسی نسل بھی ابھرتی دیکھ رہے ہیں جو انسانی ضرورتوں اور سیاسی مساوات کی بنیاد پر معاشروں کی تعمیر چاہتی ہیں۔ جس کی ایک مثال امریکا کی سڑکوں پر جارج فلائڈ کے قتل کے بعد ایسے بہت سے کارکنوں کو احتجاج کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ اب یہ کارکن ہمیں اسرائیل اور فلسطینی علاقوں میں بھی دکھائی دے رہے ہیں۔

جو بائیڈن سے اقوام عالم کو یہ توقع تھی کہ دنیا کے حوالے سے انصاف اور جمہوریت پر مبنی طرزِ فکر و عمل اپنایا جائے گا۔ سیاسی معاملات اور مظلوم اقوام کو انصاف دلانے کیلئے امریکا سے ہر محاذ پر کلیدی اور قائدانہ کردار ادا کرنے کی توقعات تھیں۔ امریکا سے تنازعات کے خاتمے کی راہ ہموار کرتے ہوئے اشتراکِ عمل اور معاونت کی راہ ہموار کرنے کی امید تھی لیکن حالیہ فلسطین اور اسرائیل کے معاملے میں ان کے بیانات اور واضح جارحانہ عمل نے بڑا مایوس کیا ہے۔ امریکا اسرائیل کو ہر سال چار ارب ڈالر کی امداد دیتا ہے۔ ایسے میں نیتن یاہو کی انتہا پسند حکومت اور اس کے غیر جمہوری اور نسل پرستانہ اقدامات کے حوالے سے جو بائیڈن کو ایسا کردار ادا کرنے کی ضرورت تھی جو تاریخ میں ان کا نام روشن کرنے میں معاون ہوتی لیکن ان کے حالیہ کردار نے انسانیت کے منہ پر جو کالک مل دی ہے، اس نے تو ہلاکو اور چنگیز خان کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ اس ظالمانہ رویہ کو فوری ختم کرکے اپنا راستہ تبدیل کرکے برابری کے اصول پر مبنی طرزِ فکر و عمل اپنانی چاہیے، جو اقوام عالم کے مظلوم عوام کے تحفظ سے متعلق بین الاقوامی قانون کو بالادست اور مضبوط کرتی ہو اور ساتھ ہی ساتھ امریکی قانون کو بھی بالادستی عطا کرتی ہو جس کے تحت امریکی فوجی امداد کسی بھی حالت میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مرتکب معاشروں کو نہیں ملنی چاہیے۔

نئی اپروچ یہ ہونی چاہیے کہ جس طور اسرائیل کو سلامتی کے ساتھ اور سکون کی حالت میں رہنے کا حق حاصل ہے بالکل اسی طور فلسطینیوں کو بھی محفوظ اور خوش حال زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں اس بات پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کو بہتر مستقبل کی تیاری میں مدد دینے کے حوالے سے امریکا بہت اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ اگر امریکا عالمی سطح پر بنیادی حقوق کے حوالے سے توانا آواز بننا چاہتا ہے تو ہمیں انسانی حقوق پر بین الاقوامی معیارات کی بالادستی ہر حال میں یقینی بنانی چاہیے، چاہے ایسا کرنا سیاسی اعتبار سے کتنا ہی مشکل ہو۔ ہمیں محسوس کرنا ہوگا کہ فلسطینیوں کے حقوق اور ان کی زندگیوں کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی اسرائیلیوں کے حقوق اور زندگی کی اور انہیں بھی انسان سمجھ کر جینے کا پورا حق ملنا چاہئے۔

بروز منگل 2 جمادی الاول 1445ھ 14 نومبر 2023ء

"ہاؤس فل"۔۔۔۔۔ الامان الحفیظ!!!

پچھلے ایک ماہ سے زائد حماس کی پر عزم جوانیاں دنیا بھر کی شیاطین قوتوں کے ساتھ میدان جنگ میں قربانیوں کی ایک فقید المثال ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ لوہے کا چنا بن کر مقابلہ کر رہی ہیں جبکہ عالمی میڈیا کے سامنے خود اسرائیلی کمانڈر کا ایک رات میں ڈھائی ہزار سے زائد مرتبہ حملوں کا اعتراف بھی انسانی حقوق کے چیمپئنز کیلئے جہاں کئی خوف کے آثار پیدا کر رہا ہے وہاں انہی ملکوں کے عوام کا اسرائیل اور اپنی حکومتوں سے نفرین کا درجہ دن بدن بڑھ رہا ہے۔ اسرائیلی وزیر کی فلسطینیوں پر ایٹم بم گرانے کی دھمکی اور بعد ازاں اسے فوری مکر جانے کے بیان کو عالمی میڈیا نے جس مکاری سے گول کیا، اقوام عالم کے دردمندوں کی تشویش میں اضافہ کا موجب بن گیا ہے۔ اگر ایسا بیان کسی مسلم ملک کی طرف سے ہوتا تو اب تک نیا جنگی محاذ کھل چکا ہوتا لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ مسلم امہ کا حقیقی تصور ہمارے حکمرانوں کے ضمیر کی طرح کب کا مر چکا ہے۔

ایک ماہ سے زائد حماس کو میدان جنگ کے پہلے ہی دن سے اسرائیل کی وحشیانہ بمباری نے غزہ کو کھنڈرات میں بدل کر رکھ دیا ہے اور اسرائیلی جنونی اور اس کے ہمنوا اب بھی حماس کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا اعلان کر رہے ہیں۔ یہ متکبر شیاطین آخر تاریخ سے کیوں سبق حاصل نہیں کرتے کہ ایسے دعوے وہ درجنوں مرتبہ کر چکے ہیں لیکن جواب میں بالآخر رسوائی ہی ان کے حصے میں آئی۔ امریکا نے پچھلی چار دہائیوں میں 39 ممالک میں جارحیت کا ارتکاب کیا، ظلم و ستم میں کوئی کسر نہ چھوڑی، تورا بورا پر منی ایٹم بم برسانے کے علاوہ تمام بموں کی "ماں" جیسا بم گرا کر بھی بالآخر فرار ہونا پڑا۔ اپنے فوجیوں کے کئی نئے قبرستان کی گواہی سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کیا، اب تو یوں لگتا ہے کہ ظلم کی تمام حدیں عبور کرنے والی ان شیاطین قوتوں کیلئے کوئی ایسا نیا رذیل اور رسوا کن عذاب آنے والا ہے جو صدیوں تک تاریخ میں رقم رہے گا جیسے ہزاروں سال گزرنے کے بعد فراعین، شداد اور قوم نوح پر آنے والوں کا تذکرہ موجود ہے۔

اسرائیل ہر روز غزہ پر اپنے حملوں کی تعداد میں جہاں اضافہ کر رہا ہے وہاں گزہ کی اس چھوٹی سی پٹی پر زمینی حملہ کرنے گریز کیوں کر رہا ہے۔ اسرائیلی اور اس کے جنگی ہمنوا اس بات پر پریشان ہیں کہ غزہ پٹی میں حماس کی سرنگوں کے نظام کو مکمل تباہ اور ہر ایک انچ پر بدترین فاسفورس بمباری کے باوجود اسرائیلی ٹینکوں کی زمینی پیش رفت پر ایسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ کئی ٹینکوں کی تباہی کے مناظر ساری دنیا نے دیکھ لئے ہیں۔ غزہ کی پٹی کے شمالی علاقے اور حماس کے کمپاؤنڈ کو نشانہ بنایا گیا اور بعد ازاں اسرائیل کی جانب سے دعویٰ کیا گیا کہ اسرائیلی افواج نے ٹینکوں کے ذریعے حماس کی ایک پوسٹ کو بھی نشانہ بنایا۔ فلسطینی سکیورٹی حکام نے ایک خبر رساں ایجنسی کو اسرائیلی حملے کی اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ اسرائیلی جنگی طیاروں نے آدھی رات کو ایک مرتبہ پھر جارحیت کا آغاز کرتے ہوئے غزہ کی پٹی کو نشانہ بنایا۔ اس دوران بیس میزائل داغے گئے جنہوں نے خان یونس کے مغرب میں قدسیہ کی جگہ کو نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ ایک ٹریننگ کیمپ کو بھی اس حملے کے دوران نشانہ بنایا ہے۔

غزہ کی آبادی تقریباً 20 لاکھ افراد پر مشتمل ہے اور اس علاقے کی لمبائی 41 کلومیٹر جبکہ چوڑائی 10 کلومیٹر ہے۔ اس کی اطراف بحیرہ روم، اسرائیل اور مصر سے منسلک ہیں۔ غزہ اور اسرائیل کے مابین حالیہ کشیدگی کئی برسوں میں ہونے والا بدترین تشدد کا راستہ ایک مرتبہ پھر کھلنے کا شدید اندیشہ لاحق ہو گیا ہے جس نے اقوام متحدہ کو "بڑے پیمانے پر جنگ" کی وارننگ دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس سے قبل 1967 کی مشرق وسطیٰ کی جنگ کے دوران اسرائیل نے ماضی میں مصر کے زیر قبضہ غزہ پر قبضہ کر لیا تھا تاہم 2005 میں اسرائیل نے اپنی فوج اور تقریباً 7000 کے قریب آبادکاروں کو یہاں سے

نکال لیا تھا۔ یہ علاقہ حماس کے زیر کنٹرول ہے جس نے 2007 کے پر تشدد فسادات کے بعد اس وقت کی گورننگ فلسطینی اتھارٹی (پی اے) کی وفادار قوتوں کو یہاں سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد سے اسرائیل اور مصر نے فلسطینیوں کے خلاف حفاظتی اقدامات کے نام پر غزہ سے سامان اور لوگوں کی آمد و رفت پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔

2014 میں حماس اور اسرائیل کے درمیان اسرائیلی جارحیت کے خلاف جھڑپیں ہوئی جبکہ مئی 2021 میں اس معاملے نے پھر سر اٹھایا تھا جس کے نتائج میں پہلی مرتبہ اسرائیل کو حماس کی قوت کا اندازہ ہوا کہ اس بے سر و سامانی میں بھی انہوں نے مقابلے کیلئے اپنی شہادتوں کے لامتناہی سلسلے کے ساتھ ساتھ اپنے خون کے آخری قطرے کو بہانے کے عزم کو ایک نیا موڑ دے دیا ہے جہاں اسرائیل کو آسانی سے قبضہ کرنے کی بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔

ایک مرتبہ پھر غزہ میں ظلم کی تمام حدیں عبور ہو گئی ہیں اور عالمی میڈیا نے ایک سازش کے تحت اس مرتبہ ان خبروں کا مکمل بلیک آؤٹ کر رکھا ہے۔
اس میں اچنبھے کی کوئی بات بھی نہیں کیونکہ اہل فلسطین اپنے مسلمان اور اسرائیل کے پڑوسی ہونے کی قیمت پچھلی کئی دہائیوں سے چکا رہے ہیں۔
یہودیوں کی تاریخ ہے کہ وہ اپنے وجود کی قیمت گردو پیش سے وصول کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ بنی اسرائیل سے عہد نبوی تک جاری رہا ہے۔ جدید دنیا میں جرمنی کا نسل پرست قائد راڈولف ہٹلر وہ شخص تھا جس نے یہودیوں کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کی۔ فلسطینی مسلمانوں کی بد قسمتی کا سفر تو اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب فتنہ پروری کی تاریخ رکھنے والی اس دربدر قوم کے سر چھپانے کیلئے ان کی سرزمین کا انتخاب ہوا تھا۔ ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کے قتل عام کا افسانہ جسے "ہولوکاسٹ" کا نام دیا گیا، دراصل میڈیا وار ہی تو تھی اور اس کا تعلق یہودیوں کیلئے ایک الگ مملکت کے قیام کی ضرورت سے تھا کیونکہ صہیونی اکابرین نے اپنے لئے ایک الگ وطن کی حمائت میں اس دلیل کا سہارا لیا تھا کہ انہیں ایک اور "ہولوکاسٹ" کا شدید خطرہ ہے، جس سے بچنے کیلئے یہودیوں کو ایک محفوظ شیلٹر، ایک پناہ گاہ درکار ہے۔ اس وقت کی عالمی طاقتوں نے یہودیوں کو ایک محفوظ شیلٹر فراہم کرنے کیلئے اسرائیل کے نام سے عین عالم اسلام کے قلب میں خنجر گھونپنے کا فیصلہ کیا حالانکہ مغربی و مشرقی یورپ میں بے شمار ایسے علاقے تھے جہاں یہودیوں کی اس "نایاب نسل" کو بچانے کیلئے محفوظ شیلٹر قائم کئے جا سکتے تھے۔

یوں یہودیوں نے مظلومیت کے لبادے میں جس سفر کا آغاز کیا..... طاقت، اختیار، وسائل اور الگ وطن ملنے کے ساتھ ہی وہ ظلم کی بدترین شکل اختیار کر گیا اور ہٹلر کے مظلوم و مقتول خود ہٹلر کی طرح ظالم اور قاتل بن بیٹھے۔ انہوں نے کمال چالاکی سے اپنے مقدر کی دربدری، بے وطنی، آہوں اور سسکیوں کی لکیر فلسطینی کے ہاتھوں پر کھینچ دی۔ اس وقت سے آج تک فلسطین کا ہر شہر غزہ ہے، اسرائیل کے ہر غصے کا انجام ایک "ہولوکاسٹ" پر ہوتا ہے۔ اسرائیل تو جو کر رہا ہے، اپنے فتنہ پرور مزاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر کر رہا ہے اور اپنی تاریخ دہرا رہا ہے، لیکن مسلم دنیا کیا کر رہی ہے؟
عرب دنیا کہاں ہے؟ جو پہلے چند جلوس نکال کر، غزہ کے لوگوں کیلئے دواؤں اور دودھ کیلئے اپنی بے پناہ دولت سے زکوۃ کے چند درہم و دینار وقف کر کے تاریخ کا قرض چکانے کی کوشش کرتی تھی، اب تو یہ سلسلہ بھی مکمل طور پر بند ہو گیا ہے۔

آج سے 14 سال قبل عین اس وقت جب غزہ میں اسرائیل انسانیت کا دامن تار تار کر رہا تھا، سرد جنگ میں مضمحل اور گھائل ہونے والے روس کو کیا سوجھی کہ اس نے چند دن کیلئے یورپ کو گیس کی سپلائی روک دی۔ گیس پائپ لائینوں کے بے رونق ہوتے ہی یورپ کی رنگین دنیا اجڑنے لگی

اوراس کے سارے رنگ ماند اور ساری روشنیاں ٹمٹمانے لگیں۔ کئی ملکوں میں صنعت کا پہیہ رک گیا اور حکومتوں کو ایمر جنسی نافذ کرنا پڑی۔ اس سے جہاں یورپ کی چیخیں نکل گئیں وہیں مسلمانوں کی بے توقیری اور بیچارگی کا مذاق بھی اڑ گیا کہ جو دنیا میں تیل پیدا کرنے والے علاقے پر کنٹرول رکھتے ہیں، لیکن اس دولت کو ڈالروں میں بدلنے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اس دنیا میں عزت اور عروج حاصل کرنے کیلئے، حد تو یہ کہ عالمی نظام میں ایک باوقار حیثیت حاصل کرنے کیلئے استعمال کرنے کی قدرت بھی نہیں رکھتے حالانکہ نیویارک کے مجسمہ آزادی کے گرد رنگوں کی بہار اور لندن آکسفورڈ سٹریٹ کی روشنیوں کی قطار تک مغربی اور یورپی دنیا میں اس سیال دولت کا بنیادی حصہ ہے جو ارض فلسطین کے دائیں بائیں پانی کی طرح بہہ رہی ہے۔ یہ ایک ایسی تلوار ہے جسے عرب دنیا چاٹ رہی ہے اور وہ اس بات سے مکمل بے خبر ہے کہ اس کے ہاتھ میں تلوار در حقیقت ایک ہتھیار بھی تھی جسے اب کند کر کے زنگ آلود کر دیا گیا ہے۔

سعودی فرماں رواشاہ فیصل مرحوم عرب دنیا کے وہ واحد قائد تھے جن پر یہ حقیقت آشکارہ ہوئی تھی لیکن پھر کیا ہوا، یہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اپنی طاقت کا ادراک تو درکنار، فلسطین کے ہمسائے اپنی خاموشی، غور کرنے اور تشویش کا اظہار کرنے کی طاقت کو سلب ہوتے دیکھ کر اب آپس میں بے سود تبادلہ خیال کر کے اسرائیل کو اکاموڈیٹ کر رہے ہیں۔ ظلم کی حد تو یہ ہے کہ نہ صرف یہ ہمسائے اسرائیل کے ساتھ کئے گئے معاہدوں کی پابندی کرتے ہوئے بدترین ناکہ بندی پر عمل کر رہے ہیں بلکہ اپنی زمین اور فضاؤں کو بھی غزہ پر حملوں کے استعمال کی اجازت دے رکھی ہے اور نجانے یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ فلسطینی حریت پسندوں کے ایک اخبار نے اس صورتحال میں ماضی میں فلسطین کی آزادی کی جدوجہد کرنے والی تنظیم الفتح کے موجودہ کردار پر تنقید کرتے ہوئے اسے "بیت ندامت" قرار دیا تھا لیکن اس وقت کی مسلم دنیا، او آئی سی، اور عرب لیگ کیلئے اس سے خوبصورت نام شاید ہی کوئی اور ہو، المیہ یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں نے اپنی مصلحت کوشی، لاچارگی، اور اپنے تاج و تخت کی خاطر جبر ناروا سے قدم قدم پر مفاہمت کی روش کی بناء پر ایک ارب سے زائد مسلمانوں کو "بیت ندامت کا مکیں" بنا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے ذلت طاری ہونا کوئی انہونی بات نہیں، لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے ذلت کے عملی عذاب کی تصویر ہو تا آج کا عالم اسلام موجودہ مسلم حکمرانوں کی وجہ سے بنا ہوا ہے۔

اسرائیل کے جنگی طیارے اور اپاچی ہیلی کاپٹر دن رات غزہ کو مزید کھنڈر اور مقتل بنائے ہوئے ہیں، تو اس کا مقصد غزہ کے ڈیڑھ ملین عوام کو خوفزدہ کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد اسرائیل کے ہمسایہ عرب ملکوں، ایران اور ایٹمی ملک پاکستان پر دھاک بٹھانا بھی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اسرائیل کی سیادت کیلئے چیلنج بننے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ غزہ ایک عظیم انسانی المیے اور یہودی نازی ازم کے دور کا سامنا کر رہا ہے، لیکن یادِ علاقائی قیادت و ماضی کا مسلمان ملکوں کی تشویش، غور وخوض، اجلاسوں، بالمشافہ ملاقاتوں، ٹیلیفونک گفت وشنید کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتے ہوئے اب دم توڑ چکا ہے ۔ برطانوی خبر رساں ادارے "رائٹر" کا عیسائی نامہ نگار اجڑے اور کھنڈر غزہ کی اداس صبحوں اور بے کیف شاموں کا احوال رقم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ غزہ کے قبرستان اب ایک عرصہ دراز سے "ہاؤس فل" کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ وہاں کسی نئے مہمان کیلئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی، الّا یہ کہ پہلے سے آسودہ خاک کوئی مردہ اپنی لحد میں کسی نئے مہمان کیلئے کوئی جگہ چھوڑ دے، اور غزہ کے سب سے پرانے اور سب سے بڑے شیخ رضوان قبرستان کے ساتھ ساتھ تمام قبرستانوں میں ایسا ہو رہا ہے۔

اسرائیل کی بمباری سے شہید ایک نوجوان کے لواحقین اس کی لاش کو لیکر ہر قبرستان میں مارے مارے پھرے مگر کوئی خالی جگہ نہیں ملی۔ بے بسی کے ان لمحوں میں ایک شخص کو خیال آیا کہ کیوں نہ اس نوجوان کو دو برس قبل ایک مظاہرے میں شہید ہونے والے اس کے چچازاد بھائی کی قبر میں ہی دفن کیا جائے اور پھر یہی ہوا، اس جواں سال خون آلود لاشے کو چند برس قبل شہید ہونے والے کی قبر میں اتار دیا گیا اور اب کئی سالوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ کہانی سناتے ہوئے یہ عیسائی نامہ نگار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اور کہنے لگا کہ میں بتا نہیں سکتا کہ میں آج کس قدر اداس ہوں۔

غزہ میں اسکول، ہسپتال، مساجد، گھر اور اقوام متحدہ کے شیلٹر ہی تباہ نہیں ہو رہے، تادیر اور نسلوں تک قائم رہنے والے المیوں کے دائرے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ بچوں کا المیہ جو ڈیڑھ ملین آبادی کا نصف ہیں، عورتوں کا المیہ جو جواں سال ہیں اور ان کے ہمسفر شہادت کی وادیوں اور اجل کی راہوں میں گم ہو چکے ہیں، اور پھر شہادت کے احترام میں غزہ کی یہ مقامی روایت کہ شہید کی بیوہ شادی کرنے کی بجائے شہید کی میراث اور نشانی جو کسی بچے کی شکل میں ہوتی ہے، کی تعلیم و تربیت میں عمر بتا دیتی ہے، اور اگر کسی کے پاس یہ نہ ہو تو وہ شہید کی یاد اور شہادت کے احساس برتری کو اپنے پیروں کی زنجیر اور گلے کا ہار بنا دیتی ہے۔ غزہ کی تباہی کے بعد فلسطین کے ہمسایوں کو اپنی اس بے پناہ دولت سے جو امریکا اور مغرب کے بینکوں میں استعمار کے زیر استعمال ہو رہی ہے بلکہ انہی کی تباہ کاریوں میں استعمال ہو رہی ہے، ان کو چاہئے تھا کہ انہیں گھروں ہسپتالوں، اسکولوں اور مساجد کی تعمیر نو میں استعمال کریں لیکن یہ تو اپنے ہاں اسرائیلی یہودیوں کی محبت میں ان کے "کوشر ریسٹورنٹس" اور ان کی مذہبی عبات گاہوں کی تعمیر میں صرف کر کے اللہ کے غضب کو دعوت دے رہے ہیں۔

قصر سفید کے فراعین کو جہاں ہر سال غزہ کے شہداء کا تحفہ دیا جاتا ہے، اب وہاں عالم اسلام بالخصوص پڑوسی عرب ممالک کو اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بعد ہمیشہ کیلئے نہ صرف خاموش کر دیا گیا ہے بلکہ ان کو برملا باور کرا دیا گیا ہے کہ اپنے اقتدار کی سلامتی کیلئے امریکا کی قدم بوسی کے بغیر چارہ کار نہیں ہے اور اسی اقتدار کی خواہش نے ملی اہمیت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ قصر سفید کے مکیں نے اب اسرائیل کو عالم اسلام کے اس ندامت کے گھر کا پتہ بھی اپنے غلاموں کی فہرست کے ساتھ فراہم کر دیا ہے کہ اسرائیل کو ان عربوں کے ساتھ سفارتی تعلقات کی کامیابی کے بعد "گریٹر اسرائیل" کے منصوبے میں حائل دیگر رکاوٹیں بھی جلد دور کر دی جائیں گی۔

لیکن میرا غم تو یہ ہے کہ انسانی المیوں کی اس زنجیر کا کیا ہو گا جسے ان کی خاموشی نے دائرہ در دائرہ، حلقہ در حلقہ ایک خوفناک انتقام کی آگ کی وادی میں دھکیل دیا ہے جس کے خوفناک اثرات آنے والے وقتوں میں ظاہر ہونا شروع ہوں گے۔ باقی رہا اسرائیل، تو وہ اپنے ظلم کا بیج بو کر غزہ اور فلسطین میں ہی نہیں، عالم عرب میں ردِّ عمل کی فصل کاٹنے کا ساماں کر رہا ہے۔ اسامہ جیسے کردار انہی مظاہر سے پیدا ہوتے ہیں اور انہی سے آکسیجن حاصل کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مستقبل کے کسی اسامہ کو پاکستان کے پہاڑوں اور افغانستان کے جنگلوں کی حاجت نہیں ہو گی بلکہ غزہ کے کھنڈروں، خون میں لتھڑے جسموں، بازوؤں پر سجے اور سینے سے لگے معصوم لاشوں اور بین کرتی عورتوں کے آنسوؤں میں ان کا جم غفیر ایک سیلاب کی طرح نمودار ہو گا اور یقیناً وہ وقت اپنا انتقام انہی امریکی و صہیونی غلاموں جیسی جنس سے شروع ہو گا اور ہر کوئی پکار اٹھے گا الامان الحفیظ!!!

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بروز بدھ 3 جمادی الاول 1445ھ 15 نومبر 2023ء

موت کا رقصِ بسمل

ایسا ہوتا آرہا ہے کہ سب فلسفے دھرے رہ جاتے ہیں، دلیلیں منہ تکتی رہ جاتی ہیں، پند و نصائح بے اثر ہو جاتے ہیں، زور خطابت دم توڑ دیتا ہے، اہل منبر و محراب دنگ رہ جاتے ہیں..... جبے، عمامے اپنی شان و شوکت کھو بیٹھتے ہیں، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگتے ہیں، زمین تھر تھرانے لگتی ہے، ساری حکمتیں ناکارہ اور سارے منصوبے نابود ہو جاتے ہیں، ذلیل دنیا کے چاہنے والے دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، اہل حشمت و شوکت منہ چھپانے لگتے ہیں، محلات بھوت بنگلے بن جاتے ہیں، منظر بدل جاتا ہے، موسم بدلنے لگتا ہے، آسمان حیرانی سے تکتا ہے، شجر میں بیٹھے ہوئے پرندے اور جنگل میں رہنے والے درندے راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ جب دیوانے رقص کرتے ہیں، جنوں اپنے گریباں کا علم بن کر نکل پڑتا ہے، پھر عقل خود پر شرمندہ ہوتی ہے، جب عشق اپنی جولانی پر آتا ہے، نعرہ مستانہ بلند سے بلند تر اور رقص بسمل تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے، جب موت کی تلاش میں نکلتی ہے زندگی۔ سب کچھ ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے لیکن..... لیکن ہمیں نظر نہیں آتا، آئے بھی کیسے! ان دیدوں میں بینائی کہاں ہے، روشنی کہاں ہے؟ روشنی اور بینائی تو اندر سے پھوٹتی ہے، جی..... اندر سے، دل سے..... اور جسے ہم دل سمجھ بیٹھے ہیں، وہ تو صرف خون سپلائی کرنے کا ایک پمپ بن کر رہ گیا ہے، دل کہاں ہے؟ نہیں یہ دل نہیں ہے بس ایک آلہ ہے۔ جن کے دل دھڑکتے ہیں وہ زمانے سے آگے چلتے ہیں۔ نعرہ مستانہ لگاتے، سر بکف میدان میں اترتے ہیں۔ موت کو للکارتے ہیں اور موت ان سے خائف ہو کر کہیں چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ دیوانے اور پاگل لوگ موت کو موت کے گھاٹ اتارنے نکلتے ہیں اور یہ زندہ جاوید لوگ پھر جا کر زندہ جاوید ہو جاتے ہیں!

پھر میرا رب جلال میں آتا ہے اور حکم دیتا ہے" وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿154﴾ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿155﴾ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿156﴾

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مُردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا، اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے"۔ (سورۃ البقرہ: 154-156)

یہ ہیں زندہ جاوید اور امر لوگ، جنہیں رب بھی مردہ کہنے سے منع کرتا ہے، وہ تو کہتا ہے کہ ایسا خیال بھی دل میں مت لاؤ، خبردار جو ایسا سوچا بھی! زندہ ہیں، امر ہیں، رزق پاتے ہیں، زندہ جاوید لوگ..... امر لوگ، رب کے حضور اپنی نذر پوری کر دینے والے، اپنا عہد نبھانے والے، صلہ و ستائش سے بے پرواہ لوگ، پاگل و دیوانے لوگ۔ کہاں نہیں برپا یہ معرکہ عشق و محبت؟ کہاں نہیں برپا؟ روئے ارض پر چاروں طرف سجا ہوا ہے یہ میلہ..... اور میلہ لوٹنے والے دیوانے، ہم صرف تماشائی، نوحہ گر اور مرثیہ خواں۔ اب گنواؤں تو تکرار ہو گی اور طبع نازک پر گراں گزرے گا۔ یہ تو سامنے برپا ہے معرکہ عشق۔ کیا یہ غزہ میں نہیں دیکھ رہے آپ، مسلسل جل رہا ہے، ہر جگہ اپنے کمیں گاہوں سے تیر برس رہے ہیں، لیکن یہ پھر بھی پروانہ وار اپنی جانوں کو سر بازار لٹاتے جا رہے ہیں۔

انہیں کہتے ہیں انسان، بندہ رب، سب کا انکار کر دینے والے پر اسرار بندے، موت کو سینے سے لگا کر زندہ جاوید ہو جانے والے، اپنا خون اپنی جان، اپنے پیارے رب کی نذر کر دینے والے قافلہ حسین کے لوگ! اہل غزہ! تم پر سلام ہو، تم نے اطاعت کی ایک مثال قائم کر دی، یہ ہے اطاعت رب میں جاں سے گزرنا، تم نے ثابت کر دیا تم ہو بندگاں خدا..... اہل غزہ تم پر سلام ہو، ہم سب دیکھتے رہ گئے اور تم اپنی مراد پا گئے، اے بامراد لوگو! تم پر سلام ہو، اے خوش نصیب لوگو! تم پر سلام ہو۔ اے اس دنیائے ناپائیدار کو ٹھوکر مارنے والو! تم پر سلام ہو، آنکھیں کھولو..... آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والو! آنکھیں کھولو، یہ دیکھو دل کش منظر، سونگھو اس خوشبو کو، جو خوشبوئے شہداء ہے۔ دیکھو یہ ہے زندگی..... زندگی..... سب کا انکار، کوئی نہیں روک سکتا اس قافلہ حق کو۔ اقوام متحدہ، او آئی سی اور انسانیت کے علمبرداروں اور سامراج کے ایجنٹ لکھاریوں کے منہ پر تھوک دینے والو! تم پر سلام ہو۔

کچھ عقل سے عاری تمہاری ان قربانیوں کو پہچان نہیں پائے کہ اللہ نے ان سے دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی ہے۔ "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۘ اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ (البقرہ:7۔8)۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۙ ن، قسم ہے قلم کی اور اس کی جو کچھ کہ وہ (فرشتے) لکھتے ہیں۔

حالانکہ اللہ نے تو قلم کی بھی قسم کھائی ہے۔۔۔ لیکن شائد وہ اس قلم کی حرمت سے ابھی واقف نہیں۔ وہ اس بات کو لکھنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ تمہاری قربانی محض ضائع ہو گئی لیکن کمال آفریں ہے تم پر کہ تم ایسے لکھاریوں کو خاطر میں نہیں لائے!

کیا آپ جانتے ہیں، کبھی سوچا ہے، ہاتھی گھاس کا گٹھا اپنی سونڈ میں پکڑ کر جھٹکتا کیوں ہے؟ اس لئے کہ کہیں اس گھاس میں چیونٹی نہ ہو۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ چیونٹی کو نگل لے تو وہ اس کے دماغ میں جا کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنا ننھا سا پاؤں مارتی رہتی ہے اور بالآخر ہاتھی دم توڑ دیتا ہے۔ غزہ کے شیروں کو سفاک اسرائیل اور اس کے اتحادی چیونٹی سمجھ کر مسلنا چاہتے ہیں لیکن یہ چیونٹی ان کے ہاتھی جیسے جثے کو نابود کر دے گی۔ ہاں! یہ بات اب ان کو سمجھ آ گئی ہے، ہمیں اب تک سمجھ نہیں آئی۔ مزاحمت ہی میں ہے زندگی..... باوقار و قابل رشک زندگی۔

خان یونس غزہ کا باسی محمود اپنے سات ماہ کے شیر خوار بچے کو اپنے سینے سے الگ کر کے جب لحد میں اتار رہا تھا تو تکبیر بلند کرتے ہوئے اپنے رب سے کہہ رہا تھا کہ یہ آخری پونجی تھی جو تیرے راستے میں قربان ہو گئی۔ تیری دی ہوئی نعمت سے سات ماہ استفادہ کیا اور اے میرے رب اس کو میرا زادِ راہ بنا دے۔ غزہ کی 80 سالہ بوڑھی فاطمہ اس بات پر فخر کر رہی ہے کہ میں نے اپنے خاندان کے تمام افراد راستے کے کانٹے چننے کیلئے رخصت کر دیئے اور میں بھی اب تیری ملاقات کیلئے بے تاب ہوں۔ عبداللہ اپنے بچوں کو ہر روز رات کو یہ کہانی سناتا ہے کہ ہم مرنے والے نہیں ہیں، ایک عارضی زندگی کے چنگل سے نکل کر دائمی اور کامیاب زندگی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ جب بھی میرے گھر کے ارد گرد کوئی گولی چلتی ہے، میں ناچنا شروع کر دیتا ہوں۔ میری ایک ہی بچی جو غزہ میں جاری تباہ کاریوں سے ابھی تک بچی ہوئی ہے، وہ بھی اس کو ایک کھیل تماشہ سمجھ کر لطف اندوز ہوتی ہے۔ موت کو کھیل تماشہ سمجھنے والو! تم پر سلام ہو۔ تم نے اپنے عزم سے ثابت کر دیا کہ تمہارے پائے استقلال میں کوئی جنبش نہیں آئی۔ تم آج بھی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح سامنے کھڑے موت کا مسکراتے ہوئے انتظار کر رہے ہو۔ اس گھڑی جب سب کو حاضر ہونا ہے، تم بھی اپنے خون آغشتہ لاشوں سے حاضر کئے

جاؤ گے تمہاری فلاح اور کامیابی کا اعلان جب فرشتے با آواز بلند کریں گے لیکن تمہارے قاتل کو میڈل سے نوازنے والے آخرت میں تم سے منہ چھپاتے پھریں گے۔رَبَّنَآاِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوۡمٍ لَّارَیۡبَ فِیۡہِ ؕاِنَّ اللّٰہَ لَایُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ﴿العمران:9﴾
پرور دگار!تُو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے، جس کے آنے میں کوئی شبہہ نہیں۔ تُو ہرگز اپنے وعدے سے ٹلنے والا نہیں ہے!

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لئے ہے

اے دنیا کے اسیرو!دنیائے ذلیل کی چاہت میں خوار ہونے والو!اے ستاون ریاستوں کے مردود حکمرانو، بے غیرتی کے مجسم پتھروں، دیکھو یہ ہے زندگی۔ اہل غزہ!تم پر سلام ہو۔ وہ دیکھو شہداء کے خون سے پھوٹنے والی سحر۔ دیکھو، آنکھیں چرانے سے یہ انقلاب نہیں رکتا۔ اپنے محلات بچانے کی آخری کوشش کرلو...... نہیں بچیں گے یہ!رب کعبہ کی قسم، کچھ بھی نہیں بچے گا۔

دنیا کی سب سے بڑی جیل میں رہنے والو!تم پر سلام ہو۔ اے دنیا کے پرستارو!بچاسکتے ہو تو بچالو۔ کچھ نہیں بچے گا کوئی بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا جو حیی قیوم ہے۔

بستیوں کو مری روندتا کون ہے؟
ان دنوں اس زمیں پر خدا کون ہے؟
بے توازن سی ہے کیوں یہ دنیا بہت
کون محور ہے اب، دائرہ کون ہے؟
روز ملتی ہے بس سانحوں کی خبر
کچھ کھلے تو، پس سانحہ کون ہے؟
جبر کی سلطنت کی حدیں ہیں کہاں
اس حکومت کا فرماں روا کون ہے؟
ہم کو لازم ہے اپنے کئے کی سزا
پر یہ انجام سے ماورا کون ہے؟
روشنی بانٹنے کے بہانے یہاں
آگ دہلیز پر رکھ رہا کون ہے؟
جیسے میرا یہ گھر بھی ہو اس کا ہی گھر
میرے آنگن میں یوں گھومتا کون ہے؟
میری مرضی کے یہ فیصلے تو نہیں
میرے سب فیصلے کر رہا کون ہے؟

ہم تو اپنے ہی مسکن میں ہارے ہوئے
شوق تسخیر میں مبتلا کون ہے؟
ہم تو اپنی ہی شاخوں پہ سہمے ہوئے
حد پرواز سے آشنا کون ہے؟
ہم تو اپنے ہی غاروں میں محو دعا
اور خلاؤں سے گزرا ہوا کون ہے؟
ہم تو اپنے ہی سورج سے ملتے نہیں
آسمانوں سے ملنے گیا کون ہے؟
ہم تو کم فہم اور نا سمجھ لوگ ہیں
اپنی عیاریوں میں سوا کون ہیں؟
جب بدن کے ہی گھاؤ نہ دیکھے گئے
زخم روحوں کے پھر دیکھتا کون ہے؟
میرے سچ پر کیا سب نے یہ تبصرہ
سچ تو سچ ہے مگر بولتا کون ہے؟

بروز جمعتہ المبارک 5 جمادی الاول 1445ھ 17 نومبر 2023ء

ادھورا سچ پورے جھوٹ سے زیادہ تباہ کن

جاتے بندہ بشر اپنے اندر کائنات ہوتا ہے، ایک پوری دنیا بسائے ہوئے۔ گزرے ہوئے روز و شب اور بیتے ہوئے ماہ و سال آپ کے چہرے پر نشان چھوڑ ہیں۔ انسان زندگی میں عجیب عجیب سے کام کرتا ہے۔ سکون کی تلاش میں سرگرداں انسان ایسی اشیا میں بھی پناہ ڈھونڈتا ہے جو اسے بالآخر مار ڈالتی ہیں۔ آپ فلم یا ڈرامہ کیوں دیکھتے ہیں اس لیے ناں کہ کچھ دیر کیلئے اپنی اداسی کو بھولیں حالانکہ آپ جانتے ہیں یہ سب جھوٹ ہے، اداکاری ہے، ناٹک ہے اور نجانے کیا کیا۔ جوزف ہیلر کے شاہکار افسانہ آشوب شہر کی کچھ سطریں ہیں۔ "بڑے شہر میں راستہ گم کر دینا بہت اذیت ناک ہوتا ہے، اور آدمی کا دماغ بھی ایک بڑا شہر ہی جہاں آدمی بھٹکتا پھرتا ہے.... ساری زندگی.... راستہ ڈھونڈتا ہی ٹھوکریں کھاتا ہے مگر راستہ نہیں ملتا۔ ملتا ہی نہیں...." دنیا ایک بہت بڑا شہر ہے اور ہم سب اس شہر میں بھٹک رہے ہیں، اجنبی ہیں۔ ہکسلے نے کہا تھا "جدید دنیا اس قدر تیزی سے مادیت کی دلدل میں دھنستی جا رہی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب مادی آسائشوں کی مٹی آدمی کا چہرہ بھی ڈھانپ لے گی اور جس دن روحانیت کی آخری رمق بھی ختم ہو گئی اس دن کرہ ارض کے تمام باسی پاگل ہو جائیں گے"۔

میری زندگی بھی بہت سارے رنگ لیے ہوئے ہے۔ پرائمری اسکول سے فٹ پاتھ پر قسمت کا حال بتانے والے نجومیوں کے ساتھ آشنائی، گھر سے بھاگ کر آنے والے لڑکوں کی دربدری اور کمپنی باغ کو اپنا مسکن بنانے والوں کی سنگت، رات کو قبرستانوں میں سونے اور دن کو مزدوری کرنے والوں کی زندگی، جوانی میں خون تھوک تھوک کر رت جگے کاٹنے والے اور پھر دل کی دنیا نشتروں کی زد میں گزارنے والوں کی صحبت نے بہت کچھ سکھا دیا۔ میں نے ایسے رنگا رنگ لوگ بھی دیکھے جو بظاہر چورا چکے اٹھائی گیر دکھائی دیتے لیکن اندر سے عالم فاضل، سفاک قاتل اور ان سفاک قاتلوں میں ولی، ولیوں کے روپ میں لٹیرے، جوگی کا روپ دھارے اور جھوٹے نگوں کی انگشتریوں سے ہاتھوں کی انگلیاں سجائے، ہر طرح کے رشتے ناطے، مجبوری کے ناتے توڑ کر اپنی دنیا میں مست اور پھر بہت سارے بابے، میں ان سب میں رہا ہوں۔ مجھ کمی کمین کو رب نے نجانے کیا کیا سکھایا نجانے کیا کیا عنائت کیا، میں قطعاً اس کے لطف و کرم کا حقدار نہیں تھا۔ بس کرم ہے، میں نے کبھی نہیں سوچا میرے اس کام کا انجام کیا ہو گا۔ دنیا مجھے کیا کہے گی۔ جب ایک دن مقرر ہے جہاں ہر اک حاضر ہو گا اپنے رب کے حضور تو پھر کیا اندیشہ سود و زیاں اور کیا رسوائی کا ڈر۔

بابا جی نے مجھے ایک دن کہا تھا، دیکھو انسان نے اپنے رب کو حاضر جانتے ہوئے ایک کام بہت اخلاص سے کیا لیکن وہ بگڑ گیا، اس کا تو غم نہیں ہوتا کہ میں نے تو یہ سوچ کر کیا ہی نہیں تھا اور اگر کوئی کام بد نیتی سے کیا اور وہ اچھے پھل پھول لے آیا تو بندہ سدا پریشان رہتا ہے کہ میں نے تو بہت بد نیتی سے کیا تھا، بس یہ ہے اصول زندگی کا۔ اسی سے چمٹے رہنا چاہے کچھ ہو جائے۔ ٹالسٹائی نے کہا تھا "میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کائنات دائمی اور لامحدود ہے، میں یہاں لمحے بھر کو چمکنے کے بعد بجھنے والا ہوں.... اور اب میں کچھ کر لوں۔ اس طرف سے زمین کھود کر ادھر نکل جاؤں.... اس طرف سے کھود کر واپس اس طرف نکل آؤں، اپنی موجودہ حالت سے نجات ممکن نہیں ہے۔ میرا یہ آغاز اور انجام کہاں کیوں اور کس کی مرضی سے طے کر دیا گیا ہے۔ جوگی کسی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کرتے، وہ صرف خواہش دریافت کرتے ہیں، کسی کو محل بنانے کی خواہش ہو تو کہتے ہیں بنا لو، پھر وہ دوسرا پھیرا لگاتے اور خواہش جاننا چاہتے ہیں۔ کسی بھی خواہش کا اظہار کیا جائے تو وہ کامیابی اور خوش رہنے کی دعا دیتے ہوئے چلے جاتے ہیں لیکن کوئی ان کا دامن تھام لے اور خود ہی چیخ کر کہے میری ساری خواہشات پوری ہو گئیں مگر میں اب بھی بے چین ہوں تو وہ اسے سکون کا راستہ دکھا دیتے ہیں کہ سکون تو

صرف میرے رب کے ذکر میں ہے۔ میں نجانے آپ سے کیا کہنا چاہتا ہوں، شاید یہ کہ ہم سب صرف خود جینا چاہتے ہیں لیکن کسی کو جینے کا حق دینا نہیں چاہتے، یہی ہے میری زندگی کا تجربہ، عزیز ترین رشتے دار بدترین استحصالی ثابت ہوتے ہیں۔ جب تک آپ ان کی ہدایات پر عمل کریں آپ بہت اچھے ہوتے ہیں، وہ آپ کے گن گاتے ہیں اور جیسے ہی وہ اپنا حق وہ حق جو انہیں ان کا رب دیتا ہے، استعمال کرنا چاہیں آپ ان کے خون کے پیاسے بن جاتے ہیں، آپ صرف خود کو دیکھتے ہیں۔

آپ کے پاس ہر ایک کیلئے اپنے معیارات ہیں۔ آپ کا ہر پل نئی عینک لگالیتا ہے۔ کچھ دیر پہلے وہ جو عزیز ترین تھا اب بدترین بن جاتا ہے اس لئے کہ وہ آپ کی ہدایات پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ انسان کٹھ پتلی نہیں ہوتا، وہ ایک جیتا جاگتا وجود ہوتا ہے، اس کی کچھ خواہشات ہوتی ہیں جسے آپ ناز و نخرے سے پالتے ہیں، پھر اسے خود اپنے ہاتھوں دفن کر دیتے ہیں۔ زیادہ سفاک یہ رویہ ہوتا ہے کہ آپ خود انہیں مار ڈالتے ہیں اور کوئی ان کی زندگی میں آکر تھوڑے سے رنگ بھر دے اور ان کے اداس چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کی کوشش کرے اور وہ کامیاب ہو جائے تو آپ اسے دوبارہ مار ڈالتے ہیں اور خود کو کہتے ہیں ہمیں تم سے محبت ہے اس لیے یہ کیا ہم نے۔ مجھے اقرار ہے میں نے کسی کی بھی ہدایات پر عمل نہیں کیا۔ جو ٹھیک سمجھا وہ کیا، کسی کی پرواہ نہیں کی پہلے اپنے قصیدے سنے اور پھر گالیاں لیکن میں باز نہیں آیا، میں باز آ بھی نہیں سکتا۔ انسانوں کو رب نے جو حقوق دیئے ہیں وہ کیسے سلب کر سکتے ہیں آپ۔ میں ان کے حق میں نغمہ سرا ہوتا ہوں اور گالیاں کھاتا اور مسکراتا ہوں۔

بظاہر عام انتخابات کا طبل جنگ بج چکا ہے اور تمام سیاستدان عوام کی خواہشات اور مجبوریوں سے کھیلنے کیلئے نئے جال لیکر اقتدار کی مسند پر پہنچنے کی بھرپور کوششوں میں مصروف ہیں۔ مذاق کی بات تو یہ ہے کہ ملک کی معیشت کو برباد کرنے کیلئے ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا کر خود کو مسیحا کی شکل میں پیش کرتے ہوئے ہر کوئی اپنی بغل میں الہٰ دین کا چراغ چھپائے اس کا علاج بتا رہا ہے۔ اگر یہ تمام سیاستدان سمجھتے ہیں کہ یہ اقتدار اللہ کی امانت ہے اور اس میں بیتے ہوئے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہے تو پھر اس کا نمونہ بھی تو پیش کرنا ہو گا۔ خوشنما تقاریر کے غازی بن کر کتنی دیر عوام کو دھوکہ دیں گے، دراصل آپ تو خود کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ ہمیں تو ہر وقت احتساب کیلئے تیار رہنا ہو گا۔ کیا یہ جذباتی جملہ کہہ کر جان چھوٹ جائے گی کہ بی بی کی قبر کا ٹرائل نہیں ہونے دیں گے جبکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ کسی بھی فرد کے دنیا میں نہ رہنے سے اس کے خلاف دائر تمام مقدمات کسی اور عدالت میں منتقل ہو جاتے ہیں جہاں مکمل انصاف ہوتا ہے۔ حساب تو آپ سے مانگا جا رہا ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے صرف ایک بینک اکاؤنٹ میں 6 کروڑ ڈالر کہاں سے آئے؟ کروڑوں کا نیکلس کیسے آیا اور اب کہاں ہے؟ دنیا کے دوسرے بینکوں میں اور خفیہ اکاؤنٹس کی بابت تو سوال بعد میں آئیں گے۔ آپ نے تو سرے محل کی ملکیت سے بھی انکار کر دیا تھا لیکن جب اس کی فروخت کا وقت آیا تو حق ملکیت کیلئے برطانوی عدالت میں جا پہنچے۔ ایون فیلڈ کے علاوہ دیگر اربوں کے اثاثے کیسے بن گئے؟ برطانیہ کی عدالت کے باہر حدیبیہ پیپر ملز کا مقدمہ کتنے ملین ڈالرز کی ادائیگی کے بعد ختم ہوا اور یہ رقم کی منی لانڈرنگ کا حساب کون دے گا؟ ملک ریاض کی منی لانڈرنگ میں برطانیہ سے واپس ہونے والی رقوم جو ملکی خزانے میں جانی تھی، وہ دوبارہ ملک ریاض کے عدالتی حکم کے بعد واجب الادا ہونے کی بجائے کیسے منہا ہو گئی؟ اس رقوم کی واپسی کیلئے کیا لین دین ہوا؟ ابھی تو اس کرپشن کے بدبودار گٹر کا ڈھکنا تھوڑا سا سرکایا ہے، بہت کچھ باقی ہے جس کا قوم کو حساب دینا ہو گا۔ نیب کے قوانین میں من مرضی کی ترامیم کر کے خود کو پاکباز قرار دینے کی چالیں کب تک

چلیں گی؟

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ یہاں سے خالی ہاتھ جانا ہے۔ آپ نہ تو فرعون سے زیادہ طاقتور ہیں اور نہ ہی شداد سے زیادہ دنیاوی خزانوں کے مالک۔ آپ تو اس قدر خوفزدہ ہیں کہ اپنے دور حکومت میں بھی قصر سفید کے فرعون کو اپنی مدد کیلئے پکارتے رہے جو اس زمانے میں اس خطے سے نکلنے کیلئے مدد کے طالب تھے۔ اس سلسلے میں آپ نے ان کو اپنے مقرر کردہ سفیر غدار وطن حسین حقانی کے ذریعے پیغام بھیجا کہ ہم تو وفاداری کیلئے مکمل تیار ہیں لیکن ہماری فوج نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ حسین حقانی تو اب بڑی بے شرمی کے ساتھ ہمسایہ دشمن انڈیا کے پلیٹ فارم پر اس کا کھلا کھلا اعتراف بھی کر رہا ہے اور اپنی کتاب میں بھی اس کا اقرار کر رہا ہے۔ میمو گیٹ سکینڈل کو کیسے بھول جائیں جس کے چشم دید گواہ اب بھی موجود ہیں۔

آپ کے دورِ حکومت میں سیکرٹری دفاع جنرل ریٹائرڈ نعیم لودھی کو بلا کر اپنے دفاع کیلئے ایک ایسے بیان پر دستخط کرنے کیلئے کہا گیا جس کے انکار پر انہیں اس منصب سے ہٹا دیا گیا۔ کیا آپ نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جس طرح اپنے ہرکارے واجد شمس الحسن کو برطانیہ میں سفیر مقرر کر کے اپنے مقدمات کے تمام کاغذات کو واپس لیکر ان میگا کرپشن کے مقدمات کو منوں مٹی میں دفن کر دیا ہے، میمو گیٹ میں بھی یہ حربہ کامیاب ہو جائے گا اور اسی کی تقلید میں نیب میں موجودہ مقدمات کو نیب ترامیم کی آڑ میں ختم کروانے کے بعد ملکی خزانے پر ایک مرتبہ پھر خوں آشام حملہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟

جب بھی کوئی سرکار گڈ لائف کے پنجرے کی اسیر ہوئی، اس کے نتیجے میں خلقت صرف حقیر ہوئی۔ عوام کے سامنے اپنے تمام عیوب، ناکامیاں گزشتہ حکومت پر ڈال کر جان نہیں چھڑائی جا سکتی۔ صرف ماضی کے ہی تذکرے نہ کریں، عوام کے علم میں سب کچھ ہے، اب باتوں کی بجائے عمل کر کے دکھائیں، عوام کو دیئے گئے ریلیف سے ہی ان کے گریف ختم ہوں گے۔ انسان کے جذبات ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچیں کہ ان کے درد کے فاصلوں کو کیسے کم کرنا ہے۔ فاصلے تو ایک ہی جسم میں دل و دماغ کے درمیان دشمنی لگا دیتے ہیں۔ ایسے میں دل اپنا نہ دماغ حالانکہ ان کی ورکنگ ریلیشن شپ سے ہی قدم آگے بڑھتے ہیں۔ اب اس بیمار سوچ کو ذہن سے کھرچ کر نکالنا ہو گا کہ ان دونوں کی لڑائی میں ہمارا فائدہ ہے۔ سیلاب اور زلزلہ جھونپڑی اور محلات میں کوئی لحاظ نہیں رکھتا۔ اپنے بھائی کے استقبال کیلئے اپنے جلسوں میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ ہم نے سیاست نہیں ریاست بچائی ہے اور ملک کو دیوالیہ سے بچا لیا ہے۔ اگر یہ واقعی پاکستان پہلے سے بہتر ہو گیا ہے، لوگ تو تب مانیں گے۔

تمہیں ملنے سے بہتر ہو گیا ہوں
میں صحرا تھا سمندر ہو گیا ہوں

کیا آپ اپنے کبیر و خبیر رب کی یہ دل دہلا دینے والے خبر کو جھٹلانے کی ہمت رکھتے ہیں جس نے واضح طور بتا دیا ہے کہ:

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ

جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی، اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی، اور انسان کہے گا کہ یہ اِس کو کیا ہو رہا ہے، اس روز وہ اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات بیان کرے گی، کیونکہ تیرے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہو گا۔ اس روز لوگ متفرق

حالت میں پلٹیں گے تا کہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں۔ پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا(الزلزال 8۔1)

شاید یہی ہے میرا سب سے بڑا جرم لیکن یہ میں کرتا رہوں گا چاہے آپ کو کتنا بھی ناگوار ہو۔ آپ ضرور جئیں، سدا جئیں لیکن اوروں کو بھی جینے دیں۔ کسی کو بھی اپنی خواہشات کی سولی پر مت چڑھائیں۔ آپ نے کسی کی خوشیاں چھینیں تو آپ بھی خوش نہیں رہیں گے۔ یہ دنیا اسی طرح غموں کے سمندر میں غوطے کھاتی رہے گی اور آخر ڈوب جائے گی۔ اپنے دل کے چراغ کو روشن رکھئے، کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ادھوری سچائی پورے جھوٹ سے زیادہ تباہ کن ہوتی ہے۔ ریت پر قلعے تعمیر نہیں کیے جاسکتے۔ سچ کو چھپایا نہیں جاسکتا، وہ اپنا راستہ خود نکالتا ہے چاہے کچھ دیر کیلئے وہ پسپا ہو جائے لیکن وہ ہمیشہ سرخرو رہتا ہے۔ آپ اتنی سی بات بھی نہیں جانتے کہ بعض اوقات خون کی بوندوں سے الفاظ مرتب ہوتے ہیں اور خون تو ویسے ہی سر چڑھ کر بولتا ہے البتہ یہ الگ بات ہے کہ اللہ دلوں، کانوں اور آنکھوں پر بھاری پردے ڈال کر مہر لگادے اور سننے و دیکھنے کی صلاحیت سلب کر دے۔

یاد رکھیے یہاں کوئی دائم آباد تھانہ رہے گا۔ سب چلے جائیں گے، پھر اک دن جمع کیے جائیں گے کچھ بھی تو نہیں رہے گا۔ وہاں حساب ہو گا، بڑا کڑا حساب ہو گا۔ ملک سے لوٹی ہوئی دولت جو اللہ کی طرف سے اس غریب اور بیکس عوام کی امانت تھی، اس کا حساب دینا ہو گا۔ آخر اقتدار کے شاہانہ ٹھاٹ بھاٹھ کا بھی تو حساب دینا ہو گا۔ لاکھوں جانوں کی قربانی دیکر یہ ملک اس وعدے پر لیا تھا کہ یہاں صرف میرے رب کا قانون چلے گا، میں تو بس تیرا خلیفہ ہوں ۔خود کو دھوکہ دیتے ہوئے 76 سال بیت گئے، منزل قریب ہوتے ہوئے بھی دور ہوتی چلی گئی، زمانے بھر کی رسوائیوں میں غرق ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی اس کی غلامی کرنے کو تیار نہیں۔ تیاری کر لیں کہ کوئی حساب سے مبرا نہیں۔

ریا کے دور میں سچ بول تو رہے ہو مگر
یہ وصف ہی نہ کہیں احتساب میں آئے

بروز ہفتہ 6 جمادی الاول 1445ھ 18 نومبر 2023ء

بے یقینی کے بادل اور جرأت

چلئے آج لمبی چوڑی کہانی کو چھوڑ دیتے ہیں، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ پچھلے دنوں میں نے جو کچھ پڑھا اور سنا، آپ سے کہہ سن لیتا ہوں۔ آپ ہمت بڑھاتے ہیں تو اللہ لکھنے کی توفیق بھی عطا فرما دیتے ہیں۔ جرأت بھی دل سوزی، شفقت اور رحم دلی کی طرح انسانی معراج کا ایک زینہ ہے۔ آج تک کوئی جرأت اور بہادری کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکا۔ جرأت اس تین منزلہ مکان کا نام ہے جس کے اندر انسان بستا ہے۔ انسانی وجود کے تین حصے ہیں: پہلا جسمانی، دوسرا ذہنی اور تیسرا روحانی۔ ان تینوں حصوں یا منزلوں کا ہونا بہت ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان کی زندگی کا آگے بڑھنا، اس کا نشو و نما پانا ناممکن ہے۔ جرأت آپ سے تقاضہ کرتی ہے کہ آپ اپنے اور دوسروں کے حقوق کیلئے کھڑے ہو جائیں اور انہیں منوانے کیلئے سینہ سپر ہو جائیں۔ جرأت آپ کو مجبور کرتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو، اپنے معاشرے کو، اپنے ملک کو تعمیر کرنے کیلئے سختی اور شقاوت کی بجائے محبت اور شفقت سے کام لیں، تشکیک کی بجائے ایمان کے اندر زندہ رہیں۔ مایوسی کے مقابلے میں امید کے سہارے، مشکلات کے نیچے دبنے کی بجائے ان پر حاوی ہو کر خود اعتمادی کی جرأت پیدا کریں۔ غلطیاں تسلیم کرنے کی جرأت اور خود کو کامل نہ پا کر رونے بسورنے سے احتراز کریں۔ یہ ہیں صحیح جرأت کے مظاہر!

باوجود اس کے کہ آپ اپنے اندر ایک جزیرہ ہیں، لیکن یہ جزیرہ انسانوں کی دنیا میں آباد اور ان کے درمیان واقع ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہم فکر مند نہیں ہوں گے تو بھوکے مر جائیں گے، اور اگر فکر کرتے رہیں گے تو پاگل خانے میں جا کر فوت ہو جائیں گے۔ زندگی ان دنوں اس قدر مشکل ہو گئی ہے کہ ہمیں ڈھنگ سے فکر کرنا بھی نہیں آتا۔ ہم دشمن حملہ آوروں کی فکر کرتے رہیں گے اور اپنے پڑوسی کی کار کے نیچے آ کر دب کر مر جائیں گے۔ ہم ہوائی جہاز کے کریش سے خوفزدہ رہیں گے اور سیڑھی سے گر کر فوت ہو جائیں گے۔ ہم دوسروں سے ورزش نہ کرنے کی شکائت کرتے رہیں گے اور گھر کے سامنے لگے ہوئے لیٹر بکس میں خط ڈالنے کیلئے گیراج سے کار نکالیں گے۔ ہم فکر مندی کے فن سے بھی ناآشنا ہو گئے ہیں اور ہم صحیح فکر کرنا بھی بھول گئے ہیں۔ فکر کرنا ایک اچھی بات ہے اور اس سے بہت سے کام سنور جاتے ہیں۔ بچے پل جاتے ہیں، گھر چلتے ہیں، دفتر کا نظام قائم ہوتا ہے، بزرگوں کی نگہداشت ہوتی ہے۔ فکر مندی ایک صحت مند اقدام ہے، یہ کام کرنے پر اکساتی ہے، لیکن سب سے ضروری فکر اپنی روح کی ہونی چاہئے اور سب سے اہم فیصلہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنا ابد کہاں گزار رہے ہیں اور کیسا گزار رہے ہیں۔ یہ سوچنا چاہئے کہ اگر ہمیں ساری دنیا کی دولت مل جائے اور ہماری روح میں گھاٹا پڑ جائے، تو پھر یہ کیسا سودا ہے؟

انسان ضرورت سے زیادہ فکر کیوں کرتا ہے؟ یہ اس وقت شروع ہوتی ہے جب انسان خود کو خدا سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھنا شروع کر دے کہ اب ہر شے کا بوجھ میرے کندھوں پر ہے۔ انسان خدا کا بوجھ بھی اپنے کندھے پر اٹھانا چاہتا ہے جو وہ کبھی بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اس فکر مندی کے وجود میں آنے کی وجہ ایک چھوٹا سا لفظ "اگر" ہوتا ہے۔ اگر یہ ہو گیا، اگر وہ ہو گیا، اگر اس نے یہ کہہ دیا، اگر لوگوں نے باتیں بنانا شروع کر دیں!!! ایک اعلیٰ عہدے پر فائز اپنے اندیشوں اور فکر مندیوں کی ڈائری لکھا کرتے تھے جن سے وہ خوفزدہ رہتے تھے۔ سال بعد جب ڈائری دیکھتے تو ان ہزارہا اندیشوں اور فکروں میں سے کوئی ایک آدھ ہی ان کو چھو کر گزرے تھے۔ اس کے مقابلے میں ایک دنیاوی طور پر ان پڑھ عورت، جو بھرپور جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ چار معصوم بچوں کا بوجھ، کام نہ کاج.....! کہنے لگی کہ میں نے صرف دو روپے کے کاغذ پر اپنے اللہ سے شراکت نامہ کر لیا۔ ایک بھوکے آدمی نے

صدا لگائی، جیب میں دو ہی روپے تھے، نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس طرح میرے رب سے میری شراکت شروع ہو گئی اور کہا کہ کام میں کرتی جاؤں گی، فکر میری جگہ تم کرنا۔ میرا کریم ورحیم رب راضی ہو گیا، بس اسی دن سے ہمارا شراکت کا کاروبار بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔

رات کو سونے سے پہلے میں یہ ضرور دعا کرتا ہوں: یا اللہ! دن میں نے پورا زور لگا کر تیری مرضی کے مطابق گزار دیا، اب میں سونے لگا ہوں، رات کی شفٹ اب تو سنبھال، بڑی مہربانی ہو گی۔ جب ہم ایسا کچھ کرتے ہیں کہ ہمارا اندر بتاتا ہے کہ یہ تو گناہ ہے، تو ہم اپنی عزتِ نفس سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پھر اپنے ساتھ رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، پھر ہم ندامت کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ زندگی مشکل ہو جاتی ہے، ضمیر ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے۔ اب ہم تو یا اس کو بھول جائیں، یا اسے دماغ سے نکال دیں، لیکن یہ دونوں کام ہی مشکل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک فعلِ ندامت، پشیمانی، اور توبہ ہے۔ جب ہم اپنے کریم رب کے سامنے اپنی تمام بے بسی، ندامت کے احساس کے ساتھ سجدے میں گر کر توبہ کی درخواست اپنے آنسوؤں کی تحریر کی شکل میں، اس کی عدالت میں اس کی رحمت کا استغاثہ دائر کرتے ہیں، تو نہ صرف توبہ قبول ہو جاتی ہے بلکہ اگر اس مناجات میں اخلاص بھی ہو تو ہم بھی قبول ہو جاتے ہیں۔ پھر زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ بابا اقبال نے تو اپنی منظوم زندگی کا آغاز ہی اس پہلے شعر سے کیا تھا:

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

دوستی کیا ہے؟ اگر میں تمہارا دوست ہوں اور تم میرے دوست ہو، تو یہ ہمارے لئے ایک بڑا اعزاز ہے کہ ہم نے دنیا کے بڑے بڑے مشہور، لائق فائق، اعلیٰ درجے کے لوگوں کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو پسند کیا۔ کیا پاکیزہ رشتہ باندھا، واہ واہ۔ دوستی کا رشتہ عمر بھر چلتا ہے۔ جوان ہوئے تو شادی ہو گئی۔ بہن بھائی، عزیز رشتہ دار، گھر، محلہ، شہر چھوٹ گیا۔ بوڑھے ہوئے تو اولاد چھوڑ گئی لیکن دوستی میں یہ تبدیلی نہیں آئی، دوستی کا رشتہ بے لوث ہوتا ہے، یا یوں کہئے کہ یہ روحانی ہوتا ہے۔ دیگر رشتوں میں تو کچھ جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنا پڑتا ہے، مگر دوستی میں صرف روح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا تقاضہ ہوتا ہے۔ روحیں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آغوش ہو جاتی ہیں اور جسمانی تقاضہ ایک بھی نہیں ہوتا۔ والدین بچپن میں ملتے اور پھر ساتھ رہتے ہیں۔ پھر وہ ہمیں یا پھر ہم ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بیوی یا شوہر جوانی کی عمر میں ملتے ہیں۔ بچے شادی کے بعد کی عمر میں نصیب ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہن بھائی بھی ہوتے ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ ہر کوئی اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ میں مگن ہو جاتے ہیں۔

بدن کے شور میں گم تھی سماعت نہ سمجھی روح کی فریاد ہم نے
تلاش شادمانی میں شب و روز رکھا خود کو بہت ناشاد ہم نے

لیکن دوستی کیلئے عمر کی کوئی قید نہیں۔ آپ 8 کے ہوں یا 80 کے، 9 کے ہوں یا 90 کے، 16 کے ہوں یا 60 کے..... آپ میں اگر اخلاص ہے، اور اگر آپ دوستی کا مطلب جان گئے ہیں تو پھر آپ کسی بھی عمر میں دوستی کر سکتے ہیں، دوست بن سکتے ہیں۔ ایمان کیا ہے؟ ایک اختیار ہی تو ہے۔ ایک چوائس ہی تو ہے۔ کوئی مباحثہ یا مکالمہ نہیں، یہ ایک فیصلہ ہے، قطعاً مباحثہ نہیں ہے۔ ایک کمٹمنٹ ہے، کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ یہ ہمارے دل کے خزانوں کو بھرتا ہے اور ہماری ذات کو مالا مال کرتا رہتا ہے۔ بالکل ایک پرخلوص دوست کی طرح۔ پھر دوستوں میں تحائف کے تبادلے بھی ہوتے ہیں۔ یادیں ایک بہترین اور خوبصورت تحفوں کی طرح ہر دم آپ

کو گھیرے رکھتی ہیں، اور وہ تحفہ جس میں کچھ قربانی شامل ہو جائے، وہ تحفہ جس نے آپ کو جینے کا ڈھنگ سکھایا ہو، جس نے آپ کو سر اٹھا کر چلنے کا فخر عطا کیا ہو، وہ تحفہ تو پھر سرمایہ حیات بن جاتا ہے۔ پھر ایسے تحفے کی حفاظت کیلئے ایک جان تو بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ اگر ربّ کریم دوست ہیں تو پاکستان اس رحیم دوست کا سب سے بڑا قیمتی اور نایاب تحفہ ہے۔ ایک ایسا انمول ہیرا ہے جس نے آپ کے سر پر رکھے ایمانی تاج کو باقی دنیا سے ممتاز کر رکھا ہے ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آج کسی کمہار کے ہاتھ لگ گیا ہو اور وہ اس کی قدر نہ پہنچانتے ہوئے اس کو اپنے گدھے کے گلے کی زینت بنادے؟ جلدی کریں، وقت بہت کم ہے۔ اپنے دوست کے تحفے کی قدر نہ کی تو پھر دوستی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

ایوان اقتدار میں سستانے والوں کو یہ خبر ہو کہ سیاست ٹھہرے ہوئے پانی کا نہیں بلکہ اس کی روانی کا نام ہے۔ اپنی عقل و فراست کے ساتھ اس کے بند مضبوط بنانے کی ضرورت ہے ورنہ اس روانی کو بند کرنے میں کسی قسم کی مروت کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔ اوپر کی سطح پر تبدیلیاں ہی تبدیلیاں اور نیچے؟ کیا اب بھی وہی ہم اور وہی غم ہوں گے۔ چہرے بدلنے سے کبھی مقدر نہیں بدلتے۔ تبدیلی کا عمل جب تک نچلی سطح تک نہیں جائے گا، عوام کے احساسات و جذبات اسی طرح سلگتے رہیں گے۔ مہنگائی، لوڈشیڈنگ اور آئے دن ایک دوسرے پر کرپشن، بدانتظامی اور دیگر الزامات کے ذکر پر انہیں ڈرائیں اور دوڑائیں نہ، وہ تو پہلے ہی بہت ڈرے ہوئے اور تھکے ہوئے ہیں۔ حالات و واقعات نے انہیں اس قدر پکی بنا دیا ہے کہ سوئی کی آواز بھی انہیں کسی دھماکے سے کم نہیں لگتی۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ کس طرح گزشتہ برسوں میں رہی سہی کسر بارشوں اور سیلاب کی تباہی نے عوام کو ایسا ادھ موا کیا ہے ہے کہ ابھی تک گھر کی کھوئی چھت نصیب نہیں ہوئی۔ رات کو سوئے تو امیر، لیکن صبح اٹھے تو فقیر، روزگار دنیا کے غم پہلے کیا کم تھے کہ اب کئی نئ آزمائشوں نے جکڑ رکھا ہے۔ الحذمت والوں نے رونگٹے کھڑے کر دینے والے ایسے واقعات سنائے ہیں کہ روح تک کانپ کر رہ گئی ہے۔

اس مہنگائی کے دور میں موجودہ سرکار کو عوام کیلئے اللہ سے "کاروبار" کرنا ہو گا پھر کہیں جا کر ان کا بازار چلے گا۔ ان کی مسکراہٹ سے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مسکراتے ہوئے چہروں کے دل بہت اداس ہوتے ہیں، ان کے تو خواب بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتے۔ ہر رات کو شب برأت سمجھنے والوں کو یادوں کی بارات کا کیا پتہ، انہیں اس کا پہلے سے اندازہ ہو جائے تو وہ آنکھ بند کرنے سے ہی توبہ کر لیں۔ بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں مگر ان کے ضمیر سو رہے ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جاتی ہیں مگر ان کی تعبیر جاگتی رہتی ہے۔ بہت سے خواتین و حضرات کو آنکھوں کی "چہل قدمی" کا بڑا شوق ہوتا ہے، انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ آنکھیں بھٹک جائیں یا کہیں اٹک جائیں۔ اسی شوق چشم میں وہ بہت سے روگ بھی لگا جاتے ہیں۔ دوسروں کے گھروں میں "نظر اندازی" کرنے والوں کو اپنی چادر و چار دیواری کے اندر بھی دیکھنا چاہئے کہ اس تاک جھانک سے دل پر کیا گزرتی ہے۔ من کا ویسے بھی دھن سے کیا رشتہ ہے، اسی لئے کہتے ہیں کہ دل نہ بھریں، یہ بھر گیا تو بہت سے سیلاب جسم کو ڈبو دیں گے۔ سیاست میں یہی سیلاب سونامی بن جاتے ہیں۔

پیارے پاکستان میں بہت سے سیاستدان اقتدار کے بغیر نہیں رہ سکتے اور اسلام آباد ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہماری بربادی میں ان لوگوں کی آبادی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ ارض وطن کی معاشی بدحالی اور سیاسی انتشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئی بیرونی دباؤ کی وجہ سے استعمار سے جلد دوستی کی بیماری اب وبا کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ جب تک فلسطین اور کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہو گا، اس کیلئے چاہے جتنے مرضی الفاظ جمع کر لیں، "کاغذ کورا" ہی رہے گا۔ لیکن آپ نے تو غزہ کے مجبور مسلمان بھائیوں سے یکجہتی کرنے والوں پر بھی لاٹھیاں برسا دیں، یہ کیا ظلم کمایا ہے آپ نے؟

لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت صرف ایک بار ہوتی ہے اور اس کے بعد سمجھوتے ہی چلتے ہیں، جب تک جان ہے، جہان داری تو نبھانی ہی پڑے گی، جس میں ہار جیت چلتی رہتی ہے۔ جیتنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قوم دکھوں سے ہار رہی ہے اور آپ مخالفین کو قابو کرنے کی تعریفیں سن کر نہال ہو رہے ہیں۔ آئے دن بھوک کے ہاتھوں دلبرداشتہ ماں اپنے معصوم بچوں سمیت خود کو ٹرین سے کٹوا کر ہمارے سسٹم کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے، ہمارے ہاں زندہ لوگوں کا حساب نہیں لیا جاتا تو مرے ہوئے کس کھاتے میں آئیں گے۔ امیر شہر کا تو اپنا یہ حال ہے:

امیر شہر غریبوں کا خیال کیا کرتا
امیر شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

اب اس کا کیا علاج کیا جائے کہ آپ پھر سے آزمودہ افراد کو استعمال کرنے کیلئے نئے تجربات کر رہے ہیں۔ کیا پہلے تجربات سے دل نہیں بھرا؟ آخر ایسی کیا تبدیلی رونما ہوئی ہے کہ دھتکارے ہوئے افراد دل کی دھڑکن بن گئے ہیں۔ اس بدنصیب قوم پر بے یقینی کے بادل پچھلی سات دہائیوں سے برس رہے ہیں اور ہر مرتبہ دل میں بہار کی امید لیکر آپ کی باتوں پر یقین کر لیتی ہے لیکن یاد رکھیں کہ صاحب علم ہمیشہ اپنے طور طریقوں اور عادت واطوار سے پہچانا جاتا ہے۔ جس طرح سورج کبھی یہ اعلان نہیں کرتا کہ وہ آسمان پر آچکا ہے، اسی طرح ایک صاحبِ علم اور حقیقت کا ادراک کرنے والا کبھی شور اور بے تکے پن سے اپنی شناخت نہیں چاہتا بلکہ اس کی گفتگو اور عمل اس کی شخصیت اور علم کی پہچان بن جاتے ہیں۔ نیک ہونے کی احساس کمتری کا یہ عالم ہے کہ وہ ہمیشہ خود کو بڑا کر کے پیش کرتا ہے لیکن پست قامتی جسمانی ہو تو کوئی عیب نہیں لیکن عقلی ہو تو کبھی بھی روا نہیں رکھی جاتی۔ اس لیے وہ گدھا جو خود کو اونچی آواز کی بنا پر شیر سمجھنا شروع کر دے تو عین وقت پر خاموش شیر کو دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔

اجازت دیں۔ میں تو منادی کرنے آیا تھا۔ ملتے رہیں گے جب تک سانس کی ڈور بندھی ہوئی ہے۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا جو الحی القیوم ہے۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

بروز سوموار 8 جمادی الاول 1445ھ 20 نومبر 2023ء

یاددہانی

کم غزہ میں حالیہ جنگ سے قبل ہمارے ہاں لبرل حواس باختہ ہو کر یہ راگ الاپ رہے تھے کہ اسرائیل سے تعلقات استوار کرنے میں کیا حرج ہے کم از ایک دشمن تو کم ہو جائے گا۔ اسرائیل، امریکا سے دوستی کا پل بن جائے گا، ہن برسے گا، بھلے ایمان کو گھن لگ جائے اس کی پرواہ ہی کب ہے۔ ان کے پاس ایمان کی رمق بچی ہی کہاں ہے ورنہ جن یہودیوں پر اللہ نے ذلت اور مسکنت کی چادر ڈال کر دنیائے عالم میں ذلیل وخوار کیا، ان سے ہاتھ ملانے کی بات کرنا اللہ کے عذاب میں شراکت کے سوا اور کچھ نہیں جو قیامت تک یہودیوں پر نازل ہوتا رہے گا اور اب تو فائنل راؤنڈ ہے۔ اگر اسرائیل سے یہودیت کو نکال لیا جائے تو وہ ملک ختم ہو جائے گا اور اسی طرح پاکستان سے اسلام نکال دیا جائے تو پاکستان ختم ہو جائے گا۔

یہ اسرائیل سے تعلقات بڑھانے میں سرگرم گروہ پاکستان میں اسلام کو گھٹانے کا جہاں گھٹیا جرم کر رہے ہیں وہاں وہ مادر پدر آزادی، بے راہ روی، عریانی کے حربے کو استعمال میں لا رہا ہے اور ان تمام سرگرمیوں کو جاری رکھنے کیلئے خوب ڈالر سمیٹ رہا ہے اور یوں ایمان کے عوض تھوڑے داموں دنیا کا خریدار ہے۔ ان کا حشر بھی چاہنے والوں جیسا ہو گا، ان شاء اللہ۔ پاکستان نے اپنے قیام سے لیکر اب تک ہمیشہ اسرائیل کے معاملے میں اصولی مؤقف اختیار کیا ہے، حکومت خواہ کسی کی ہو۔

اعلان بالفور کی روشنی میں صہیونی ریاست کے قیام پر اقوام متحدہ میں بحث شروع ہوئی تو قائداعظم نے 25/اکتوبر 1947ء کو رائٹر سے انٹرویو میں واشگاف انداز میں کہا "فلسطین کے بارے میں ہمارے مؤقف کی صراحت اقوام متحدہ میں پاکستانی وزیر خارجہ نے کر دی ہے، مجھے اب بھی امید ہے کہ تقسیم کا منصوبہ مسترد کر دیا جائے گا ورنہ ایک خوفناک ترین اور بے مثال چپقلش کا شروع ہونا ناگزیر ہے۔ یہ چپقلش صرف عربوں اور منصوبہ تقسیم کرنے والے اختیار کے مابین نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا اس فیصلے کے خلاف بغاوت کرے گی کیونکہ ایسے فیصلے کی حمائت تاریخی اعتبار سے کی جاسکتی ہے نہ ہی سیاسی اور اخلاقی طور پر۔

19 دسمبر 1947ء کو ایمانی حرارت سے لبریز بانی پاکستان قائداعظم نے بی بی سی کے نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے اس الفاظ کے ساتھ اعادہ کیا "برصغیر کے مسلمان تقسیم فلسطین کے اقوام متحدہ کے ظالمانہ، ناجائز اور غیر منصفانہ فیصلے کے خلاف شدید ترین لب ولہجے میں غصیلا احتجاج کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ برصغیر کے مسلمان امریکا یا کسی اور ملک کی مخالفت مول نہیں لینا چاہتے لیکن ہماری حس انصاف مجبور کرتی ہے کہ ہم فلسطین میں اپنے عرب بھائیوں کی ہر ممکن مدد کریں"۔

قائداعظم کی وفات کے بعد 1949ء میں اسرائیل نے پاکستان سے تعلقات استوار کرنے اور کم از کم دوطرفہ کاروباری سرگرمیاں شروع کرنے کیلئے رابطہ کیا لیکن منہ کی کھائی۔ 1950ء میں ایک وفد جس میں دنیا کی یہودی تنظیمیں اور اسرائیل کے نمائندے شامل تھے، لندن میں پاکستانی ہائی کمشنر سے ملے اور درخواست کی کہ افغانستان میں مقیم چند سو یہودی براستہ بھارت اسرائیل آنا چاہتے ہیں پاکستان کے راستے انہیں بھارت جانے کی اجازت دی جائے۔ پاکستان نے حقارت کے ساتھ ان کی درخواست مسترد کر دی اور پھر یہ یہودی براستہ ایران اپنی منزل اسرائیل پہنچے۔ یاد رہے کہ پاکستان واحد ملک تھا جس نے 1949ء میں عرب اسرائیل جنگ کے خاتمہ پر دو اسرائیلی علاقے یہودیہ اور سماریہ جو اردن نے فتح کر لئے تھے، ان کی آزادی کو تسلیم کیا۔

اسرائیل کو تسلیم کرنے کا مطلب اس کے سوا یہ بھی ہے کہ کشمیر کا مقبوضہ علاقہ پر پاکستان کا دعویٰ بھی ختم ہو جائے۔ جب اسرائیل کا فلسطین پر قبضہ پاکستان جائز قرار دے گا تو بھارت کا کشمیر پر بزور قبضہ ناجائز کیسے کہے گا۔ یوں یہ ڈالر گزیدہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس دلیل یہ ہے کہ اسرائیل کو اردن، مصر اور ترکی نے تسلیم کر رکھا ہے۔ ہمارا اسرائیل سے جھگڑا کیا ہے، وہ بھی تو اہل کتاب ہیں۔ ان عقل کے اندھوں سے پوچھے کہ بھلا جن ممالک نے اسرائیل کو تسلیم کیا انہیں کیا فائدہ ہوا۔ مصر پریشان ہے، اردن سراسیمہ ہے، ترکی شاکی اور ندامت میں غرق ہے اور جس نے بھی مغضوب علیہ یہودیوں سے ہاتھ ملایا وہ یہودیوں کی سی ذلت کا شکار ہوا۔ ان کی فطرت میں ڈسنا ہے اور وہ ڈس کر ہی رہتے ہیں۔

تاریخ کے ورق الٹیں تو ہاں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ اسپین میں مسلمان بادشاہ نے ایک یہودی وزیر اعظم مقرر کیا جس نے منصب سنبھالتے ہی اہم اداروں میں یہودی اہلکاروں کے تقرر پر پابندی لگا دی۔ بادشاہ نے اپنے مقرر کردہ یہودی وزیر اعظم سے پوچھا تو اس نے جواب میں کہا کہ میں ان یہودیوں کی سرشت سے کسی بھی مسلمان کے مقابلے میں زیادہ جانتا ہوں۔ جرمنی اور آسٹریلیا میں ہٹلر کے ہاتھوں جو عرصہ حیات ان یہودیوں پر تنگ ہوا تو ترک خلافت نے انہیں پناہ دی اور حسن سلوک سے نوازا مگر یہ سلطنت عثمانیہ کے خلاف سازشوں میں پیش پیش رہے اور شکست وریخت میں بھرپور کردار ادا کیا۔ کچھ شرارت سے یہ سوال کرتے ہیں کہ اسرائیل سے ہماری کیا دشمنی ہے۔ وہ یہی سوال اسرائیل سے کریں وہ آخر پاکستان کا شدید ترین دشمن کیوں ہے؟

خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کا ذکر آیا ہے تو تاریخ کی نظر میں کچھ ایسے واقعات بھی ہیں جن کو پڑھ کر آج بھی ہر دھڑکتے دل رکھنے والوں کی پلکیں بھیگ جاتی ہیں:

جب مصطفی کمال اُتاترک نے خلافت کا خاتمہ کیا تو آل عثمان کو راتوں رات گھریلو لباس ہی میں یورپ بھیج دیا گیا اور جبکہ شاہی خاندان (ملکہ اور شہزادوں) نے التجا کی کہ یورپ کیوں؟ ہمیں اردن، مصر یا شام کسی عرب علاقے ہی میں بھیج دیا جائے لیکن صہیونی آقاؤں کی تعلیمات واضح تھیں، اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنا، ان کو آخری درجے ذلیل کرنا مقصود تھا چنانچہ کسی کو یونان میں یہودیوں کے مسکن سلونیکا اور کسی کو یورپ روانہ کیا گیا، اور آخری عثمانی بادشاہ سلطان وحید الدین اور ان کی اہلیہ کی تمام جائیداد ضبط کر کے راتوں رات فرانس بھیج دیا گیا اور یہاں تک کہ گھریلو لباس میں خالی جیب اس حال میں انھیں رخصت کیا گیا کہ ایک پائی تک ان کے پاس نہ تھی، کہا جاتا ہے کہ سلطان وحید الدین کے شہزادے منہ چھپا کر پیرس کی گلیوں میں کاسۂ گدائی لیے پھرتے تھے کہ کوئی انہیں پہچان نہ پائے۔ پھر جب سلطان کی وفات ہوئی تو کلیسا ان کی میت کو کسی کے حوالے کرنے پر آمادہ نہ ہوا کیونکہ دکانداروں کا قرض ان پر چڑھا ہوا تھا۔ بالآخر مسلمانوں نے چندہ کر کے سلطان کا قرض ادا کیا اور ان کی میت کو شام روانہ کیا اور وہاں وہ سپرد خاک ہوئے۔

بیس سال بعد جنہوں نے سب سے پہلے ان کے بارے میں دریافت کیا، ان کی خبر گیری کی وہ ترکی کے پہلے منتخب وزیر اعظم عدنان مندریس تھے۔ شاہی خاندان کی تلاش کیلئے وہ فرانس گئے اور وہاں جا کر ان کے احوال و کوائف انہوں نے معلوم کیے۔ پیرس کے سفر میں وہ کہتے تھے کہ مجھے میرے آباؤ اجداد کا پتہ بتاؤ، مجھے میری ماؤں سے ملاؤ، بالآخر وہ پیرس کے ایک چھوٹے سے گاؤں پہنچ کر ایک کارخانے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سلطان عبد الحمید کی زوجہ پچاسی سالہ ملکہ شفیقہ اور ان کی بیٹی ساٹھ سالہ شہزادی عائشہ ایک کارخانے میں نہایت معمولی اجرت پر برتن مانجھ رہی ہیں۔ یہ منظر دیکھ

کر مندریس کی چیخیں نکل گئیں اور اشکبار آنکھوں سے پاؤں میں پڑ گئے اور ہاتھ چوم کر معافی کے طلبگار ہو کر ندامت کا اظہار کر رہے تھے کہ شہزادی عائشہ نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ گلوگیر آواز میں کہا: میں بدنصیب ترک وزیر اعظم عدنان مندریس ہوں، اتنا سننا تھا کہ شہزادی پیچھے ہٹ کر بول اٹھیں: اب تک کہاں تھے؟ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے، اور فرط غم سے بیہوش ہو گئیں۔ ہوش میں آتے ہی ادھوری ملاقات چھوڑ کر رخصت ہو گئیں۔

عدنان جب انقرہ واپس گئے تو انہوں نے جلال بیار سے کہا کہ میں آل عثمان کیلئے معافی نامہ جاری کر کے اپنی ماؤں کو واپس لانا چاہتا ہوں۔ بیار نے شروع میں تو اعتراض کیا مگر مندریس کے مسلسل اصرار پر صرف عورتوں کو واپس لانے کی تائید کی۔ پھر عدنان مندریس خود فرانس گئے اور ملکہ شفیقہ اور شہزادی عائشہ دونوں کو بڑی منت سماجت کے بعد ترکی لے آئے، مگر شہزادوں کیلئے معافی نامہ جاری کر کے ان کو اپنے وطن عزیز ترکی لانے کا سہرا مرحوم اربکان کے سر جاتا ہے جب وہ وزیر اعظم کے منصب پر فائز تھے۔

پھر جب مندریس پر جھوٹا مقدمہ چلا کر ان کو تختہ دار پر لٹکایا گیا تو مجملہ الزامات میں ایک الزام یہ تھا کہ انہوں نے حکومت کے خزانے سے چوری کر کے سلطان کی اہلیہ اور بیٹی پر خرچ کیا ہے، اس لیے کہ وہ ہر عید کے موقع پر ملکہ اور شہزادی سے ملاقات کیلئے جاتے، ان کے ہاتھ چومتے، اور اپنی جیب خاص اور اپنے ذاتی صرفے سے 10 ہزار لیرہ سالانہ شہزادی عائشہ اور ملکہ شفیقہ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ جب 17 ستمبر 1961 کو عدنان مندریس شہید ہوئے تو دوسرے ہی دن دونوں (ملکہ اور شہزادی) بھی بحالت سجود اللہ کے حضور حاضر ہو گئیں۔

اب تو کئی عالمی مؤرخین نے اپنی کتابوں میں انکشاف کیا کہ اس سارے واقعہ کی پشت پر یہودی سرمایہ داروں کا وہ خفیہ ہاتھ کسی کو نظر نہیں آیا جنہوں نے ترکی میں اپنی ساری سرمایہ کاری کو ختم کرنے کا الٹی میٹم دیکر یہ کام کروایا تھا۔ جس میں مشہور زمانہ "گیون ڈی بروکیٹ" نے اپنی کتاب "جب عثمانی ترک بن گئے" میں 35 صفحات پر ہوشربا انکشافات کئے ہیں جس کو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے اور ایک مؤرخ "الکر آیاترک" نے اپنی کتاب "ترکی میں اسلام اور قوم پرستوں میں جنگ" کے عنوان پر 27 صفحات پر اس کا تذکرہ کیا ہے جس کو ٹیلر اینڈ فرانسس نے شائع کیا ہے۔

یہ سلوک ہے نام نہاد جمہوریت پسندوں اور سیکولرزم کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ، نہ کوئی مروت نہ شرافت، نہ صلہ رحمی، نہ قرابت داری، نہ اخلاق کا پاس نہ قدروں کا لحاظ۔ یہ جو قومیت اور وطنیت کا راگ الاپتے ہوئے اسرائیل کو تسلیم کرنے کے نعرے لگا لگا کر جن کی زبانیں نہیں تھکتیں ان کا مقصد بجز اس کے اور کیا ہے کہ اسلامی اخوت سے لوگوں کا رشتہ کاٹ دیا جائے اور اس مقدس رشتے کے تانے بانے کو بکھیر کر اس کو ایسے جاہلی رشتوں میں تبدیل کیا جائے جن میں احترام و غیرت مفقود ہے اور حرمتوں اور انسانی رشتوں کا کوئی پاس ولحاظ نہیں۔ یہ قصہ بچوں کو سلانے کیلئے نہیں بلکہ سوئی ہوئی قوم کو جگانے اور نوجوان نسل کو اصلی دشمن سے آگاہ کرنے اور روئے زمین پر شیطان کے چیلوں کے خلاف کمربستہ کرنے کیلئے لکھا ہے:

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

یہودیوں کی دغابازیوں کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو گی کہ فتح خیبر کے بعد رسول اکرم ﷺ نے معاہدے کے تحت یہودیوں کو جان و مال کا تحفظ دیا مگر کچھ عرصہ بعد یہ خلاف ورزی پر اتر آئے۔ نتیجتاً مدینہ نے وعدہ شکنوں کو عین معاہدے کے تحت نکال باہر کیا۔ مقتدر حلقوں کو یاددہانی کروانا ضروری ہے کہ وہ اسرائیل کے عزائم اور سرشت سے واقف ہوں گے، وہ کچھ نہ کریں گے جو پرویز مشرف نے کیا اور پھر جو یہودیوں نے ان کے ساتھ کیا، وہی کچھ کرنے کا پھل ان کو بھی مل سکتا ہے۔ 18 / اکتوبر 2007ء کو اسرائیلی صدر شمعون نے پرویز مشرف کو متنازعہ ترین صدارتی الیکشن کے نتیجے پر مبارکباد کا خط لکھا اور اسے شائع بھی کروایا اور یہ تجدید دوستی تھی جس کا آغاز ستمبر 2005ء میں اس وقت کے اسرائیل کے ظالم ترین صدر ایریل شیرون نے مشرف سے اقوام متحدہ کی راہداری میں ہاتھ ملایا تو مشرف نہال ہو گئے اور ایک بڑ ہانکی کہ وہ اسرائیل اور فلسطین کے معاملہ کو حل کرانے میں کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اسرائیل کے وزیر اعظم نے طنزیہ انداز میں جملہ کستے ہوئے کہا "ہمیں شک ہے کہ مشرف باوجود صدر اور فوجی سربراہ ہونے کے اس قابل ہے کہ ہمارے لئے کوئی کردار ادا کر سکے"۔ اس جملہ میں صدر کی توہین اور پاک فوج سے اس کی نفرت کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

1949ء اور 1967 کی فتح جنگ کی تقریب میں صہیونی تحریک کے بانی رہنما ڈیوڈ بن گوریان کی تقریر جو "جیوش کرانیکل میں شائع ہوئی کہ "عالمی صہیونی تحریک کو پاکستان کے خطرات سے باخبر رہنا چاہئے، اب پاکستان ہمارا پہلا نشانہ ہونا چاہئے کیونکہ یہ نظریاتی ریاست ہمارے وجود کیلئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ پورا پاکستان یہودیوں سے نفرت اور عربوں سے محبت کرتا ہے۔ عربوں کا یہ عاشق عربوں سے زیادہ خطرناک ہے اس لئے موقع ملتے ہی صہیونی دنیا کو اس کے خلاف فوری اقدام کرنا چاہئے۔ (19 / اگست 1947ء)

یاد رکھیں! اس دل میں صرف ایک خوف سما سکتا ہے، اللہ کا خوف یا پھر دنیا کا خوف، اور جو اللہ سے ڈرتا ہے، ساری دنیا اس سے ڈرتی ہے لیکن جو دنیا سے ڈرتا ہے تو وہ ساری عمر بزدلی، تذلیل اور رسوائی کا سامنا کرتا ہے۔ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ: یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، تم ان سے نہ ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو تو صرف مجھ سے ڈرو (آل عمران: 175)۔

بروز بدھ 10 جمادی الاول 1445ھ 22 نومبر 2023ء

خوش فہمی نے برباد کر دیا

ہلا کو خاں جب بغداد پہنچا تو منگول سپاہیوں کی وحشیانہ قتل وغارت نے جہاں کوئی سر سلامت دیکھا، کاٹ دیا، جہاں کوئی عمارت نظر آئی، جلا کر خاکستر کر دی، جہاں کوئی کتب خانہ، لائبریری یا کوئی درسگاہ ملی اس کو راکھ کر دیا۔ تاریخ کہتی ہے کہ خون کے دھبے اور راکھ کے داغ دھوتے دھوتے دجلہ کا پانی سوکھ گیا لیکن منگولوں کی وحشت کے آثار نہ مٹے۔ اسی قتل وغارت گری کے دوران عراقی صوفیوں کا ایک گروہ منگول سپاہیوں کے ہتھے آچڑھا، سپاہی زہد کے بوجھ تلے دبے ان بزرگوں کو لیکر ہلا کو کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ سپاہیوں کا کہنا تھا کہ عراقیوں کے بقول ان صاحبانِ دعا کے منہ سے نکلا ہر لفظ بارگاہِ رب العزت میں قبولیت کی سند رکھتا ہے۔

ہلا کو خان نے نخوت سے پوچھا "پھر کیا" سپاہیوں نے جواب دیا "حضور! یہ لوگ آپ کو بد دعائیں دے رہے تھے" ہلا کو خان صوفیاء کے اس گروہ کی طرف مڑا اور جلالی لہجے میں اس الزام کی تصدیق چاہی۔ صوفیائے کرام میں سے ایک نسبتاً بزرگ نے اقرار میں گردن ہلا کر جواب دیا "اے ظالم! تم خلقِ خدا کے قاتل ہو، تم نے ہزاروں بے گناہوں کا لہو بہایا، تم نے اللہ کی مقدس کتابوں کی توہین کی، تمہارے سپاہیوں کے گھوڑوں نے مسجدوں کا تقدس پامال کیا، لہٰذا تم اب اللہ کے انتقام سے بچ نہیں پاؤ گے، تمہیں اس زمین پر حساب دینا ہو گا۔

ہلا کو خان اور اس کے حواری اس کہنہ بزرگ کی جرأت پر حیران ہو گئے۔ سپاہیوں نے تلواریں سونت لیں، لیکن اس سے قبل کہ تلواریں اپنا کام دکھاتیں، ہلا کو خان نے اشارہ کیا، ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا اور صوفیائے کرام کے اس گروہ سے مخاطب ہو کر بولا "اے شکست خوردہ بزدل قوم کے مظلوم بزرگو! بغداد کی تباہی کے بعد ہلا کو خان کا حساب ہوا بھی تو کیا ہوا، اب اگر تمہاری بد دعائیں قبول بھی ہو جائیں، ہلا کو خان کو سو بار جنم دیکر سو بار قتل بھی کر دیا جائے، تو بھی بغداد آباد نہ ہو گا، گردن سے اترے سر دوبارہ شانوں پر نہیں لگیں گے، خاک ہوئی عمارتیں اور راکھ ہوئے کتب خانے دوبارہ آباد نہیں ہوں گے، اب دنیا کا کوئی انتقام دجلہ کے کناروں پر گھاس نہیں اگا سکتا۔" ہلا کو خان اٹھا، صوفیاء کے گروہ کے قریب پہنچا اور ان پر نظریں گاڑ کر بولا "جاؤ میں تمہیں اس قبرستان میں زندہ رہنے کی سزا دیتا ہوں"۔

ہلا کو خان بغداد سے واپس چلا گیا. اب تو معلوم نہیں قدرت نے واقعی ہلا کو خان سے انتقام لیا یا پھر آسمانی طاقتیں اس سے رعائت برت گئیں لیکن جہاں تک بغداد کی تباہی کا معاملہ ہے آج بھی تاریخ جب اس موڑ پر پہنچتی ہے تو اپنے بال کھول دیتی ہے اور اس کے منہ سے دردناک بین کی آوازیں آنے لگتیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ قتل کے بعد قاتل پھانسی چڑھے یا عمر قید کی سزا بھگتے، مقتول کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ پانچ ہزار قاتلوں کی پھانسی بھی ایک مقتول، ایک مظلوم کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتی لیکن کیا کیجئے خوش فہمی بھی بڑی چیز ہے۔ دنیا کے تمام کمزور، بزدل اور مظلوم لواحقین اپنے پیاروں کی لاشیں سمیٹتے ہوئے، مظلوموں اور مقتولوں کو آخری غسل دیتے ہوئے یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتے رہتے ہیں کہ "آخر کسی نہ کسی روز قاتل نے بھی مر جانا ہے"۔

لمحہ موجود میں سارا عالمِ اسلام اسی خوش فہمی کا شکار ہے، پوری مسلم امّہ کے دانشور امریکا کی تباہی، امریکا کی بربادی کی پیشین گوئیاں کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یورپ امریکا کے خلاف اٹھ کھڑا ہو گا، کسی کا کہنا ہے کہ عراق، غزہ فلسطین کی راکھ سے ہزاروں لاکھوں اسامہ پیدا ہوں گے، افغانستان کے

سیاہ پہاڑوں سے لاکھوں ملاعمر کے لشکر نکلیں گے، اب امریکا اور اس کے اتحادیوں کا کوئی شہری چین کی نیند نہیں سو سکے گا، کوئی اعلان فرماتا ہے کہ "ڈی ڈے" شروع ہو چکا ہے لیکن کوئی ان سے پوچھے، بغداد کی تباہی اور موت کے بعد "ڈی ڈے" شروع ہوا؟ امریکیوں اور اس کے اتحادیوں کی نیندیں حرام ہوئیں؟ ہزاروں بن لادن پیدا ہوئے؟ لاکھوں ملاعمر میدان میں اترے یا یورپ امریکا کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تو کیا فائدہ؟ کیا بغداد، افغانستان اور غزہ کے بے گناہ لوٹ آئیں گے؟

میرے ایک دوست اسی قسم کی مذہبی خوش فہمی کا شکار ہیں۔ وہ کل میرے پاس تشریف لائے اور آتے ہی فرمانے لگے "مظلوم غزہ، عراقیوں، بے بس افغانیوں، کشمیریوں اور بے گناہ پاکستانیوں کی نعشیں کہہ رہی ہیں کہ عنقریب تباہ و برباد ہو جائیں گے"۔ میں نے قہقہہ اسرائیل، انڈیا، امریکا اور اس کے تمام ساتھیوں کا بدترین انجام قریب ہے، تم اپنے پاس لکھ کر رکھ لو، انتقام کی تلخی اس طرح تو دور نہیں ہو گی، امریکا اور اس کے اتحادی بے شک دس ہزار مرتبہ لگایا، اس کا کالر جھاڑا اور بڑے پیار سے کہا "برادرم! غصے اور تباہ ہوں لیکن ہمارے اوپر گر کر تو تباہ نہ ہوں"۔ میرے دوست کو میری بات ناگوار گزری اور ناراض ہو کر منہ بسور کر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک خوش فہم شخص اسی ردعمل کا اظہار کر سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میرے دوست کی خوش فہمی درست ثابت ہو، واقعی کل کا سورج طلوع ہو تو دنیا کے نقشے پر اٹلانٹک اوشن اور بحر ہند کے پار چند بدبودار جوہڑوں اور جلی سڑی چٹانوں کے سوا کچھ نہ ہو لیکن یہ ابھی محض "ہو سکتا" ہے، امکان، گمان یا خیال ہے۔ آج کی حقیقت تو یہ ہے کہ غزہ کی سرزمین نعشوں سے اٹ چکی، اب تک 12 ہزار سے زیادہ فلسطینی، جن میں سے دو تہائی خواتین اور بچے ہیں، مارے جا چکے ہیں۔ تقریباً 3,700 افراد کے لاپتہ ہونے کی اطلاع ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ملبے تلے پھنسے یا ہلاک ہو گئے ہیں۔

واشنگٹن پوسٹ کے مطابق 5 ملین کے قریب عراق اور افغانستان میں لاشیں بچھ چکیں، کشمیر کے لاکھوں باشندے موت کو گلے لگا چکے، امریکی ڈرونز نے جی بھر کر پاکستانیوں کے پرخچے اڑائے لیکن کبھی بھی اس کا سانس تک نہیں پھولا، بش، رمز فیلڈ، کولن پال، رچرڈ باؤچر، اوباما، ہالبروک، ٹرمپ، جنرل مشرف، زرداری، نواز، مودی، امیت شاہ اور اب نیتن یاہو، مودی اور جو بائیڈن رہیں یا ختم ہو جائیں، امریکا، بھارت، اسرائیل اور یورپ باقی بچے یا تباہ ہو جائیں، ان نعشوں، ان جلی سڑی عمارتوں کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ زمینی حقائق تو یہ ہیں کہ خادمین حرمین اپنے ہاتھوں سے پہلے ٹرمپ کو اور بعد ازاں نہ صرف مودی کو ملک کا سب سے بڑا سول اعزاز پہنا چکے ہیں بلکہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ آرامکو عملی طور بھارتی افراد کے سپرد ہو چکا اور مہاراشٹر کی ریفائنری سمیت دیگر اداروں میں 75 بلین ڈالرز کی سرمایہ کاری بھی۔ امریکی خبر رساں ادارے "اے پی" کی رپورٹ کے مطابق کشمیر میں آرٹیکل 370 ختم کرنے کے بھارتی اقدام پر چپ سادھنے کی وجہ بھارت میں خلیجی ممالک کی 100 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری ہے بلکہ یو اے ای اور سعودی عرب نے تو مودی کو ملک کا سب سے بڑا سول اعزاز دیکر پاکستان کو باقاعدہ پیغام بھی دے دیا ہے۔

ہلا کو خان نے بغداد کی سرزمین پر کھڑے ہو کر جس حقیقت کا اعلان کیا وہ آج او آئی سی کے ناکام اجلاس نے سچ ثابت کر دیا کہ "طاقت اور دعاؤں کی جنگ میں طاقت ہمیشہ پہلی فاتح ہوتی ہے۔

رہے نام میرے رب کا جس کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔

وجہہ بے رنگی گلزار کہوں تو کیا ہو
کون ہے کتنا گناہ گار کہوں تو کیا ہو
تم نے جو بات سرِ بزم نہ سننا چاہی
میں وہی بات سرِ دار کہوں تو کیا ہو

بروز جمعتہ المبارک 12 جمادی الاول 1445ھ 24 نومبر 2023ء

اپنی فکر کر نادان

جب آدمی کی مت ماری جاتی ہے تو وہ عجیب سے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے، اونگیاں بونگیاں مارنے لگتا ہے، عجیب سے خبط میں پڑ جاتا ہے۔ وہ منظر کے قریب نہیں جاتا، اسے تخیل کے کیمرے سے زوم لگا کر قریب لاتا ہے اور پھر پند و نصائح شروع کر دیتا ہے۔ اس کے بالکل سامنے جو کچھ ہو رہا ہو اسے نہیں دیکھتا اور جو دور کہیں ہو رہا ہو اس سے پنجہ آزمائی شروع کر دیتا ہے۔ اپنے اندر کی دھڑکتی کوٹھی کو نہیں ٹٹولتا، دوسروں کے عیب گنوانے لگتا ہے۔ پتا ہو نہ ہو، معلوم ہو نہ ہو.....بس ہر جگہ، ہر مجلس میں اپنی پٹاری کھول کر نیا سنپولیا نچانے لگتا ہے اور اسے کہتا ہے تبلیغ.....اور پھر اس سے آگے بڑھ کر خدمتِ انسانیت۔ بھائی نے ایک دن یہ کہہ دیا کہ باتیں اتنی کرتا ہے لیکن وہ نماز کیوں نہیں پڑھتا؟ تو بابا جی نے بہت غصے میں اس کا بازو تھام کر کہا: تجھے کب سے اور کیوں اس کی نماز کی فکر ہو گئی؟ کیا تیری نماز ٹھیک ہو گئی، تیری عاقبت سنور گئی ہے جو دوسروں کی سوچنے لگا ہے، دوسرے کا تو شاید تجھ سے پوچھا جائے نہ پوچھا جائے، تجھ سے تیرا تو پوچھا جائے گا، تو کیا تو اپنا بیڑا پار لگا چکا؟ تیری نیا کنارے لگ گئی؟ محبت کا دریا رواں تھا ان میں۔

ایک جید عالم دین.....صرف عالمِ دین ربانی ہی نہیں، باعمل پابندِ شریعت، ہنس مکھ.....اللہ جی نے مال و دولت سے بھی نوازا تھا۔ خود مسجد بنائی اور جمعہ کا خطبہ دینے بڑی سی لشکارے مارتی گاڑی میں آتے اور ہماری چوکڑی کو منتظر پاتے۔ کبھی خالی ہاتھ نہیں آئے۔ ایک تھیلے میں کھانے پینے کا نجانے کیا کچھ سامان لے کر آتے، السلام علیکم! کیسے ہو تم لوگ واہ واہ آج تو سب چمک رہے ہو، کہتے ہوئے تھیلا میرے ہاتھ میں تھماتے اور خود منبرِ رسول ﷺ پر رونق افروز ہو جاتے۔ بوڑھے تھے لیکن عجیب طاقت تھی ان میں۔ کچھ دیر منبرِ رسول پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتے اور پھر اپنا عصا لے کر کھڑے ہو جاتے اور پھر تو ایسی قرآت کہ اللہ ہی اللہ، آنکھوں کا غسل شروع ہوتا اور پھر آواز آتی! برادرانِ اسلام میری ماں بہنوں اور بیٹیوں، اور پھر چل میرے خامے بسم اللہ، سبحان اللہ، الحمدللہ۔ کیسے کیسے نادر و نایاب ہیرے تقسیم کرتے تھے۔

بہت طویل عرصے تک ہمیں دیالو بابا دیتے رہے اور ہم اپنی جھولی بھرتے رہے، ظرف کب بھرے گا، نہ جانے کب؟ جب دیکھو ایک ہی بات پر زور، اپنی فکر کر نادان، اپنی فکر کر۔ اسلام خود کو بدلنے کا نام ہے۔ خود کو تبلیغ کر، خود کو سنو، اپنے قول کو دیکھ، اپنے فعل و عمل پر نگاہ رکھ، یہ جو اندر بیٹھا ہوا اژدھا ہے، نفس نام کا، اسے کچل نہیں سکتا تو یہ تو کر لے کہ اس کے جبڑے پر پاؤں رکھ کر کھڑا رہ، کبھی مت چوکنا، برباد ہو جائے گا، تباہ ہو جائے گا، کچھ نہیں بچے گا تیرا۔ اپنی فکر کرے گا تو سنورے گا۔ لوگوں کو کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ تیری روشنی اور خوشبو خود بخود پھیلے گی.....اور ایسی پھیلے گی کہ تو دنگ رہ جائے گا۔ کاٹنا نہیں جوڑنا سیکھ، دوسروں کے عمل پر نہیں اپنی بے عملی پر آنسو بہا، دوسرے کی چنتا چھوڑ خود پر دھیان رکھ، بس خود کو بدل، دوسرے تجھے دیکھ کر بدل جائیں گے۔ بہت یاد آتی ہیں ان کی باتیں۔ وہ تو چلے گئے لیکن خوشبو بسی ہوئی ہے میرے چاروں طرف ان کی۔

آج بابا فرید جی بھی یاد آ گئے۔ ایک مرید قینچی لے کر حاضرِ خدمت ہوا اور کہنے لگا سرکار تحفہ لایا ہوں قبول کیجیے اونہال کیجیے۔ دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور کہا اتنی وزنی قینچی اٹھا لایا، کیا میں تجھے کاٹنے والا لگتا ہوں.....مجھے سوئی دھاگہ لا کر دیتا کہ میں جوڑنے کا کام کرتا ہوں۔ ہمارے سارے بابوں نے ایک ہی بات کر کے دکھائی، کبھی کسی کی توہین نہیں کی۔ سدا مسکراتے رہے۔ کاٹنے سے منع کیا، جوڑنا سکھایا۔ اپنی کٹیا میں در ہی نہیں بنایا کہ کبھی بند ملے

۔سب کیلئے کشادہ دل رہے، تنگ دلی سے منع فرمایا۔سب کے ساتھ کھایا، گایااور ناچے۔محبت تھے، محبت دی، نفرت کو بھی محبت کا چولا پہنایااور محبت بنادیا۔یارِ جانی کہتے تھے، یارِ جانی سمجھا بھی۔جو کہہ دیا نبھا کر دکھایا، کر کے بتایا۔

کس منہ سے نام لوں، میرے آقا و مولا، روشن جبیں ﷺ نے اس بچے کو پیار سے فرمایا گڑ مت کھایا کرو۔تو بچے کی ماں کہنے لگیں: یہ بات تو آپ ﷺ کل بھی فرماسکتے تھے ؟تب سرکارِ دوعالم ﷺ نے تبسم فرمایااور پھر موتی بکھیرے کل تو خود کھایا ہوا تھا، کیسے منع کرتا۔سرکار ﷺ کے بعد کس کی بات کروں۔چاروں طرف ہم سب کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں، توڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔وہ ایسا ہے فلاں ویسا ہے۔میں خود کو دیکھ ہی نہیں رہا کہ میں کیسا ہوں.....میرا کیا بنے گا!میں کس دھوکے میں پھنس گیا ہوں مجھے اپنا دھیان ہی نہیں، بس دوسروں کی عیب جوئی کرتا رہتا ہوں اور پھر اسے تبلیغ بھی کہتا ہوں۔بندہ مکر و فریب، اپنے اندر کی دھڑکتی کوٹھی کو کب دیکھوں گا میں.....!وقت تو کسی کا لحاظ نہیں رکھتا، وہ تو کبھی نہ کبھی اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے والے تمام واقعات کی ایسی شہادت فراہم کر دیتا ہے جس سے فرار ممکن نہیں!ایسی ہی گواہی دینے کیلئے کچھ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں:

مرد کے کپڑوں میں عورت کی صفائی دکھائی دیتی ہے، عورت کے لباس میں مرد کی مردانگی ظاہر ہوتی ہے اور لڑکیوں کے لباس میں ماں کے اخلاق نظر آتے ہیں۔ہم محبت، رواداری، وفاداری، احترام اور تمام اعلیٰ اقدار پر پلی ہوئی نسل ہیں، ہم ان مردوں اور عورتوں کے درمیان رہتے تھے جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے، لیکن انہوں نے تعلقات اور احترام میں مہارت حاصل کی تھی۔انہوں نے ادب نہیں پڑھا لیکن ہمیں ادب سکھایا، انہوں نے فطرت کے قوانین اور حیاتیات کا مطالعہ نہیں کیا، لیکن انہوں نے ہمیں شائستگی کا فن سکھایا۔انہوں نے رشتوں کی ایک بھی کتاب نہیں پڑھی لیکن اچھا سلوک اور احترام سکھایا، انہوں نے مذہب کا گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا لیکن ہمیں ایمان کا مفہوم سکھایا۔وہ منصوبہ بندی کے معنی سے واقف نہیں تھے، لیکن انہوں نے ہمیں دور اندیشی سکھائی۔ہم میں سے اکثر کو گھر میں اونچی آواز میں بولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ہم وہ نسل ہیں جو گھر کے صحن میں بجلی بند ہونے پر سو جاتے تھے، ہم آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے تھے مگر ایک دوسرے کے بارے میں باتیں نہیں کرتے تھے۔

میری دلی محبت اور تعریف ان لوگوں کیلئے جنہوں نے ہمیں حسن ادب کے یہ قرینے اپنے عمل سے سکھائے، کہ والدین کی عزت ہوتی ہے، استاد کی عزت ہوتی ہے، محلے دار کی عزت ہوتی ہے، رفاقت کی عزت ہوتی ہے اور دوستی کی عزت ہوتی ہے۔ہم ساتویں پڑوسی کی عزت کرتے تھے اور بھائی اور دوست کے ساتھ اخراجات اور راز بانٹتے تھے۔ان لوگوں کیلئے جنہوں نے وہ خوبصورت لمحات گزارے، اور اس نسل کیلئے جس نے ہمیں پرورش اور تعلیم دی، اور میں ان سے کہتا ہوں: کہ آپ میں سے جو زندہ ہیں، اللہ رب العزت ان کی حفاظت اور صحت عطا فرمائے اور جو ہمیں چھوڑ کر اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کی بخشش فرمائے، اور ہمیں یہ توفیق مرحمت فرمائے کہ جو نعمتیں اور سلیقے ہم نے اپنے والدین اور بزرگوں سے سیکھے، ان کو اپنے بچوں میں منتقل کریں۔۔آمین

بروز ہفتہ 13 جمادی الاول 1445ھ 25 نومبر 2023ء

بلیوں کا بندر ثالث

فرینک اسٹاکٹن انیسویں صدی کا ایک ناکام امریکی افسانہ نویس تھا اس کی تمام تصانیف وقت کی گرد میں کھو گئیں لیکن "دی لیڈی آر دی ٹائیگر" اس کی ایسی تخلیق تھی جس نے فرینک اسٹاکٹن کو ادب میں ہمیشہ کیلئے زندہ کر دیا۔ یہ دنیا کی وہ کہانی ہے جس کے باعث کسی مصنف کو ادب کی تاریخ میں سب ماسوائے سے زیادہ خطوط موصول ہوئے۔ جو کروڑوں کی تعداد میں پڑھی اور اس سے کئی گنا زیادہ سنی گئی۔ فرینک اسٹاکٹن کی اس کہانی میں کچھ نہیں تھا اختتام کے، نقاد کہتے ہیں یہ دنیا کی واحد سٹوری تھی جس کے اختتام نے اسے کلاسیک کا درجہ دیا۔

کسی ملک میں ایک بادشاہ کی حکومت تھی، بادشاہ ایک نیم متمدن، نیم وحشی اور نفسیاتی مریض تھا۔ اس نے انصاف کا ایک عجیب طریقہ وضع کیا، وہ ملزم کو ایک اسٹیڈیم میں اتارتا، اسٹیڈیم کے گرد رعایا بیٹھ جاتی اور بادشاہ سامنے چبوترے پر براجمان ہوتا، ملزم کے سامنے دو دروازے ہوتے۔ ایک کے پیچھے خونخوار بھوکا شیر ہوتا اور دوسرے دروازے کی اوٹ میں انتہائی حسین و جمیل دوشیزہ۔ ملزم کو دونوں دروازوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا۔ وہ ، تماش بین شیر کا دروازہ کھول دیتا تو شیر باہر آتا اور اسے چیر پھاڑ کر کھا جاتا، اسٹیڈیم میں لوہے کی غمگین گھنٹیاں بجتیں، کرائے کے نوحہ گر ماتم کرتے اس کے پیچھے آرزردہ ہو کر سر جھکا لیتے اور بادشاہ کفِ افسوس ملتا۔ اگر خوش قسمتی سے وہ دوسرا دروازہ کھول دیتا تو اسٹیڈیم میں ایک پادری داخل ہوتا، ناچنے اور گانے والوں کی منڈلی ہوتی، پیتل کی گھنٹیاں بجائی جاتیں، ساز بجتے اور لوگ ملزم پر پھول برسانے لگتے، پادری اسی وقت ملزم اور اس لڑکی کی شادی کروا دیتا۔ تماشائی تالیاں پیٹتے نعرے لگاتے، بادشاہ نئے جوڑے کو ہار پہناتا اور وہ عوام کے جلو میں رخصت ہو جاتے۔

شومئ قسمت سے بادشاہ کی اکلوتی بیٹی کسی عام نوجوان پر فدا ہو جاتی ہے، یہ بیٹی بھی اپنے باپ کی طرح نیم متمدن، نیم وحشی اور نفسیاتی مریض ہے۔ بادشاہ کو اس عشق کا علم ہو جاتا ہے، وہ نوجوان کو گرفتار کرتا ہے اور اسٹیڈیم میں لا کھڑا کرتا ہے۔ سامنے دروازوں کے پیچھے سلطنت کا انتہائی خطرناک شیر اور ملک کی سب سے خوبصورت لڑکی چھپا دی جاتی ہے۔ اب ذرا منظر دیکھئے، اسٹیڈیم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، بادشاہ چبوترے پر شہزادی کے ساتھ فروکش ہے، ملزم سامنے کھڑا ہے، اتنی خاموشی ہے کہ دھڑکنیں تک گنی جا سکتی ہیں۔ ملزم دروازہ کھولنے سے پہلے شہزادی کی طرف مڑتا ہے، شہزادی جو رات بھر کی تگ و دو کے بعد معلوم کر چکی ہے کس دروازے کے پیچھے کیا ہے، اس کے چہرے پر کشمکش کا جال بچھا ہے، ملزم حسرت سے اسے دیکھتا ہے، اسی لمحے شہزادی ایک فیصلہ کرتی ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے محبوب کو ایک دروازے کی نشاندہی کر دیتی ہے۔ ملزم آگے بڑھتا ہے اور دروازہ کھول دیتا ہے،، کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

دی لیڈی آر دی ٹائیگر" کے شائع ہونے کی دیر تھی، پوری دنیا میں شور بپا ہو گیا، لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے "ملزم نے کون سا دروازہ کھولا۔ سوال حقیقی تھا کیونکہ کہانی پڑھنے والے شہزادی کی فطرت سے واقف تھے۔ وہ ایک نیم متمدن، نیم وحشی اور نفسیاتی مریض لڑکی تھی، اس کے سامنے دو راستے تھے، وہ لڑکی والے دروازے کی نشاندہی کرتی تو اس کا محبوب اس کی نظروں کے سامنے کسی اور کا ہو جاتا، شادیانے بجتے، لڑکیاں ناچتیں، پادری نکاح پڑھاتا اور وہ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈال کر رخصت ہو جاتے۔ شہزادی حاسد بھی تھی، وحشی بھی اور نفسیاتی مریض بھی، لہٰذا یہ سب کچھ اسے قبول نہیں تھا۔ دوسری صورت میں شیر والے دروازے کی نشاندہی کرتی اور شیر باہر نکل کر اس کے محبوب کو چیر پھاڑ کر اسے کھا جاتا، شہزادی کو یہ بھی

گوارہ نہیں تھا۔ وہ اپنے محبوب سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی، اس کی موت اسے بھی جیتے جی مار دیتی، شہزادی شدید کشمکش میں تھی، وقت بہت کم تھا۔ لہٰذا عین وقت پر اس نے کوئی فیصلہ کیا اور ایک دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔

یہ اشارہ اس وقت بھی معمہ تھا اور آج بھی فرینک اسٹاکٹن کے ہر قاری کے دماغ میں کنکر کی طرح "رڑکتا" ہے۔ فرینک اسٹاکٹن نے کہانی کے آخر میں لکھا "اب میں یہ آپ پر چھوڑتا ہوں اس دروازے سے کیا نکلا، شیر یا لیڈی۔"

"فرینک اسٹاکٹن کو لاکھوں خطوط ملے، ہزاروں لوگ اس کے دروازے میں آپ کو دروازے کے پیچھے کیا تھا؟" اور وہ ہنس کر جواب دیتا" مجھے معلوم ہوتا تو پر آئے، لوگ اسے بس، مارکیٹ، ریستوران میں روک کر پوچھتے" ضرور بتاتا، میں تو خود پریشان ہوں شہزادی نے کس دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا۔" لوگ یہ سوال پوری زندگی فرینک اسٹاکٹن سے پوچھتے رہے، فرینک اسٹاکٹن فوت ہو گیا تو ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں لیکن معمہ حل نہیں ہو رہا، شائد یہ کبھی حل نہیں ہو گا کیونکہ یہ محبت اور حسد کی کشمکش ہے جس کا فیصلہ کبھی نہیں ہوتا۔

خدا گواہ ہے کہ میں فرینک اسٹاکٹن نہیں ہوں، میں محبت سے لبریز شہزادی اور دی لیڈی آر دی ٹائیگر کا نیم متمدن، نیم وحشی اور نفسیاتی مریض بادشاہ بھی نہیں ہوں، میں ان دو دروازوں کے سامنے کھڑا ملزم بھی نہیں ہوں، میں پادری، شیر کا رنگ ماسٹر اور گھنٹیاں بجانے والا اردلی بھی نہیں ہوں، اس خونی کھیل میں میرا کوئی حصہ نہیں، لہٰذا میں حیران ہوں لوگ پھر مجھ سے یہ کیوں پوچھتے ہیں غزہ کا مستقبل کیا ہو گا؟ کشمیر کا کیا بنے گا؟ اب عمران خان کا مستقبل کیا ہو گا؟ کیا ۸ فروری کو انتخابات ہوں گے؟ غزہ میں جزوی جنگ بندی کا اعلان تو ہو گیا لیکن اسرائیل ایک مرتبہ پھر ضد پر قائم ہے کہ غزہ کی پٹی پر مکمل قبضہ کر کے چھوڑوں گا اور اس کا جنونی وزیر تو سارے فلسطین پر ایٹم بم گرانے کی دھمکی دے رہا ہے اور دوسرا وزیر تمام فلسطینیوں کو آئرلینڈ یا کسی صحرا میں منتقل کرنے کی دھمکی دے رہا ہے لیکن جمہوریت اور انسانیت کے چیمپئن نہ صرف خاموش تماشائی بلکہ اس وحشیانہ ظلم کا قصوروار بھی انہی ذبح ہونے والوں کو قرار دے رہے ہیں۔

قارئین! اب آپ ہی بتائیں کہ دروازے کے پیچھے کیا ہے، یہاں سے شیر برآمد ہو گا یا حسینۂ عالم، کیا ہو گا؟ "میں پریشان ہوں، میں اپنے ان تمام کرم فرماؤں سے درخواست کرتا ہوں آپ مہربانی فرما کر یہ سوال کسی فرینک اسٹاکٹن سے پوچھا کریں، ایسے فرینک اسٹاکٹن سے جو ان دروازوں، ان شیروں اور ان ملزموں کا اصل مصنف ہے، جس نے یہ کہانی تخلیق فرمائی تھی، ہم تو فقط تماشائی ہیں، دروازے سے شیر نکل آئے تو روپڑتے ہیں، حسینہ جلوہ افروز ہو جائے تو تالیاں بجاتے بجاتے سانس تک پھول جاتا ہے، لیکن خالی ہاتھ رہتے ہیں، خالی ہاتھ آتے ہیں اور خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں!

بروز اتوار 14 جمادی الاول 1445ھ 26 نومبر 2023ء

امریکی تاریخ کی گواہی

یحییٰ سنوار شاید اس وقت فلسطین کی سب سے بااثر شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنی 56 سالہ زندگی کا بڑا حصہ جیل میں گزارا، چاہے وہ اسرائیلی جیل ہو یا غزہ جیسی کھلی جیل۔ اسرائیل کی جانب سے غزہ اور اسرائیل کی سرحد پر 60 فلسطینی مظاہرین کو ہلاک کیے جانے کے دو روز بعد 16 مئی 2013ء کو غزہ کے باسی یہ جاننے کیلئے ٹیلی ویژن کے گرد جمع تھے کہ کیا اشتعال اور تشدد کی نئی لہر انہیں ایک اور جنگ کی طرف دھکیل دے گی؟ وہ نہ تو فلسطینی صدر محمود عباس کو سن رہے تھے اور نہ ہی حماس کے رہنما اسماعیل ہانیہ کو، بلکہ وہ غزہ میں حماس کے رہنما یحییٰ سنوار کو سن رہے تھے جو آنے والے وقت میں پورے فلسطین کی نمائندگی کریں گے۔ یحییٰ سنوار پر عسکریت پسندوں کی جانب سے ہلاک شدگان کا بدلہ لینے کیلئے دباؤ ڈالا گیا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے الجزیرہ پر اعلان کیا کہ حماس پُرامن عوامی مزاحمت کو جاری رکھے گی۔ یحییٰ سنوار کی جانب سے ایسا بیان آنا بہت حیران کن تھا۔

یحییٰ سنوار غزہ کے خان یونس کیمپ میں پیدا ہوئے، وہ حماس کے اولین ارکان میں سے ہیں۔ انہوں نے حماس کی خفیہ پولیس بنانے میں بھی مدد کی جس کا کام اسرائیل سے تعاون کرنے والے فلسطینیوں کی نشاندہی کرنا تھا۔ یحییٰ سنوار کو 1988ء میں اسرائیلی عدالت نے چار دفعہ عمر قید کی سزا سنائی۔ حالات نے اس وقت ایک اہم موڑ لیا جب اسرائیل نے حماس کی قید میں موجود اپنے فوجی کی رہائی کیلئے قیدیوں کا تبادلہ کیا۔ اسرائیل نے مذاکرات کیلئے یحییٰ سنوار کا استعمال کیا۔ انہیں حماس کے رہنماؤں سے بات چیت کی اجازت تھی جو اسرائیلی فوجی کے بدلے اپنے ایک ہزار سے زائد افراد کی رہائی چاہتے تھے۔ اسرائیل نے کچھ کے علاوہ تمام نام تسلیم کر لیے جن میں یحییٰ سنوار کا نام بھی شامل تھا۔ 2011ء میں وہ قید سے رہا ہو گئے۔ اسرائیل میں کچھ لوگ اس فیصلے پر پچھتائے جب انہوں نے یحییٰ سنوار کو حماس کے عسکری بازو القسام بریگیڈ کا کمانڈر بنتے دیکھا۔

1980ء میں اپنے قیام سے ہی حماس اپنے سیاسی افراد اور القسام بریگیڈ کے جنگجوؤں کے درمیان منقسم رہی۔ یہ تقسیم 2014ء میں حماس اسرائیل تیسری لڑائی کے بعد مزید گہری ہو گئی۔ یحییٰ سنوار کے ماضی اور اسرائیلی جیلوں میں کئی سال گزارنے کی وجہ سے حماس کے عسکری حلقے میں ان کا کافی اثر و رسوخ موجود ہے۔ جن اسرائیلی تجزیہ کاروں کی رائے یہ تھی کہ یحییٰ سنوار کو سیاسی معاملات میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، ان کی تمام آراء غلط ثابت ہوئیں، 2019ء جب غزہ کا انتظام سنبھالنے کیلئے یحییٰ سنوار کا انتخاب کیا گیا تو نہ صرف اسرائیلی بلکہ فلسطینی شہری بھی یحییٰ سنوار کی قیادت کے حوالے سے شکوک و شبہات میں گھرے ہوئے تھے۔ اسرائیلی آرمی چیف کا کہنا تھا کہ یحییٰ سنوار کی تقرری نے حماس کے سیاسی اور عسکری ونگ میں فرق ختم کر دیا ہے۔ غزہ کے باسی اس خوف میں مبتلا تھے کہ جس شخص نے کئی سال اسرائیلی جیل میں گزارے ہوں وہ جارحانہ اور متلون مزاج کا حامل ہو گا۔ یحییٰ سنوار کے اسرائیلی تفتیش کار کا اُن کے بارے میں کہنا ہے کہ وہ ایک انتہائی سخت گیر اور عملی شخصیت ہیں۔ سابق فلسطینی سکیورٹی چیف محمد دحلان بھی اُن کے بارے یہی رائے رکھتے تھے۔

یحییٰ سنوار نے فلسطین کے باہر موجود حماس کے رہنماؤں کا کردار محدود کر دیا۔ انہوں نے وقتی طور پر غزہ میں موجود سخت گیر آوازوں کو بھی خاموش کروا دیا۔ حماس نے سالوں کی کوششوں سے زیرِ زمین سرنگوں کا جال قائم کیا تاکہ وہ اپنے جنگجوؤں کو سرحد پار بھیج کر اسرائیلی علاقوں پر قہر ڈھا سکے۔ لیکن 2016ء سے اسرائیلی فوج کسی خفیہ ٹیکنالوجی کی مدد سے ان سرنگوں کا سراغ لگا کر انہیں تباہ کرتی رہی۔ القسام بریگیڈ کے سربراہ محمد الضیف چاہتے تھے کہ جلد سے جلد ان سرنگوں کا استعمال کر لیا جائے لیکن یحییٰ سنوار نے اس بات کو مسترد کر دیا۔

لیکن یہ سب کچھ کسی بنیادی تبدیلی کو ظاہر نہیں کرتا تھا بلکہ حماس کا پرامن طریقہ کار اختیار کرنا ایک حکمت عملی پر مبنی تھا۔ یہاں تک کہ غزہ کے جنگجو بھی یہی سمجھتے رہے کہ ان کے ہتھیار اور اسلحہ کا معمولی ذخیرہ اسرائیل کو کوئی خاطر خواہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ حماس کے حقیقت پسند لوگ یہ بات سمجھتے ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ مزید کوئی لڑائی غزہ کیلئے تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ یحییٰ سنوار نے غیر ملکی صحافیوں سے اپنی پہلی ملاقات میں کہا کہ ”سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ نوجوانوں کے اندر غزہ میں ایک پُروقار زندگی کی امید ختم ہوتی جا رہی ہے، جس پر فوراً توجہ دینے کی ضرورت ہے وگرنہ ان نوجوانوں کو ظلم کے خلاف اپنی جوانوں کی قربانی دینے کے جذبے کو روکنا بہت مشکل ہو گا“۔

دوسری طرف اسرائیلی تفتیش کار اور حکومتی عہدیدار اپنی مکارانہ سیاسی چالوں کا مسلسل استعمال کرتے ہوئے یہ پروپیگنڈہ کرتے رہے کہ یحییٰ سنوار بہت پرعزم شخص ہیں۔ وہ محمود عباس کے مقابلے میں زیادہ بہتر رہنما نظر آتے ہیں لیکن اگر یحییٰ سنوار فلسطین کی قیادت کرنے کے خواہش مند ہیں تو وہ ایسا کسی مسلح گروہ کے ساتھ رہ کر نہیں کر سکتے۔ دنیا حماس کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرے گی جب تک اس کی جانب سے تشدد کا راستہ ترک نہیں کر دیا جاتا۔ یحییٰ سنوار ماضی قریب کے کسی بھی حماس رہنما کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہیں۔ اب انہیں فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ کس حد تک حقیقت پسند بن سکتے ہیں۔

اب 48 دن کی شدید ترین جنگ اور اس کے نتیجے میں 70 فیصد غزہ کا کھنڈرات میں تبدیل ہونے کے باوجود یحییٰ سنوار غائب ہیں اور اس وقت ہزاروں اسرائیلی فوجی، ڈرونز اور جدید آلات اور جاسوسوں کی مدد سے انہیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مکمل سفید سر اور داڑھی کے باوجود مکمل سیاہ بھنویں والی منفرد شخصیت اس وقت غزہ میں حماس کے سیاسی شعبے کے سربراہ ہیں اور اسرائیل کو مطلوب حماس رہنماؤں کی فہرست میں شامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسرائیل ان سمیت دیگر حماس رہنماؤں کو سات اکتوبر کو جنوبی اسرائیل پر ہونے والے حملے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے جس میں 1200 / افراد ہلاک جبکہ 200 یرغمال بنائے گئے۔

اکتوبر کے آغاز میں اسرائیل ڈیفنس فورسز کے ترجمان ریئر ایڈمرل ڈینیئل ہگاری نے کہا تھا کہ "یحییٰ سنوار کمانڈر ہیں اور انہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔" آئی ڈی ایف کے چیف آف سٹاف ہیرزی ہلیوی نے کہا کہ "اس ہلاکت خیز حملہ کرنے کا فیصلہ یحییٰ سنوار نے کیا۔ اس لیے ان سمیت ان کے ساتھ کام کرنے والے تمام افراد کو پکڑنے پر ہلاک کر دیا جائے گا۔" ان میں محمد الضیف بھی شامل ہیں جو حماس کے عسکری شعبے القسام بریگیڈ کے سربراہ ہیں۔

یورپین کونسل برائے خارجہ امور (ای سی ایف آر) میں سینیئر پالیسی فیلو ہیولویاٹ کا ماننا ہے کہ الضیف سات اکتوبر کے حملوں کی منصوبہ بندی کرنے والوں میں سے تھے کیونکہ یہ ایک فوجی آپریشن تھا لیکن السنوار "ممکنہ طور پر اس گروپ کا حصہ ہوں گے جس نے اس حملے کی منصوبہ بندی کی اور اس فیصلے پر اثرانداز ہوئے۔" السنوار حماس کے سربراہ اسماعیل ہنیہ کے نائب تصور کیے جاتے ہیں اور اسرائیل کا ماننا ہے کہ وہ غزہ میں زیرِ زمین سرنگوں کہیں اپنے باڈی گارڈز کے ساتھ موجود ہیں اور اس ڈر سے کسی سے رابطہ نہیں کر رہے کہ کہیں ان کی

لوکیشن کے بارے میں اسرائیل کو معلوم نہ ہو جائے۔

غزہ کی پٹی کے جنوب خان یونس کے ایک پناہ گزین کیمپ میں پیدا ہونے والے 61 برس کے یحییٰ السنوار جنہیں ابو ابراہیم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کے والدین کا تعلق عسقلان سے تھا اور انہیں النکبہ یعنی اسرائیل کے قیام کے نتیجے میں 1948 میں بڑے پیمانے پر جبراً اپنے آبائی علاقے کو چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔ انہوں نے خان یونس کے ایک سیکنڈری سکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر غزہ کی اسلامک یونیورسٹی سے عربی زبان میں بیچلرز کی ڈگری حاصل کی تھی۔

واشنگٹن انسٹیٹیوٹ آف نیئر ایسٹ پالیسی میں ریسرچ فیلو احد یاری نے السنوار کا جیل میں چار بار انٹرویو کیا ہے۔ ان کے مطابق السنوار جوانی کے دنوں میں خان یونس "اخوان المسلمون" تنظیم کے گڑھ کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ عسکریت پسند گروہ نوجوانوں کیلئے ایک بھرپور تحریک تھی جس کیلئے وہ پناہ گزین کیمپوں کی غربت کی زندگی گزارتے ہوئے مساجد میں جایا کرتے تھے جو بعد میں حماس کیلئے ایسی ہی اہمیت کی حامل ہونے والی تھی۔ السنوار کو 1982 میں پہلی مرتبہ اسرائیل نے اس وقت گرفتار کیا جب وہ 19 برس تھے۔ انہیں "انتہا پسند سرگرمیاں" کرنے پر 1985 میں دوبارہ گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب انہوں نے حماس کے وہیل چیئر تک محدود بانی شیخ احمد یاسین کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ انسٹیٹیوٹ برائے نیشنل سکیورٹی سٹڈیز تل ابیب میں سینیئر ریسرچر کوبی مائیکل کے مطابق دونوں کے درمیان قربت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ رشتہ السنوار کے تنظیم میں ان کے بارے میں وفاداری اور خلوص جیسے انمٹ تاثر نے بڑا گہرا تاثر چھوڑا۔

دو سال بعد 1987 میں حماس کا قیام عمل میں آیا اور السنوار نے ہی گروپ کا داخلی سکیورٹی شعبہ قائم کیا جسے المجد کا نام دیا گیا۔ وہ اس وقت صرف 25 سال کے تھے۔ المجد جلد ہی ایسے لوگوں کو سزائیں دینے کے بارے میں بدنام ہوا جن پر اخلاقی جرائم کے الزامات تھے۔ مائیکل کے مطابق انہوں نے اس دوران ایسی دکانوں پر چھاپے مارے جو "سیکس ویڈیوز" رکھتے تھے اور ساتھ ہی ایسے کسی بھی شخص کو ہلاک کر دیا جس پر اسرائیل کے ساتھ تعاون کرنے کا الزام تھا۔ یاری کے مطابق "وہ ایسے آدمی ہیں جن کے ارد گرد ان کے حمایتی اور مداح اکھٹے ہو جاتے ہیں۔ 1988ء میں السنوار نے مبینہ طور پر دو اسرائیلی فوجیوں کا اغوا اور ہلاکت کی منصوبہ بندی کی تھی۔ انہیں اسی سال گرفتار کیا گیا تھا اور اسرائیل میں انہیں 12 افراد کے قتل کے باعث چار مرتبہ عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔

السنوار نے 1988 سے 2011 تک 22 سال جیل میں گزارے جو ان کی ادھیڑ عمر کا بڑا حصہ بنتا ہے۔ وہاں ان کا وقت کچھ عرصہ قیدِ تنہائی میں بھی گزرا اور اس کے باعث ان میں عسکریت پسند عنصر مزید شدت پکڑ گیا۔ یاری کا مزید کہنا ہے کہ "وہ طاقت کے ذریعے اپنا دبدبہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے خود کو قیدیوں میں بطور رہنما منوایا اور جیل انتظامیہ سے ان کیلئے مذاکرات بھی کیے اور قیدیوں میں نظم و ضبط قائم کرنے کی کوشش بھی کی۔ "اسرائیلی حکومت کے مطابق وہ ایک "جابر" دبدبے والے اور بااثر رہنما ہیں جن میں برداشت، چالاکی اور ساز باز کرنے اور تھوڑے وسائل پر گزارا کرنے کی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔ وہ جیل میں بھی قیدیوں کے درمیان رازر کھتے تھے، اور ان میں ہجوم کی سربراہی کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔"

یاری کا السنوار کے بارے میں تجزیہ بھی دلچسپ ہے۔ یہ ان تمام ملاقاتوں کے بعد سامنے آیا ہے جو ان کے درمیان جیل میں ہوئی تھیں۔ یاری کے مطابق وہ ایک "نفسیاتی مریض" ہیں لیکن صرف یہ کہنا کہ السنوار نفسیاتی مریض ہیں، ایک غلطی ہو گی کیونکہ پھر آپ ان کے اس پر اسرار اور پیچیدہ شخصیت کو نظر انداز کر جائیں گے۔ السنوار ایسا انتہائی شاطر اور چالاک شخص ہے جسے اپنی شخصیت کی کشش میں اضافہ کرنا اور اسے کم کرنا آتا ہے۔ السنوار کا کہنا ہے کہ اسرائیل کو تباہ کرنا ضروری ہے اور فلسطین میں یہودیوں کی کوئی جگہ نہیں۔ ساتھ ہی "مذاق میں یہ بھی کہہ دیتے کہ ہو سکتا ہے کہ ہم ان کیلئے گنجائش نکال لیں۔"

جب السنوار جیل میں تھے تو انہوں نے عبرانی زبان پر عبور حاصل کر لیا تھا اور اسرائیلی اخبارات پڑھتے تھے۔ سنوار ہمیشہ ان کے ساتھ عبرانی زبان میں بات کرنے کو ترجیح دیتے حالانکہ یاری خود عربی زبان بولنا جانتے تھے۔ یاری کے مطابق "وہ عبرانی زبان کو بہتر کرنا چاہتے تھے۔ میرے خیال میں وہ کسی ایسے شخص سے بات کر کے زبان میں مہارت حاصل کرنا چاہتے تھے جو جیل وارڈن سے بہتر عبرانی زبان بول سکیں۔

السنوار کو 2011 میں ایک معاہدے کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا جس میں 1028 فلسطینی اور اسرائیلی عرب قیدی رہا ہوئے تھے اور اس کے بدلے میں اکیلے اسرائیلی یرغمالی فوجی جیلاد شالیت کی رہائی ممکن ہوئی۔ خیال رہے کہ شالیت کو اغوا کے 5 سال بعد تک یرغمال بنایا گیا تھا اور یہ کام حماس کے دیگر کارکنوں سمیت السنوار کے بھائی نے کیا تھا جو اس وقت بھی حماس کے سینیئر فوجی کمانڈر ہیں۔ السنوار نے اس کے بعد سے مزید اسرائیلی فوجیوں کے اغوا پر زور دیا ہے اور حالیہ جنگ میں اسرائیلیوں کو اغوا کرنے کے پیچھے یہی پالیسی کارفرما ہے۔ یاد رہے کہ اس مرتبہ تین اسرائیلی جنرلز اور دیگر اہم اسرائیلی عہدیدار حماس کے قبضے میں ہیں۔ اس وقت تک اسرائیل نے غزہ کی پٹی کا قبضہ ختم کر دیا تھا اور اس پر حماس کا کنٹرول تھا۔ یہ الیکشن جیتنے اور اپنے حریف یاسر عرفات کی جماعت الفتح پارٹی کو پٹی سے مکمل طور پر ختم کرنے کی وجہ سے ہوا۔ اس دوران الفتح پارٹی کے متعدد کارکنوں کو عمارتوں کے اوپر سے نیچے پھینکا گیا تھا۔

مائیکل کے مطابق جب السنوار غزہ واپس گئے تو انہیں فوری طور پر بطور رہنما تسلیم کر لیا گیا۔ اس کا زیادہ تعلق اس بات سے تھا کہ انہوں نے حماس کے بانی لیڈر کے طور پر نام کمایا تھا اور انہوں نے اپنی زندگی کے 22 سال جیل میں گزارے تھے۔ اس کے علاوہ لوگ ان سے ڈرتے تھے، یہ وہ شخص ہے جس نے لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں بہت ظالم، جارح مزاج اور پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔

یاری کا کہنا ہے کہ 'انہیں اچھی تقریر کرنی نہیں آتی لیکن جب وہ عوام سے بات کر رہے ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہجوم میں سے ہی کوئی بول رہا ہے اور ان کے دل کی باتیں کر رہا ہے۔ سب ہی السنوار کی صداقت پر مر مٹنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ جیل سے رہا ہونے کے فوراً بعد السنوار نے فوری طور پر عزالدین القسام بریگیڈز اور چیف آف سٹاف مروان عیسیٰ سے اتحاد کر لیا۔ 2013 میں انہیں غزہ میں حماس کے سیاسی بیورو کا رکن منتخب کیا گیا جس کے بعد 2017 میں انہیں اس کا سربراہ بنا دیا گیا۔

السنوار کے چھوٹے بھائی محمد نے بھی حماس کیلئے اہم کردار ادا کیا۔ وہ اسرائیل کی جانب سے متعدد قاتلانہ حملوں میں بچنے میں کامیاب ہوئے لیکن پھر حماس نے 2014 میں ان کی ہلاکت کی تصدیق کر دی۔ اس حوالے سے ایسی میڈیا رپورٹس بھی سامنے آئی ہیں کہ وہ اب بھی زندہ ہیں اور حماس کے

عسکری شعبے میں متحرک ہیں اور غزہ میں سرنگوں میں چھپے ہوئے ہیں اور ممکنہ طور پر 7 اکتوبر کے حملوں میں بھی اہم کردار ادا کر چکے ہیں تاہم اس حوالے سے تاحال کچھ بھی واضح نہیں۔ مشہور زمانہ امریکی مصنف "ڈی براؤن اپنی کتاب "زخمی گھٹنے پر میرے دل کو دفن کریں" میں لکھتے ہیں:

اسرائیل کیلئے امریکیوں کی حمایت پر ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ تاریخ کا تھوڑا سا علم بتاتا ہے، دونوں ایک جیسی مشابہت پر بنائے گئے ہیں۔ غزہ فلسطین کے آبائیوں کو مار ڈالو، ان کی زمینوں اور املاک پر قبضہ کر لو اور جو بچیں انہیں ریزرویشن (کیمپوں) میں منتقل کر دو۔ اسرائیلیوں کے مظالم بھی بالکل ویسے ہی ہیں جس طرح امریکیوں نے مقامی لوگوں (ریڈ انڈینز) کے ساتھ کیا تھا۔ امر کی فوج کی سب سے بڑی بہادر کاروائی 29 دسمبر 1890ء اس کی فوج کیولری 7 نے لکوٹا قبیلے کی 500 سے زیادہ غیر مسلح خواتین اور بچوں کے قتل عام پر مبنی ہے اور ظلم تو یہ ہے کہ امریکی فوج کی کیولری کو 6 میڈل آف آنر سے نوازا گیا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ امریکیوں کو مکمل تاریخ پڑھنے کا مشورہ دیا جائے۔

بروز سوموار 15 جمادی الاول 1445ھ 27 نومبر 2023ء

اب کس کی باری ہے؟

عالم عرب میں مرد آہن کہلانے والے جمال عبد الناصر کے بارے میں حال ہی میں منظر عام آنے والی برطانوی مصنف جیمز بار کی تازہ ترین کتاب ''دی لارڈز آف ڈیزرٹ'' میں انکشاف کیا گیا ہے کہ مصر میں 1952ء کا فوجی انقلاب امریکا کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے اُکسانے اور اس کے عملی تعاون سے برپا ہوا تھا۔ فوجی انقلاب کے ترجمان ریڈیو اسٹیشن وائس آف عرب کا قیام بھی سی آئی اے کی مدد سے ممکن ہوا اور لیفٹیننٹ کرنل جمال عبد الناصر نے اپنے ساتھیوں کی ملی بھگت سے شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا۔ کتاب کے مصنف جیمز بار نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مصر میں اس فوجی انقلاب کی وجہ امریکا اور برطانیہ کے درمیان مشرق وسطیٰ میں اپنا اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کشمکش تھا۔ برطانیہ مصری بادشاہ شاہ فاروق کی حمایت کر رہا تھا جبکہ سی آئی اے اپنے مجوزہ پروگرام کی تکمیل میں اسے رکاوٹ سمجھتے تھے۔

اس انقلاب کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مصری فوج کے اندر 1948ء میں اسرائیل کے ہاتھوں غیر متوقع شکست کی وجہ سے بہت بے چینی تھی اور مصری عوام بھی اپنی اس شکست پر اس قدر جذباتی تھے کہ انہوں نے اس فوجی انقلاب کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ ناصر کو اپنا ہیرو مانتے ہوئے دیوانگی کی حد تک اس کے ہر عمل کی نہ صرف تائید کی بلکہ اس کے تمام ناجائز اقدامات کو بسر و چشم قبول بھی کر لیا۔ سی آئی اے کو اپنے دوررس پروگرام کے مطابق آئندہ اس خطے میں اسرائیل جیسے ناسور کے ذریعے اپنا اثر ورسوخ قائم رکھنا مقصود تھا جس میں امریکا آج تک تمام عرب ممالک پر اپنی اجارہ داری رکھنے میں کامیاب نظر آتا ہے، اس لئے کرنل ناصر اور اس کے ساتھیوں کی مدد کر کے شاہ فاروق کا تختہ الٹنے میں تاخیر نہیں کی۔

برطانوی مصنف جیمز بار نے برطانوی دفتر خارجہ کی دستاویزات اور دیگر تاریخی دستاویزات کی مدد سے اپنی کتاب میں مشرق وسطیٰ کے بارے میں برطانیہ اور امریکا کے درمیان مسابقت اور تعاون پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ فوجی کاروائی سے دو دن قبل کرنل ناصر نے برطانیہ اور امریکا کو فوج کی طرف سے ٹیک اوور کرنے کے منصوبے کے بارے میں باقاعدہ اعتماد میں لیا تھا۔ اگرچہ انقلاب کی تمام تر منصوبہ بندی جمال عبد الناصر نے سی آئی اے کی مدد سے مکمل کی تھی جس میں طے کیا گیا کہ جنرل نجیب عہدے کے لحاظ سے سب سے سنئیر، فوج میں اچھی شہرت، اپنے تجربے اور پروفیشنل کی بناء پر بہت مقبول ہیں، ان کو عارضی طور پر انقلاب کا سربراہ بنا دیا گیا کیونکہ عبد الناصر کے فوج میں جونیئر رینک افسر ہونے کی وجہ سے فوج میں بغاوت ہونے کا بھی خدشہ تھا۔ پہلے سے طے شدہ سازش کے تحت کچھ ہی عرصے بعد جنرل نجیب کو ہٹا کر کرنل ناصر نے 1956ء میں باقاعدہ مصر کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔

اپنے مجوزہ منصوبہ بندی کے تحت سی آئی اے نے اس خطے میں جمال عبدالناصر کو ہیرو بنانے کیلئے ایک اور چال چلی اور اسی سال (1956ء) جب جمال عبدالناصر نے نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کیا تو برطانیہ اور فرانس نے اسرائیل کے ساتھ مل کر نہر پر قبضہ کرنے کیلئے مصر سے جنگ شروع کر دی لیکن اس وقت کے امریکی صدر آئزن ہاور نے فرانس، برطانیہ اور اسرائیل کو بزور طاقت کی دھمکی دیتے ہوئے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس پسپائی پر برطانیہ کو فوجی، سیاسی اور سفارتی محاذ پر انتہائی خفت کا سامنا کرنا پڑا اور اس واقعہ کے بعد مشرق وسطیٰ میں اس کا اثر ورسوخ کم ہوتا چلا گیا اور پورا خطہ امریکی حلقہ اثر میں آ گیا۔ اس سارے ڈرامے میں امریکا کی آشیر واد پر اسرائیل نے بڑی مکاری کے ساتھ برطانیہ اور فرانس کا ساتھ دینے کا محض کردار ادا کیا جبکہ امریکا کے پیش نظر تو مشرق وسطیٰ پر اپنا تسلط قائم کرنے کی بنیادی وجہ اس علاقے میں اسرائیل کی حفاظت اور مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر تک رسائی اور اجارہ داری تھی جس میں وہ آج تک کامیاب نظر آتا ہے۔

امریکی مدد سے اسرائیل کو فوجی لحاظ سے تمام عربوں کے مقابلے میں اتنا طاقتور بنا دیا گیا کہ 1967ء کی جنگ میں مصر، شام اور اردن تین ممالک کی مشترکہ افواج کو چھ دنوں کے اندر اسرائیلی فوج نے شکست دے کر بیت المقدس، غزہ اور باقی ماندہ فلسطین، اردن کے مغربی کنارے، گولان کی پہاڑیوں اور مصر کے جزیرہ نما سینائی پر قبضہ کر لیا۔ نصف صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی اسرائیل کا ان علاقوں پر (سوائے مصر کے جزیرہ نما سینائی) قبضہ برقرار ہے۔

فوج کے ذریعے حکومتوں کو گرانے اور تبدیل کرنے کی سی آئی اے کی یہ سرگرمیاں صرف مصر تک محدود نہیں رہیں۔ مصر میں فوج کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کا جو سلسلہ 1952ء میں شروع ہوا تھا، وہ 1953ء میں ایران میں ڈاکٹر محمد مصدق کی حکومت کو ختم کر کے آگے بڑھایا گیا اور اس کے دس سال بعد صدام حسین نے عراقی بادشاہت کو بعث پارٹی کے ذریعے فوجی انقلاب برپا کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ 2003ء میں صدام کو اقتدار سے ہٹانے کیلئے امریکا اور برطانیہ نے عراق پر براہ راست حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ ان واقعات کے بعد میری نظر پاک وہند کے مابین ہونے والی محدود جنگ کارگل پر جا کر رک جاتی ہے کہ کیا کارگل کی جیتی ہوئی جنگ کو شکست میں تبدیل کر کے مشرف کو اقتدار میں لانے اور بعد ازاں نائن الیون واقعے میں مشرف کی امریکا کی غیر مشروط حمائت کی بناء پر اس خطے میں امریکا کے تسلط کو دوام دینے کی کوئی سازش تو نہیں تھی؟

تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو اس طرح حکومتوں کو گرانے اور تختہ الٹنے کا جو سلسلہ 1952ء میں مصر سے شروع ہوا تھا، وہ آج بھی مسلمان ممالک میں کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے لیکن میرے رب کا اپنا پروگرام ہے کہ اس صدی میں سب سے بڑی جارحیت کے باوجود افغانستان میں ایک بڑی رسوائی کا داغ اس کا مقدر بنا دیا جو اپنے تکبر میں اپنے سر پر سپر پاور کا تاج سجائے بیٹھا ہے لیکن سب سے زیادہ تلخ حقیقت یہ کہ جن طالع آزماؤں نے اقتدار میں آنے کیلئے سی آئی اے کے منصوبے پر عمل کیا، اسی نے ان کو شکست سے دوچار اور ان کے ممالک کو تباہ کر کے اقتدار سے الگ کیا۔ ناصر، صدام اور مشرف اس کی عبرتناک مثال ہیں۔

اجل نے نہ کسریٰ ہی چھوڑا نہ دارا
اسی سے سکندر سا فاتح بھی ہارا
ہر ایک چھوڑ کے کیا کیا حسرت سدھارا
پڑا رہ گیا سب یہیں ٹھاٹ سارا
جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

بروز بدھ 17 جمادی الاول 1445ھ 29 نومبر 2023ء

خوف سے نجات کیسے؟

نہ کوئی دنیا کی حقیقتوں کو جانتا ہے اور نہ ہی اپنے ارد گرد بکھرتی قوموں اور تباہ ہوتی ہوئی قوتوں کو دیکھتا ہے۔ عذاب کے فیصلوں اور اللہ کی جانب سے نصرت کے مظاہروں کو دیکھنے کیلئے کسی تاریخ کی کتاب کھولنے یا عاد و ثمود کی بستیوں کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ابھی کل کی باتیں ہیں۔ میرے اللہ کا فرمان ہے کہ جب ہم کسی قوم پر کوئی آفت نازل کرتے ہیں تو وہ اس کی مادی توجیہات کرنے لگ جاتا ہے۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ دنیا کی ایک ایٹمی سپر طاقت جس کے پاس اس ساری دنیا کو کئی مرتبہ تباہ کرنے کا سامان موجود ہو، جس کی تسخیر خلاؤں تک ہو، جو دنیا میں پچاس سے زیادہ کیمونسٹ تحریکوں کی براہ راست مدد کرتا ہو، بے خانماں، بے سروساماں افغان مجاہدوں نے صرف اپنے رب کے بتائے ہوئے حکم جہاد کے ذریعے اس کے چھ ٹکڑے کر دیئے۔ اس کے بعد دنیا کی واحد سپر پاور اور افغانستان کو ڈیڑھ منٹ میں خاکستر کرنے کا دعویٰ کرنے والوں کو دوحہ میں ساری دنیا کے سامنے ان مجاہدوں کی شرائط پر صلح نامہ پر دستخط کر کے انخلاء کی بھیک مانگنا پڑی ہو۔

کسی ایک محاذ پر شکست کے بعد قومیں متحد ہو جایا کرتیں ہیں، انتقام کیلئے، اپنے آپ کو مزید طاقتور کرنے کیلئے، لیکن جو مسلمان قوم جہاد سے منہ موڑ لے تو قدرت اس قوم کیلئے زوال و رسوائی کا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ ان کو نفرت، تعصب، بھوک، افلاس اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہونے کا مزا چکھا دیا جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امریکا 1901ء سے چین، فلپائن، کوریا، ویت نام، جنوبی امریکا دنیا کے دیگر 39 ممالک سے ذلیل و رسوا ہو کر نکلا ہے لیکن وہ طاقت کے پجاری جن کا دل ہی نہیں مانتا کہ اس کائنات پر ایک اور حکمران طاقت ہے جس کا یہ وعدہ ہے کہ اگر تم مجھ پر یقین کرو تو تم قلیل بھی ہو گے تو زیادہ طاقت پر غالب آؤ گے۔ یہ لوگ پھر بھی توجیہات کرتے ہیں لیکن آخر میں انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

قدرت نے ہر انسان کے سینے میں ایک چھوٹا سا ایٹم بم "دل" کی شکل میں نصب کر رکھا ہے۔ یہ چھوٹا سا لوتھڑا پہاڑوں سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتا ہے اگر اس میں صرف ایک رب کا خوف موجود ہو، سارا باطل اس سے لرزاں اور خوفزدہ رہتا ہے، لیکن اگر اس میں دنیا کا خوف بٹھا لیں تو ہر دن رسوائی کی موت آپ کی منتظر رہتی ہے۔ جو مسلمان قوم جہاد سے منہ موڑتی ہے تو ہر دن رسوائی کی موت اس کی منتظر رہتی ہے۔ ہم ایک جوہری قوت ہوتے ہوئے بھی لوگوں سے اپنے امن کی بھیک مانگ رہے ہیں اور دوسری طرف دنیا کی تمام جوہری طاقتیں افغان طالبان سے مذاکرات کیلئے راستہ ڈھونڈتی رہی جنہوں نے صرف جہاد کا سہارا لیکر اپنے وجود کو منوایا۔

دہشتگردی، شر پسندی اور تخریب کاری پر قابو پانے کے دعوے بھی عجیب ہیں، ہر روز میڈیا پر ان دہشتگردوں، شر پسندوں اور تخریب کاروں کو کچل دینے کے تبصرے اور تجزیئے سنتا ہوں تو حیرت میں گم ہو جاتا ہوں۔ اس دنیا کے نقشے میں کوئی اقتدار کی کرسی پر بیٹھا ہوا شخص کسی ایک ملک کی بھی نشاندہی کر سکتا ہے جو فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ وہ دہشتگردی پر قابو پانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ امریکا سے برطانیہ، پورا یورپ، عراق سے لیکر سری لنکا تک، بھارت سے لیکر افغانستان تک، سب حکومتیں بے بس ہیں، مجبور ہیں، لاچار ہیں لیکن کوئی اس بے بسی اور کمزوری کو قبول نہیں کر رہا بلکہ ایسے ہی تجزیوں اور تبصروں پر عملدرآمد کی بناء پر اس دلدل میں پھنستے جا رہے ہیں لیکن ضربِ عضب اور ردّالفساد آپریشنز نے اپنی جانوں کی قربانیوں سے سر کر کے دکھا دیا۔ کوئی یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ مقلب القلوب صرف ایک ذات پروردگار ہے جو دلوں کو بدلتا ہے، ان کو محبت سے بھر دیتا ہے

لیکن امریکا اور بھارت نے تو نفرت سیکھی ہے لیکن دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم میں یہ بلا نازل ہوئی وہ اپنی پوری صلاحیت کے باوجود اس سے نہیں لڑ سکی۔

امریکا اور مغربی ممالک (جن کے گھٹنوں کو چھو کر ہمارے حکمران دن رات بھیک مانگ رہے ہیں) جو جدید ٹیکنالوجی رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں جہاں ہزاروں افراد اپنی اس ٹیکنالوجی کی بدولت دہشتگردوں کی بو سونگھتے رہتے ہیں جہاں کوئی شہری اپنے پڑوسی میں کسی لمبی داڑھی والے کو دیکھ لیں تو فوراً پولیس کو آگاہ کرتے ہیں، باہر سے آنے والوں کو گھنٹوں ائیر پورٹ پر سیکورٹی کے نام پر ذلیل کیا جاتا ہے، کیا وہاں یہ سب ختم ہو گیا؟ یا ان کے شہر ان خطروں سے محفوظ ہو گئے ہیں؟ یا ان کا خوف کم ہو گیا؟ ہر گز نہیں، ہم تو ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیا دنیا کے کسی خطے میں ایسا ہوا ہے؟ ویت نام، لاؤس، فلسطین، سری لنکا، چلی، نکاراگوا، کمبوڈیا، کہاں کسی نے میڈیا پر ایسی دوکانداری چمکائی ہے؟ لیکن شاید یہ خود کو بہت طاقتور اور دانشور سمجھتے ہیں۔ درپردہ ہمارے کچھ سیاسی لیڈر اور دشمن تو یہی چاہتے ہیں کہ بلوچستان اور فاٹا میں جاری آپریشن ناکام ہوں، عوام کا خون اور بہے اور گھرانے ماتم کدہ بن جائیں اور لوگ اس آگ میں جھلس جائیں اور پھر مجبور ہو کر سر جھکا کر ان کی ہر بات، ہر مطالبہ مان لیں، جوہری اثاثوں اور کشمیر سے دستبرداری اور بھارت کی غلامی اختیار کر لیں لیکن وقت نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایسا نہ کبھی پہلے ہوا تھا اور نہ ہی آئندہ ہو گا۔

ہمارے خطے میں حالات تیزی سے بدل رہے جو آئندہ دنیا میں ایک بہترین معاشی انقلاب کی نوید ثابت ہوں گے جس کو امریکا اپنے حق میں تباہی سمجھ کر انڈیا کو استعمال کر رہا ہے۔ یہ بات طے ہے کہ مستقبل میں جس ملک کے پاس زیادہ تجارتی و معاشی منڈیاں میسر ہوں گی وہی سپر طاقت کا حق دار ٹھہرے گا۔ چین کے سی پیک اور ون روڈ ون بیلٹ پراجیکٹس نے امریکا سمیت بھارت و اسرائیل میں خطرات کی گھنٹیاں بجادی ہیں اور سب سے زیادہ انڈیا خود کو غیر محفوظ سمجھ کر دوطرفہ فوائد سمیٹنے کیلئے کوشاں ہے۔ اس نے اپنے آقا امریکا کو خوش کرنے کیلئے لداخ سے گلگت بلتستان پر لشکر کشی کر کے سی پیک روٹ پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھا تھا جس کا اس کو خاطر خواہ جواب ایسا ملا کہ خود بھارتی وزیر دفاع کو اپنی پارلیمنٹ میں لداخ کے 36 ہزار مربع کلومیٹر پر چین کے قبضہ پر اپنی سبکی کو تسلیم کرنا پڑا۔ جس کے بعد بیک ڈور چینل پر یو اے ای نے سرحدوں پر سیز فائر کروا کے پاک و ہند کے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کی لیکن اب بھی ہمارے پالیسی ساز اور دفاعی اداروں کو ایسی مربوط پالیسی بنانے کی ضرورت ہے کہ آئندہ اگر بھارت نے اس مشکل سے نکلنے کیلئے پاکستان کے ساتھ محاذ کھولنے کی کوئی کوشش کی تو ہماری اسٹریٹجی کیا ہو گی؟ دفاعی تجزیہ نگاروں کے نزدیک اس دفعہ زمینی حقائق تو پاکستانی افواج کے حق میں ہیں۔

اہل نظر پچھلے کئی ماہ سے خبردار کرتے چلے آرہے ہیں۔ ربِّ کریم کے سامنے اپنی عاجزی، بے بسی کی دعائیں اور جہاد سے منہ موڑنے پر استغفار کی ضرورت ہے۔ جن کے دلوں میں امریکا کا خوف اور ہاتھوں میں کشکول ہے ان کے تکبر ٹوٹنے اور ٹائی ٹینک کے ڈوبنے کا وقت آن پہنچا ہے اور اس حال میں چوہے سب سے پہلے جہاز چھوڑتے ہیں لیکن اب تو شاید ان چوہوں کا مقدر بھی ہمیشہ کیلئے غرق ہونا ٹھہر گیا ہے۔ کیا خوابوں کی تعبیر کا وقت آن پہنچا ہے؟

جب تک نہ جلے دیپ شہیدوں کے لہو سے
سنتے ہیں کہ جنت میں چراغاں نہیں ہوتا

بروز جمعرات 18 جمادی الاول 1445ھ 30 نومبر 2023ء

مہلتِ عمل بہت تھوڑی

میں کا چکر۔ دھوکا ہی دھوکا اور خود فریبی، یہ میں کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا، ہاں ایسا ہی ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ دربارِ عالیہ میں مسند نشیں خوشامد پسند حکمران اور چاپلوس مشیرانِ کرام... راگ رنگ کی محفلیں، ناؤنوش کا دور اور عوام کا درد و غم یکساں کیسے ہو سکتے ہیں! ہو ہی نہیں سکتے۔ نہیں جناب آپ نے بجا ارشاد فرمایا... آپ ہی تو صحیح فرماتے ہیں... آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں آپ کے ارشاداتِ عالیہ۔ دُرِ نایاب ہیں آپ، نجات دہندہ اور زمین پر جئیں کا نعرہ اور خود فریبی میں رچا بسا فریب خوردہ انسان۔ اتنی خدا کا سایہ۔ رحمتِ باری تعالیٰ اور اوتارِ زمانہ ہیں آپ سرکار آپ جئیں ہزاروں سال سدا آوازوں میں کون اپنے آپ میں رہتا ہے۔ جامے سے باہر ہو ہی جاتا ہے۔

لیکن کون جیا ہے سدا! کوئی بھی نہیں۔ سب کو چلے جانا ہے۔ زندگی پر موت کا پہرہ ہے۔ نہیں بچا کوئی۔ کوئی بھی تو نہیں بچا لیکن کون سمجھائے جب قلب سیاہ ہو کر پتھر بن جائے چاہے دھڑکتا ہی ہو، اس سے کیا ہوتا ہے! ہاں پتھر تو پتھر ہوتا ہے۔ فریب ہی فریب اور دھوکا ہی دھوکا۔ زمین پر پاؤں ٹکنے ہی نہیں دیتا یہ دھوکا۔ چاہے کچھ کر لیں... ہاں کچھ بھی، نہیں بچ سکا کوئی بھی موت کے منہ سے۔ بے حس و سفاک موت، کسی کو خاطر میں نہ لانے والی۔ ہاں وہ کسی کی بھی دھمکی نہیں سنتی، کسی کے نام و نسب، منصب و جاگیر سے اجنبی موت، لیکن پھر بھی جیئے جیئے، سدا جیئے کا خمار۔ ایسا نشہ جو سارے نشے کو دو آتشہ اور سہ آتشہ کر دے۔ آہ نہیں بچا کوئی۔ آگ و خون کی بارش کرنے والے بھی اور مظلوم، معصوم اور مقہور بھی۔ نہیں کوئی نہیں بچا۔ لیکن پھر سب ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ تب خیال آتا ضرور ہے لیکن ساعت و لمحات بیت چکے ہوتے ہیں، سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا ہے، پھر پل کی خبر نہیں ہوتی حالانکہ سامان سو برس کا دھرا ہوتا ہے۔

وہ مجھے اکثر کہتا ہے کوالٹی لائف ہونی چاہیے۔ ہاں! وہ اسی طرح کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ہر چیز وافر اور وقت نپا تلا۔ لیکن کیا یہ ہے کوالٹی لائف؟ اچھی نوکری کیلئے بہترین تعلیم حاصل کرنا، پھر پیسے جمع کرنا اور کرتے ہی چلے جانا۔ پھر ایک خوبصورت لڑکی سے شادی۔ ایک آسائشوں بھرا گھر اور اس کے لان میں بچھی ہوئی آرام دہ کرسی پر جھولتے ہوئے گپ شپ۔ بس یہ ہے آج کی کوالٹی لائف۔ کیا یہی ہے زندگی! میری ماں، ایک دیہاتی ان پڑھ لیکن زندگی کے رازوں سے خوب واقف۔ میری زندگی کی تمام رازوں سے بھی واقف جبکہ میں اپنے تمام معاملات ان سے پوشیدہ رکھنے کی مکمل اداکاری کرتا رہتا ہوں لیکن فون پر بھی دل کی چوری پکڑ لیتی ہیں۔ ایک دن فرمانے لگیں: کچھ لوگوں کی زندگی پتا ہے کیسی ہوتی ہے؟ میں نے نفی میں سر ہلایا کہ نہیں پتا۔ تو مسکرا کر کہنے لگیں: ان کی زندگی ہوتی ہے "نہ ہم کسی کے نہ ہمارا کوئی"۔ کسی سے کوئی مطلب ہی نہیں... بس میں، میں اور میں کا چکر۔

زندگی پر موت کا پہرہ ہے۔ ان کا یہ جملہ ہر وقت میری سماعتوں میں رس گھولتا ہے۔ میں اکثر ان سے زندگی کے مختلف رشتوں کی بات کرتا تو فوری ایک ہی جواب ملتا: "پیٹ کی نہ ماننا یہ کبھی نہیں بھرتا۔ دنیا بھر کی نعمتیں اس پیٹ میں ڈال لے، اگر ایک وقت کا فاقہ آ گیا تو ہٹ دھرمی سے کہنے لگتا ہے میں نے تو آج تک کچھ کھایا ہی نہیں۔ پیٹ بھی ایک جہنم ہے"۔ کیا تشبیہ ہے یہ۔ زندگی پر موت کا پہرہ ہے۔ مت بھولنا۔

ہم اگر بھول بھی جائیں تب بھی کیا ہو گا؟ کچھ نہیں۔ خود کو فریب دیں گے۔ موت تو ہمیں نہیں بھولتی۔ زندگی کے ساتھ ہم سفر موت، کبھی نہیں مہلت دیتی۔ آ کر رہتی ہے۔ بس ایک فرق ہے۔ کس نے کس طرح موت کا استقبال کیا۔ بس یہ ہے اصل۔ ایک دن انہوں نے مجھے کہا تھا: دیکھ، سامان اوّل

تو ہونا ہی نہیں چاہیے اور اگر ہو بھی تو بس مختصر۔ دیکھ، موت کی گاڑی زندگی کے ساتھ ہی روانہ ہوتی ہے، تجھے کسی اسٹیشن پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کوئی وقت ہی نہیں جو تجھے معلوم ہو لیکن آتی بروقت ہے۔ اس لیے بس چھوٹی سی گٹھڑی سے زیادہ جمع نہ کرنا، موت کی ٹرین آئے تو بس ہنس کھیل کر سوار ہو جانا۔ ہونا تو ہے، تو پھر ہنس کھیل کر کیوں نہیں۔ اور پھر ان کا نعرۂ مستانہ گونجتا "کوئی بھی نہیں بچے گا، آ آ مجھے تو تیار پائے گی"۔ انسان اور بندۂ عاجز لیکن طاقت کے زعم میں لتھڑا ہوا۔ فریب وہاں ماریں گے، کوئی نہیں بچے گا، نہیں چھوڑیں گے، بس خوردہ سمجھ ہی نہیں پاتا، بس اتنی طاقت کے نشے میں چُور چلا تا رہتا ہے: یہاں سے ماریں گے، ماریں گے ہم، ہلاک کر دیں گے۔ اور پھر آگ و خون کی بارش برستی ہے اور موت کا ہرکارہ پروانۂ اجل تقسیم کرنے لگتا ہے، اور پھر سب رخصت ہو جاتے ہیں، سب نے ہونا ہے رخصت۔

مجھے یاد آیا، اُس کی گردن تن سے جدا کرنے لگے تو پکارنے لگا: رب کعبہ کی قسم، میں تو کامیاب ہو گیا۔ ہاں یہ بھی ایک موت ہے، بارود کی بارش میں معصومیت کا قتل عام۔ کوئی بھی نہیں بچے گا جناب۔ زندگی پر موت کا پہرہ ہے اور مہلتِ عمل بہت تھوڑی۔ دنیا دھوکا ہے، سراسر دھوکا۔ کسی کی رہی نہ رہے گی، اپنے اپنے حصے کی آگ اور اپنے اپنے حصے کے پھول لے کر سب چلے جائیں گے۔ بس دیکھ کہیں تُو اپنے لیے آگ ہی آگ تو جمع نہیں کر رہا۔ اس کی ماں نے اس ریگستان کی ٹھنڈ سے بیتاب ہو کر اس سے کہا تھا: جا! آگ لا۔ بہت دیر بعد وہ خالی ہاتھ لوٹا اور ماں کے حضور دست بدستہ عرض گزاری :"ماں! کہیں سے آگ نہیں ملی"، تب ماں نے تلخ ہو کر پکارا" جا کر جہنم سے ہی لے آتا۔" تو پھر اپنا سر خم کیا اور عرض کی "ماں وہاں بھی گیا تھا، میں نے وہاں کے نگراں سے کہا مجھے کچھ آگ درکار ہے، تب اس نے مجھے کہا جا اپنا رستہ لے، ہر انسان اپنی آگ دنیا سے خود لے کر یہاں آتا ہے۔

اپنے سر پر آگ کا ٹوکرا لادھے کئی بدنصیب آنکھوں کے سامنے آ گئے ہیں۔ اسلام آباد ہائیکورٹ نے نواز شریف کے خلاف العزیزیہ سٹیل ملز اور ایون فیلڈ اپارٹمنٹ ریفرنس میں سزا کے خلاف اپیلوں کے معاملے پر سماعت شروع کر دی ہے شائد یہ عجلت اس لئے ہے کہ انتخابات سے قبل کلین چٹ مل جائے اور اسی طرح یہ خبر بھی کانوں میں سیسہ بنا کر انڈیل دی گئی ہے کہ سابق آرمی چیف جنرل ریٹائرڈ قمر جاوید باجوہ اور آئی ایس آئی کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ فیض حمید کے خلاف اندراج مقدمہ کا کیس ہائیکورٹ کی کاز لسٹ سے منسوخ کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارے ملک کے معزز ادارے الیکشن کمیشن نے چیف الیکشن کمشنر کے خلاف "توہین آمیز بیانات" دینے کے معاملے میں فرد جرم عائد کرنے کیلئے عمران خان کو 30 نومبر کو پیش ہونے کیلئے نوٹس جاری کر دیا ہے لیکن پھر بھی ہمارے نگران وزیر اعظم کا یہ فرمان ہے کہ تمام جماعتوں کو انتخابات لڑنے کیلئے منصفانہ اور مساوی ماحول مہیا کیا جائے گا۔ جناب اب بھی وقت ہے، نہ جانے مہلتِ عمل کب ختم ہو جائے۔ زندگی کی ہمسفر ہے موت۔ نہ جانے کہاں اچک لے۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا۔ بس نام رہے گا اللہ کا۔

کبیر سریر سرائے ہے، موت سووت تُو دن رین

بروز جمعتہ المبارک 19 جمادی الاول 1445ھ یکم دسمبر 2023ء

حقیقی امن کی راہ، کیسے ؟

تاریخ کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ جو ثقافت یا تہذیب تمام معاملات پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اس کے رجحانات بھی عالمی رجحانات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس وقت مغرب ہر اعتبار سے دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ علمی، فنی، معاشی، مالیاتی اور عسکری برتری کے حامل مغرب کے اذہان پر جنگ چھائی ہوئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا بھر میں جنگ کا ماحول ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ سب جانتے ہیں کہ جنگ ایک ایسی جہنم ہے جس کے ہاتھوں سب کچھ برباد ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود پھر بھی جنگ سے اس کا جی بھرتا ہے نہ پیٹ۔ فلموں میں، ڈراموں میں، گیمز میں، کتابوں میں، گانوں میں ہر جگہ جنگ و جدل سے رغبت کا ماحول دکھائی دے رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جنگ مغرب کی ثقافت کا جزوِ لاینفک ہو کر رہ گئی ہے۔

جنگ کو پسند کرنے والی ذہنیت پیدا کرنے اور پروان چڑھانے پر بہت توجہ دی جارہی ہے۔ عنفوان شباب ہی سے جنگ کو پسند کرنے کا رجحان مغرب کے عام فرد کے ذہن میں جنم لے چکا ہوتا ہے۔ کھلونا بندوقیں، ماڈل ٹینک اور بورڈ گیمز جنگ کو ذہنی ساخت کا اندرونی یا کلیدی حصہ بنا کر اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ مغرب کے باسی زندگی بھر جنگ کو اپنے نظام اور زندگی دونوں کا لازمی حصہ تصور کریں۔

آج دنیا بھر میں جنگ و جدل سے بھرپور وڈیو گیم بہت مقبول ہیں۔ مغربی معاشروں سے ہٹ کر بھی کروڑوں بچے یہ وڈیو گیم دیکھ دیکھ کر جنگ کو اپنے مزاج میں شامل کرتے جارہے ہیں۔ قتل و غارت دیکھ دیکھ کر ذہن کی کیا حالت ہو جایا کرتی ہے اس کا اندازہ کچھ انہی کو ہو سکتا ہے، جن کی پوری زندگی جنگ و جدل میں گزری ہو۔ مغرب اپنی نئی نسل میں جنگ پسندی کو ایک رجحان کی حیثیت سے پروان چڑھا رہا ہے۔ نئی نسل قتل و غارت دیکھنے اور پھر سہنے کی عادی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ جنگ و جدل کے ماحول پر مبنی وڈیو گیم بچوں کے ذہن میں جنگ پسندی کے رجحان اور قتل و غارت سے رغبت کو کیل کی طرح ٹھونک دیتے ہیں۔

مغرب اور خاص طور پر امریکا کی ثقافت جنگ پسندی کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ ان کے ادراک اور فکر پر جنگ و جدل سے رغبت اس بری طرح سوار ہے کہ دیئے اب اس کے بغیر زندگی بسر کرنے کا تصور بھی محال ہے۔ جنگ و جدل سے رغبت نے ان کی اقدار کی ساخت میں بھی شدید منفی اثرات مرتب کر ہیں۔ امریکا کیلئے جنگ ایک ایسی حقیقت ہے جو کہیں اور واقع ہو رہی ہو، اگر امریکا کسی جنگ میں براہِ راست شریک ہو تب جنگ اس کی سرزمین سے بہت دور لڑی جارہی ہوتی ہے۔ امریکا کی بنیادی حکمت عملی یہ ہے کہ جنگ دوسروں کو لڑنی چاہیے اور اس جنگ کو جاری رکھنے میں مدد دینے کیلئے ہتھیار امریکی ہونی چاہئیں! امریکی سیاستدان اور ووٹر ہتھیاروں کے حوالے سے شدید ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں مگر ریاستی ڈھانچا اور پالیسی سازی کا عمل کچھ اس قسم کا ہے کہ بات بنتی نہیں، دال گلتی نہیں۔

امریکا جنگ کو ہوا دینے کا الزام ہمیشہ دوسروں پر عائد کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنگ پسندی کی ذہنیت کو عام کرنے میں خود اسی نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ امریکا ہی نے اپنی پالیسیوں کی مدد سے دنیا بھر میں جنگ کو ہوا دی ہے۔ کئی خطوں کو جنگ و جدل کی دلدل میں امریکا ہی نے پھنسایا ہے اور یورپ نے اس معاملے میں اس کیلئے معاون کا کردار ادا کیا ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں جو خانہ جنگیاں برپا ہیں ان کی غالب اکثریت کیلئے امریکی پالیسیاں اور اقدامات ذمہ دار ہیں۔ یورپ بھی بہت کچھ کرتا ہے اور مزید بہت کچھ کر سکتا ہے مگر مغرب کے بیشتر اقدامات امریکا کی مرضی سے طے پاتے ہیں۔ وہ

صورتِ حال کا فائدہ بھی اٹھاتا ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر کسی بھی بڑی خرابی کی ذمہ داری بھی امریکا ہی کو قبول کرنی چاہیے۔

جنگ کو ایک پسندیدہ عمل کی حیثیت سے قبول کرنے کیلئے ذہن تیار کرنے میں مغربی میڈیا نے خاصا نمایاں اور بھیانک کردار ادا کیا ہے، یورپ کے بیشتر میڈیا آؤٹ لیٹس جنگ کو ایک ایسی ناگزیر حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو قوم قبول کرلے۔ جنگ و جدل کی کوریج کچھ اس انداز امریکا اور سے کی جاتی ہے کہ لوگ قتل و غارت کے مناظر کو بھی بخوشی قبول اور ہضم کرلیں۔ جنگ کو ایک ناپسندیدہ اور تباہ کن حقیقت کی حیثیت سے پیش کرنے کی بجائے قابل قبول اور بہت حد تک کام کی چیز بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ مغربی میڈیا کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جنگ کی کوریج دیکھتے ہوئے لوگ بے مزا نہ ہوں۔

جو لوگ جنگ لڑتے ہیں اور اسے بھگتتے ہیں وہ زندگی بھر کیلئے ذہن اور جذبات کی سطح پر عدم توازن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جنگ کسی بھی معاشرے کو کس حد تک برباد کر دیتی ہے مگر ان کے پاس طاقت ہے نہ آواز۔ وہ اگر چاہیں بھی تو جنگ کے خلاف ذہن سازی نہیں کرسکتے۔ ایک بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ معاشرہ ان لوگوں سے کچھ سننے کیلئے تیار بھی نہیں جو جنگ کے تباہ کن نتائج اچھی طرح جانتے ہی نہیں بلکہ بھگت بھی چکے ہیں۔ عوام کسی بھی جنگ کو اسی طرح دیکھتے ہیں، جس طرح وہ انہیں دکھائی جاتی ہے۔ بن غازی (لیبیا) کے حوالے سے مائیکل بے نے "13 گھنٹے" اس طور پیش کی کہ دھماکے، جو کسی بھی جنگ میں سب سے خطرناک حقیقت ہوتے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے کول یعنی قابل قبول ہو جاتے ہیں۔

امریکی فوج اب بھی یہی چاہتی ہے کہ جنگ کو ایک بھرپور رجحان کی حیثیت حاصل رہے۔ اس مقصد کا حصول یقینی بنانے کیلئے اخبارات و جرائد اور ٹی وی چینلوں کے ساتھ ساتھ بالی وڈ کی فلموں سے بھی کام لیا جارہا ہے۔ نئے ہتھیاروں کی تیاری کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ بہت سی فلموں کے ذریعے نئے ہتھیاروں اور ان کی ٹیکنالوجی کا پرچار کیا جارہا ہے۔ مقصد باقی دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ اگر وہ آج کی دنیا میں جینا چاہتی ہے تو جدید ترین ہتھیار حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ جنگ پسندی کے رجحان کو پروان بھی چڑھانا ہوگا۔

امریکا اور یورپ نے اب تک دفاعی ٹیکنالوجی کے نام پر انتہائی خطرناک ہتھیار تیار کرنے پر غیر معمولی توجہ دی ہے اور پھر بہت سے خطرناک ہتھیار دنیا بھر میں فروخت بھی کئے ہیں۔ امریکی فوج تو اس جنون میں مبتلا رہی ہے کہ اس کے پاس انتہائی خطرناک ہتھیار ہوں اور اس معاملے میں کوئی بھی اس کے پاس سے ہو کر گزرنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ یہ سارا تماشا ووٹروں کے ادا کردہ ٹیکس کی مدد سے برپا کیا گیا ہے۔ تعلیم اور صحت کے اداروں کی ضرورت ہے مگر اس طرف متوجہ ہونے کی کسی کو توفیق نہیں۔ منتخب ایوانوں میں بھی یہ نکتہ کم لوگ اٹھاتے ہیں۔ سب کچھ قومی سلامتی کو بچانے کی چوکھٹ پر قربان کر دیا گیا ہے۔ قدم قدم پر سیکیورٹی رسک کا رونا رو کر شہریوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ان کے بنیادی مسائل کے حل کیے جانے سے کہیں اہم ملک کا برقرار رہنا ہے، ملک ہوگا تو ان کے مسائل بھی حل ہوں گے۔

ہتھیاروں کو اپ گریڈ کرنے اور نئے ہتھیاروں کی تیاری کے حوالے سے تحقیق و ترقی کی مد میں خطیر رقوم مختص کی جاتی ہیں۔ کوئی خطرہ سامنے ہو یا ابھر رہا ہو تو ٹھیک ورنہ نئے خطرات پیدا کرکے پروان چڑھانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ اور جیسے ہی کوئی بیرونی خطرہ ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، نئے ہتھیاروں کی تیاری اور پہلے سے موجود ہتھیاروں کی اپ گریڈیشن کیلئے مختص کی جانے والی رقوم میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

ویسے تو خیر پورے یورپ کو امریکی نائن الیون کے بعد خاصے دشمن میسر آ گئے ہیں مگر امریکا اس معاملے میں خاص طور پر خود کفیل ہے اور ان میں سے بیشتر خود امریکی پالیسیوں کے پیدا کردہ ہیں۔ اسلحہ ساز فیکٹریوں کو چلانے کیلئے ہر وقت کوئی بڑا دشمن یا مخالف میکانزم موجود رکھا جاتا ہے۔ امریکی سیاستدان دشمنوں کی تعداد میں اضافہ دکھانے کیلئے اگر کوئی بھرپور اور حقیقی دشمن نہ ہو تو فرضی دشمن کھڑا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں جس کیلئے دہشتگرد گروپوں کی درپردہ افزائش سے گریز نہیں کیا جاتا تاکہ امریکا کیلئے دنیا بھر میں کارروائیاں کرنے کا جواز باقی رہے۔ چند عشروں کے دوران امریکا نے کئی دہشتگرد گروپ کھڑے کیے ہیں اور ان سے بھرپور کام بھی لیا ہے۔ آپ نے بھی غور تو کیا ہو گا کہ انتخابی مہم کے دوران وہی امیدوار سب سے زیادہ مقبولیت اور پھر کامیابی بھی حاصل کرتا ہے جو ملک و قوم کے دفاع پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ جو دفاع پر زیادہ زور دیتا ہے اسی کو محب وطن سمجھا جاتا ہے۔

امریکا اور یورپ میں ہتھیاروں کی صنعت کیلئے بہت سی مشکلات بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ کسی بھی حریف میں اتنی قوت نہیں کہ امریکا اور یورپ کی سرزمین پر حملہ کرے اور جنگ کو وہاں تک مرتکز رکھے۔ جب کسی حریف میں اتنا دم ہے ہی نہیں تو پھر ہتھیاروں کی صنعت چلتی رکھنے کا جواز کیا ہے؟ بس یہی وہ نکتہ ہے جس پر اہلِ مغرب غور کرنے اور اس حوالے سے عملی طور پر کچھ کرنے کیلئے تیار نہیں۔

امریکا چاہتا ہے کہ بعض شر پسند گروپ مستحکم رہیں اور میدان سے نہ بھاگیں، انہیں کسی نہ کسی طور زندہ اور توانا رکھنے پر خاطر خواہ توجہ دی جاتی ہے۔ ان گروپوں ہی کے دم سے امریکا کیلئے امکانات کی دنیا بھی اب تک جوان ہے۔ امریکا اور یورپ دونوں ہی نے دہشتگردی برپا کر کے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ امریکی پالیسیوں کی کوکھ سے خرابیوں نے جنم لیا ہے۔ ان خرابیوں کے ردعمل میں جو گروپ امریکا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ان کی درپردہ معاونت کر کے امریکا نے یہ تاثر دینے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اسے نادیدہ دشمن یعنی دہشتگردوں کا سامنا ہے۔ عرب ممالک کے سیال مادے سے اکٹھی کی گئی بے پناہ دولت جو امریکی بینکوں میں ہی محفوظ تھی، اس خطیر رقم سے پہلے تو امریکی اسلحہ سازی کے کارخانوں نے امریکی معیشت کو سنبھال رکھا تھا جس کیلئے خود مشرقِ وسطیٰ میں پہلے اسرائیل کا خطرہ دکھا کر ان ممالک کو منہ مانگی قیمت پر اسلحہ خریدنے پر مجبور کیا گیا لیکن بعد ازاں خود انہی ممالک کے درمیان ایسی فساد کی آگ بھڑکا دی کہ اب ان کی اسلحہ سازی کی صنعت کا پہیہ دن رات تیزی سے فوائد کے پہاڑ سمیٹنے میں مصروف نظر آ رہا ہے۔

عراق کو ایک سازش کے تحت پہلے ایران کے ساتھ آٹھ سال تک ایسی جنگ میں الجھا دیا گیا جس کی قیمت صرف ان دو ملکوں نے نہیں بلکہ تیل سے مالا مال دوسرے پڑوسی ممالک کو بھی اس جنگ کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ابھی یہ عذاب ختم نہیں ہوا تھا کہ عراق کو ایک گھناؤنی چال میں پھنسا کر کویت پر حملہ کروا دیا اور پھر سعودی عرب اور کویت کی مدد کے بہانے "ورلڈ آرڈر" کا آغاز کرتے ہوئے خود باقاعدہ اس خطے میں اپنی پوری جنگی حکمت عملی کے تحت اپنی اور اتحادیوں کی افواج کے ساتھ عراق پر حملہ کر کے کویت کو واگزار کرایا گیا اور خود امریکی ریکارڈ کے مطابق امریکا نے جہاں کویت اور سعودی عرب سے اپنی خدمات کیلئے ان دونوں ممالک سے 187 / ارب ڈالر وصول

کیے اور عراق پر مجوزہ پابندیاں لگا کر عراق سے بھی 140 / ارب ڈالر خراج وصول کیا وہاں خطے کی سب سے بہترین اور جنگی وسائل سے مالا مال عراقی فوج کو مکمل طور پر تباہ کر کے اپنے لے پالک اسرائیل کو عراق سے لاحق خطرات سے بھی محفوظ کر دیا جبکہ اسرائیل پہلے ہی عراقی ایٹمی پروگرام کو ایک ایسے فضائی حملے میں تباہ کر چکا تھا جس کیلئے اس نے باقاعدہ سعودی عرب اور کویت کی اجازت سے ان ملکوں کی فضاؤں کو استعمال کیا۔

اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بعد ازاں ایک سازش کے تحت عراق پر خفیہ کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کا الزام لگا کر حملہ کر کے محض اس لئے تباہ برباد کر دیا کہ عراق نے امریکی جارحیت کے بعد اپنی فوج کو از سر نو منظم کرنے کیلئے روس اور چین سے عراقی تیل کے عوض کئی معاہدے کئے اور تمام ممالک سے عراقی پٹرول کی قیمت ڈالر کی بجائے یورو اور دیگر کرنسیوں کی شرط رکھ دی اور عراقی تیل کے تمام ذخائر کی بیش بہا دولت کا ٹھیکہ امریکی کمپنیوں بالخصوص امریکی نائب صدر ڈک چینی کے حوالے کر دیا گیا۔ صدیوں سے محفوظ عراقی تہذیب کے بڑی بے رحمی کے ساتھ پرخچے اڑا دیئے گئے اور آج تک عراق اس کا خراج ادا کر رہا ہے۔

تنازعات اور تشدد معاشروں کا حصہ ہے۔ بہت سی ثقافتوں میں جنگ و جدل سے رغبت ہر دور میں رہی ہے۔ آج بھی ایسی بہت سی جنگیں لڑی جا رہی ہیں جن کا امریکا اور مغرب سے کوئی تعلق نہیں مگر پھر بھی امریکا و مغرب کا ہاتھ نمایاں ہے۔ امریکی اور مغربی معاشرے اپنے ہتھیار فروخت کرنے کیلئے جنگ پسندی کو فروغ دے رہے ہیں۔ کئی خطوں کو سلامتی کے حوالے سے شدید اندرونی خطرات سے دوچار کر دیا گیا ہے۔ متعدد ممالک کو غیر ضروری طور پر جنگ میں الجھا دیا گیا ہے۔ افغانستان، عراق، شام، لیبیا اور یمن اس کی بہت واضح مثالیں ہیں۔ آج کے مغرب میں میڈیا، معیشت، سیاست، انٹرٹینمنٹ سبھی کچھ جنگ پسندی کے آغوش میں ہے، جب تک یہ رجحان ترک نہیں کیا جائے گا تب تک دنیا میں حقیقی امن کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔

امریکی صدر جو بائیڈن پر غزہ میں حماس کے خلاف اسرائیلی فوجی کارروائی روکنے کے لیے دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ 25 سال تک امریکی محکمہ خارجہ میں عرب اسرائیل تعلقات کے مشیر کے طور پر کام کرنے والے ایرون ڈیوڈ ملر نے کہا کہ میں تباہی کے پیمانے پر دنگ ہوں، میں نے کبھی ایسا کچھ نہیں دیکھا۔ اگر ایک جانب ہزاروں شہریوں کی ہلاکتوں اور خوفناک انسانی صورتحال نے امریکا کے عرب ممالک اتحادیوں کو بے چین کر دیا ہے جبکہ دوسری جانب بائیڈن انتظامیہ کے اندر ہی تنقید کی سطح میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ادارہ برائے بین الاقوامی ترقی (یو ایس ایڈ) میں ایک کھلا خط بھی جاری کیا گیا ہے۔ سیاسی تقرریوں اور درجنوں سرکاری اداروں کی نمائندگی کرنے والے عملے کے ارکان کی جانب سے وائٹ ہاؤس کو ایک علیحدہ خط بھیجا گیا ہے۔ کیپیٹل ہل کے عملے کی طرف سے بھی کانگریس کے اراکین کو ایک خط بھیجا گیا ہے۔

متعدد رپورٹس بتاتی ہیں کہ غزہ پر امریکی پالیسی کے خلاف احتجاج کی لہر میں سینکڑوں لوگوں نے دستخط کیے ہیں۔ یہ خدشات بہت حقیقی ہیں اور لوگ اس کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ ان خطوط میں مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ صدر بائیڈن فوری طور پر جنگ بندی کا مطالبہ کریں اور غزہ میں انسانی امداد کی اجازت دینے کے لیے اسرائیل کے ساتھ کسی حد تک سختی بھی کریں۔ کچھ خطوط کا لہجہ سخت ہے اور یہ نوجوان سیاسی کارکنوں کے جذبات کی بازگشت کرتے ہیں اور بالواسطہ طور پر اسرائیل کے ناقدین اور فلسطین کے ہمدردوں کے درمیان رویوں میں نسلی فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔ یوں لگ رہا ہے کہ مغربی اور امریکی عوام کے دباؤ کی وجہ سے بے گناہوں کا خون رنگ لانے والا ہے۔ بروز ہفتہ 20 جمادی الاول 1445ھ 2 دسمبر 2023ء

اک شخص اندھیرے میں اجالے کی طرح تھا

یوں نہ پھر ہو گا کوئی نغمہ سرا میرے بعد
اور ہی ہو گی گلستاں کی فضا میرے بعد
راہ سنساں مکاں خستہ مکیں افسردہ
کیسا ویراں ہوا شہرِ وفا میرے بعد

سرو قد و سجیلا، بلند و بالا کسرتی بدن، سرخ و سفید رنگت، کشیدہ قامت، گلابی و معصوم چہرہ، فراخ جبیں، منفرد و حسیں، خوبصورت سرمگیں آنکھیں جن میں بلا کی چمک بلکہ ہیرے کی دمک، پھر ان میں شب زندہ داری کی وجہ سے لال لال ڈورے، جائزہ لیتی ہوئی نگاہیں، ستواں اور اونچی ناک، خوبصورت نازک پتلے ہونٹ، کشادہ و غنچہ دہن، سرخ رخسار بمثل قندھاری انار، سلیقے و قرینے کی ملائم و ریشمی ریش مبارک جس میں سیاہی سے سفیدی ہم آغوش ، قریب تھا کہ سینہ ڈھانپ لے، ترشی ہوئی مونچھیں، سر منڈا ہوا مگر قراقلی ٹوپی سے ڈھکا ہوا، لہجے میں سوز و عاجزی، آواز میں اقبال، چال میں کمال، طبیعت میں جلال، سر تا پا استقلال، رفتار میں حکومت، گفتار میں سطوت، عظمت کشمیر کی معنوی صفات کا عکسِ جمیل، صبا کی طرح نرم اور رعد کی طرح گرم، ایک جیتی جاگتی کہانی، ارض کشمیر جنت نظیر کی نشانی، ایک حصار جس کی قربت سے حشمت کا احساس ہوتا ہے اور جس کی دوری میں عقیدت نشو و نما پاتی ہے، گویا شکل میں شہنشاہ تو عادات میں بے پناہ! یہ ہے ان کی جھلک جن کا نام نامی ہے حبیب اللہ ملک!

جن کی یادوں سے رگِ جاں میں دکھن ہونے لگے
ذکر چھڑ جائے تو پتھر کا دل بھی رونے لگے

58 برس قبل آج ہی کے دن 3 دسمبر 1965ء جمعتہ المبارک بوقت 3 بجکر 13 منٹ بمقام سول ہسپتال کمرہ نمبر 5 لائلپور میں ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت نے اس عارضی زندگی کی بہاروں سے منہ موڑ لیا کہ جیسے انہوں نے جان لیا ہو کہ اب میرا ٹھکانہ ایسے دار بقاء میں ہے جہاں سدا بہار خوشبوؤں کے گلستان ہیں۔ جس طرح ہر چیز کی قدر و قیمت کا ایک معیار ہے اسی طرح اس جہاں کے گلستاں میں داخلہ کا ٹکٹ بھی ایسا ارزاں نہیں۔ زندگی جیسی قیمتی دولت دیکر موت نصیب ہوتی ہے اور پھر موت ہی تو وصل حبیب اور بقائے حبیب کا سبب اور ذریعہ ہے۔ بقائے حبیب سے بڑھ کر اور نعمت بھی کیا ہو گی! کیا خوب کہ آج ہزاروں دلوں کا حبیب اپنے حبیب کے حضور حاضر ہو گیا۔

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائیں ہیں بستیاں

کہتے ہیں دنیا میں ایسی جھیلیں بھی ہیں جن کا پانی بیک وقت شیریں بھی ہے اور نمکین بھی، ان کے ایک حصے میں میٹھا اور شیریں پانی بہتا ہے اور دوسرے حصے میں نمکین اور کڑوا کسیلا۔ قدرت کا کیسا معجزانہ کمال ہے کہ ان میں پانی کی دونوں سطحیں الگ الگ رہتی ہیں اور ہر حصے کا پانی اپنا ذائقہ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جب بھی ان کا مبارک خیال آتا ہے تو میرے ذہن میں ایک ایسی ہی جھیل کا تصور جاگ اٹھتا ہے۔ کئی سال گزر گئے، ہزاروں دفعہ قصد کیا کہ ان تصورات اور خوبصورت یادوں کو الفاظ کی زبان دوں لیکن ایک غیر مرئی خوف کی بناء پر ایسا نہ کر سکا، شائد بزدل، خوفزدہ اور کمزور ہوں

کہ ان تمام یادوں کا احاطہ نہ کر سکوں گا۔ لیکن آج تو حد ہو گئی، بعض اوقات گم گشتہ یادوں کے بارود کے ڈھیر میں حالات وواقعات کا آتش گیر مادہ جمع ہوتا رہتا ہے لیکن دھماکے کیلئے کوئی چنگاری میسر نہیں آتی یا یوں سمجھ لیں احتیاط کی بناء پر چنگاری سے محفوظ رکھنا اصول حیات ٹھہر جاتا ہے لیکن آج انجانے کیوں دل نے ایسی چنگاری دکھائی کہ تمام یادوں کو ایک دھماکے سے اڑا کر رکھ دیا ہے۔

3 دسمبر 1965ء بروز جمعتہ المبارک کو میں جب آپ کے پاس فیصل آباد کے سول ہسپتال کے کمرہ نمبر 5 میں بیٹھا تھا تو آپ نے نیم کھلی آنکھوں سے پوچھا کہ،، آج کون سا دن ہے؟ تایا جان نے جواب دیا کہ آج جمعہ ہے تو آپ نے اپنی رفیقہ حیات کی طرف نگاہ اٹھائی جو فوراً آپ کی نگاہوں کا مطلب بھانپ گئیں۔ آپ کو بستر پر ہی وضو کروا دیا گیا۔ آج پچھلے دس دنوں کی نسبت طبیعت میں خاصا سکون تھا۔ چہرے پر کمزوری کے باوجود رونق بھی لوٹ آئی تھی۔ دیرینہ ساتھی حافظ صاحب سے خصوصی فرمائش پر کافی دیر تک قرآن کریم سنتے رہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ حافظ صاحب خوش الحانی کے ساتھ سورۃ الحشر کے آخری رکوع کی آیات پر پہنچے تو آپ کی آنکھوں سے ساون بھادوں شروع ہو گیا۔ میں نے فوراً اپنا منہ کھڑکی کی طرف کر لیا کہ برداشت کا یارانہ تھا۔ آپ نے ہم سب کو جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھنے کا حکم دیا۔

سب ہی ہسپتال سے ملحقہ مسجد کی طرف چل دیئے لیکن نجانے کیوں میرے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ رکھتا کہیں تھا، پڑتے کہیں تھے۔ مڑ مڑ کر نگاہیں کمرے کا طواف کر رہی تھیں، ایک انجانا سا خوف دل کو بے قرار کر رہا تھا۔ پچھلے دس دن والدہ محترمہ ایک پل کیلئے آپ سے جدا نہیں ہوئی تھیں۔ میرے میٹرک کے امتحان چل رہے تھے بس یوں سمجھیں کہ خانہ پری اور آپ کے احکام کی اطاعت ہو رہی تھی۔ میری امتحانات میں ہمیشہ یہ حالت رہی کہ مقررہ وقت ختم بھی ہو جاتا تھا اور مجھے لکھنے سے فرصت نہیں ملتی تھی لیکن اب کئی دنوں سے صورتحال بالکل مختلف تھی۔ اب شائد سب سے پہلے میں ہی اپنے پرچے سے فارغ ہو کر ہسپتال کی طرف بھاگتا تھا۔ میرے اسکول کے تمام اساتذہ کرام اور خصوصی طور پر میرے ہیڈ ماسٹر جناب ذکاء اللہ صاحب کو پوری توقع تھی کہ امسال پورے ضلع میں نمایاں کامیابی میں میرا نام ضرور ہو گا لیکن اس انجانے حادثے کی کس کو خبر تھی۔ یہ تو شائد آپ ہی کی دعاؤں کا کمال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصی کرم فرمایا وگرنہ میری محنت اور کارکردگی تو آپ کی بیماری کی خبر نے سلب کر لی تھی۔

آپ جب سے ہسپتال میں صاحبِ فراش تھے، سارا شہر امڈ آیا تھا۔ کئی دفعہ ہسپتال کے عملہ نے اس طرف توجہ دلائی کیونکہ ڈاکٹروں کی ایک پوری جماعت ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔ ہسپتال کا دوسرا عملہ بھی کوئی ایمرجنسی ڈیوٹی کی طرح حاضر رہتا تھا۔ بعض اوقات آپ کے چہرے سے محسوس ہوتا تھا کہ آپ ناقابل برداشت تکلیف کا بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں لیکن منہ سے کبھی اس کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

آپ پچھلے چند ہفتوں سے مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے بے خانماں مہاجرین کے استقبال کیلئے ملک کی اگلی سرحدوں پر پہنچ گئے تھے۔ آپ فیصل آباد سے تیسری مرتبہ پورا ٹرک گرم کپڑوں اور دیگر ضروری اشیاء کا لیکر نہ صرف امدادی کاموں میں مصروف تھے بلکہ اپنے بھائی عصمت اللہ ملک اور دوسرے عزیز واقارب کو بھی ڈھونڈ رہے تھے۔ میرے ننہیال کی ایک خاصی تعداد جونہی پہنچی تو ان کو لیکر فوری فیصل آباد پہنچے مگر تیسری مرتبہ بھی اپنے بھائی کے بغیر بہت مایوس لوٹے۔ آپ کے اندرونی کرب کا بخوبی آپ کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا۔ ایک شام آپ نے مہاجرین کی بے بسی اور غریب الوطنی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ سننے والے سب افراد آبدیدہ ہو گئے۔ کئی ایک خاندان کی آبادکاری کے باوجود آپ کا دل مسلسل مہاجرین کشمیر میں اٹکا ہوا تھا شائد اپنے مہاجر ہونے کے مصائب دوبارہ دل میں تازہ ہو گئے تھے۔ آپ پھر سے مہاجرین کی آبادکاری کی کوششوں میں مصروف تھے کہ

کمر کی اچانک درد نے بے حال کر دیا۔ رات بھر کمر کی سخت درد میں مبتلا رہے۔ دوسری صبح اپنے دوست حکیم ریاست علی سے جو ذکر کیا تو اس نے بغیر دیکھے زائد المعیاد پنسلین کا انجکشن بائیں بازو میں لگا دیا، گویا آپ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا اعلان جاری ہو گیا۔ وہ دن بڑی مشکل سے گزرا، درد کی شدت نے بے حال کر دیا، فوری ہسپتال پہنچایا گیا۔ معلوم ہوا کہ درد میں افاقے کی بجائے زائد المعیاد ٹیکے نے سارے جسم میں شدید قسم کا انفیکشن پیدا کر دیا ہے۔ سب ڈاکٹر حیران تھے کہ پچھلے چوبیس گھنٹے کس طرح گزر گئے حالانکہ اس انفیکشن کے بعد تو زندگی چند گھنٹوں کی مہمان ہوتی ہے۔ یقینا دمِ واپسی کے معین دن کا انتظار تھا۔

فوری طور پر سارے جسم کا مکمل خون تبدیل کر دیا گیا۔ پہلے تین دن طبیعت سخت خراب رہی لیکن چوتھے دن طبیعت کافی سنبھل گئی۔ لیکن یکایک طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور ڈاکٹروں نے بازو کاٹنے کا مشورہ دیا کہ دوبارہ اس انفیکشن کو سارے جسم میں پھیلنے سے روکنے کیلئے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ چچا جان جو خود ڈاکٹر تھے اور پہلے ہی دن سے سایہ کی طرح اس سارے عمل کی نگرانی کر رہے تھے، فوری آپریشن کی اجازت دے دی گئی۔ دوسری طرف مقامی اخبارات میں یہ خبر شائع ہونے سے حکیم ریاست علی کی گرفتاری کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ شہر بھر میں غم و غصہ کی ایسی لہر اٹھی کہ حکیم صاحب اپنا مطب بند کر کے شہر سے فرار ہو گئے۔ ایک دن اچانک حکیم صاحب اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہسپتال آپ کے قدموں پر سر رکھ کر گڑگڑا کر معافی مانگ رہے تھے اور مجھے یاد ہے کہ آپ بستر مرگ سے بھی ان کو تسلیاں دے رہے تھے۔ ہم سب کی طرف منہ کر کے ارشاد فرمایا:

میں نے حکیم صاحب کو اس غیر دانستہ عمل پر معاف کر دیا ہے، آج کے بعد جو بھی ان کو تکلیف پہنچائے گا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ آپ کے ساتھ تعلق کو ختم کیا جائے، آپ کے تعلق پر تو پوری دنیا کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ اغیار کو آپ کے تعلق پر فخر تھا پھر بھلا اہل خاندان سے کون ایسی جرأت کر سکتا تھا۔ حکیم صاحب کو عزت کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ مولوی اسماعیل اپنی ریڑھی پر باہر بیٹھا آپ کی صحت کیلئے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہا تھا۔ آپ نے کس محبت کے ساتھ اس کو بھیک مانگنے سے منع کیا تھا حالانکہ وہ دونوں ٹانگوں بلکہ جسم کے نچلے مفلوج دھڑ کے ساتھ سڑکوں پر گھسٹ کر بھیک مانگا کرتا تھا۔ آپ نے نہ صرف اس کیلئے ریڑھی کا بندوبست کیا بلکہ اپنے ہوٹل کے باہر اس کو ایک چھوٹا سا "کھوکھا" سامان کے ساتھ لگوا دیا کہ محنت کے ساتھ رزق کماؤ حالانکہ آپ کو اس جگہ کیلئے کئی دفعہ ہزاروں روپے کی آفر بھی ہو چکی تھی۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ یہ میرا عمل میری عقبیٰ و آخرت کی نجات کا وسیلہ بن جائے۔

آپ کا برسوں سے دستور تھا کہ علی الصبح فقیروں اور محتاجوں کی ایک لمبی قطار کیلئے ہوٹل سے روزانہ چائے اور ناشتے کا بندوبست کر رکھا تھا اور اس عمل کو اپنے فرضِ منصبی سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ ملازمین کو سختی سے ہدائت تھی کہ اس عمل میں کوئی سستی اور بداخلاقی کا اظہار نہ کرے۔ پھر ملازمین سے بھی اولاد جیسی شفقت اور محبت تھی۔ کشمیر سے محبت کا ایک ایسا اعلیٰ ثبوت کہ تمام ملازمین جن کا تعلق بھی کشمیر سے تھا برسوں سے کام کر رہے تھے، گویا اپنا ایک چھوٹا سا کشمیر بسائے بیٹھے تھے۔ شہر کے شرفائ، دانشوروں اور علماء سے دوستی کا یہ عالم کہ میلوں دور سے ان حضرات کی روزانہ آمد پر محفل سجائی جاتی تھی جہاں شہر کا مقامی مسئلہ ہو یا قومی سیاست کا، اس میں پھر پورا اجتماعی دلچسپی اور شرکت فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ قومی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کا بھی از حد

احترام تھا مگر ایوب خان کی حمائت محض اس لئے کہ اسلام میں عورت کو گھر کی حکمرانی کا درس دیا گیا، حالانکہ ہم سب محترمہ فاطمہ جناح کی کامیابی کیلئے دعا گو تھے۔ ایک دفعہ اہلیہ جو کہ سیاست کے حرف سے بھی واقف نہیں تھیں، محض عورت ہونے کے ناطے محترمہ فاطمہ جناح کی حمائت میں کچھ ہمدردی کے الفاظ کہہ ڈالے، بس پھر کیا تھا کہ جھیل کا میٹھا پانی کچھ لمحوں کیلئے تو کڑوا ہو گیا لیکن فوری اپنے اس رویہ پر معذرت کرتے ہوئے دلجوئی فرمادی۔

علمائے دین کا از حد احترام اور ان کی مجالس میں بیٹھنا باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ جہاں مولانا صدیق صاحب سے مراسم تھے وہاں صاحبزادہ فیض الحسن سے بھی یاد اللہ تھی۔ مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل سے تو خصوصی محبت تھی۔ مجلسِ احرار کے ناطے صاحبزادہ فیض الحسن کی خطابت کے بھی بہت معترف تھے۔

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالب بے مثال کی صورت

بات پھیل گئی مگر یادیں بدستور پرے جمائے صف در صف کھڑی ہیں، کس کو لوں اور کس کو چھوڑوں! مجھے اس بات کا تو علم ہے کہ محبت کے پھول آنکھوں کے گملے ہوتے ہیں جو پلکوں کی حفاظت میں سینچے جاتے ہیں لیکن برسوں کی فصل پک کر آج ان صفحات پر جمع ہو رہی ہے، شائد ایسا آج بھی نہ ہوتا اگر یہ 3 دسمبر کا دن انمٹ نقوش لئے مطالبہ اور تقاضہ نہ کرتا۔ دراصل دکھوں کے چراغ جب انسان اپنی ہتھیلی پر لیکر پھرتا ہے تو اجالا چہرے پر سہانی یادوں کے داغ نمایاں کر دیتا ہے اور پھر بعض اوقات انسان محبت میں ایک تماشہ بن جاتا ہے لیکن اگر یہی دکھ کا چراغ چھپ کر دل میں جلایا جائے تو اس کی روشنی سے روح روشن اور مہک اٹھتی ہے۔ پھر انسان دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً پچھلی پانچ دہائیوں سے زائد آپ کی یادوں کے چراغوں کی لو دھیمی ہونے کا نام ہی نہیں لیتی!

اندر بھی زمیں کے روشنی ہو
مٹی میں چراغ رکھ دیا ہے

میں جانتا ہوں آپ کیوں اور کہاں چلے گئے ہیں اس کے باوجود کم و بیش ہر روز اپنے دل میں ایسے ان گنت سوالات کلبلاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ اب تو آپ کے ہاں اڑوس پڑوس میں کئی اپنے ہی چلے آئے ہیں۔ ایک طرف ماں کی محبت کو پہلو میں لٹا رکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنی رفیقہ حیات کو بھی بلا رکھا ہے۔ جہاں تایا جان اور چچا جان اس محفل میں شریک ہیں وہاں نوجوان بیٹے اعجاز ملک اور احسان ملک بھی آپ کے ساتھ محفل سجائے تشریف فرما ہیں۔

معشوق ریاض اٹھ گئے اس بزم سے کیا کیا
جاتی ہوئی دنیا ہے رہے نام خدا کا

مجھے آپ کی کہانی سنانے کا ناصحانہ انداز اچھی طرح یاد ہے کہ کس حکمت و دانائی کے ساتھ ہمارے دلوں میں مطلوبہ نصیحت گھر کر جایا کرتی تھی۔ آپ نے کبھی بھی اپنی غریب الوطنی کے مصائب کو نہیں چھپایا بلکہ ہمیشہ اس کو عبرت کے انداز میں یاد بھی رکھا اور ہمارے دلوں میں بھی اتارا۔ پاکستان

کو ایک معجزاتی ریاست اور جان سے زیادہ عزیز رکھنے کی تلقین کی کہ دنیا میں اس سے بڑی اور کوئی نعمت نہیں جو لاکھوں جانوں کی قربانی اور ایثار سے حاصل کیا گیا۔ شب و روز کی محنت نے زندگی کے تمام انعامات سے نوازر کھا تھا لیکن کشمیر کی یاد اکثر آبدیدہ کر دیتی تھی۔ ہم سب کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کنبہ پروری میں اپنی مثال آپ تھے۔ توفیقِ ایزدی سے جب گھر بنوایا تو خاندان کے کئی بے گھر افراد کو گھر کے ایک حصے میں رہنے کی تمام آسائشیں مہیا فرمادیں۔ آپ کی ساری عمر کوشش رہی کہ کسی بچے کی جائز خواہش،، حسرت،، نہ بن جائے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ ،،کاش! ایسا ہوتا۔،، آپکو یہ سننا پسند نہ تھا۔ خود بھی قناعت برتی اور عملاً اس کی تلقین بھی کی۔

ایک مرتبہ موسم گرما کی تعطیلات میں اسکول کے طلباء کا ایک گروپ مطالعاتی سیر کیلئے سوات اور گلگت کیلئے تیار ہوا۔ میں نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ آپ سے اجازت مانگی تو آپ نے بڑے اصرار کے بعد اجازت تو دے دی لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ آپ مجھے رخصت کرنے کیلئے خود ریلوے اسٹیشن پر تشریف لے آئے اور علیحدگی میں میرے ہیڈ ماسٹر جناب ذکاء اللہ صاحب اور دوسرے اساتذہ کرام سے کافی دیر محو کلام رہے۔ یہ عقدہ بعد میں کھلا کہ ایک خاصی رقم زادِ راہ کیلئے خاموشی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کے حوالے کر دی کہ میری کسی خواہش کو حسرت میں تبدیل نہ ہونے دیا جائے۔ پھلوں کے کئی ٹوکرے بھی ساتھ لائے جس سے تمام طلباء ساتھی بھی خاصے لطف اندوز رہے۔ جب مہینہ بھر کی سیر سے واپس پہنچا تو گھر والوں سے معلوم ہوا کہ آپ نے ہر شب خصوصاً پھل کھانے کی مجلس میں بہت یاد فرمایا بلکہ بے تابی کا یہ عالم تھا کہ میں نے جو خطوط لکھے تھے ان کو دن میں کئی مرتبہ سنتے تھے۔ میں نے اس سفر میں ،، سواتی سٹائل،، کی ایک ٹوپی خریدی جو آپ نے میری دلجوئی کیلئے کئی دن اوڑھے رکھی حالانکہ مجھے علم تھا کہ آپ ہمیشہ قراقلی ٹوپی استعمال فرماتے تھے۔

خواب بن کر رہ گئیں ہیں کیسی کیسی محفلیں
خیال بن کر رہ گئے ہیں کیسے کیسے آشنا

اپنی والدہ کی دلجوئی کا کس قدر خیال تھا۔ ساری عمر آپ کے پاس قیام رہا حالانکہ دوسرے بچوں کے گھر بھی قریب تھے۔ ایسی بے مثال محبت، ایک دفعہ سردیوں میں ان کیلئے ایک گرم چادر سو روپے میں خریدی، گھر میں والدہ کی خدمت میں پیش کی تو والدہ نے فوراً محبت میں اوڑھ لیا۔ ان کے دل میں نجانے کیا آیا کہ انہوں نے اس گرم چادر کی قیمت پوچھ لی۔ آپ کافی ٹال مٹول سے کام لیتے رہے لیکن بالآخر جب بتانے پر مجبور ہو گئے تو انتہائی غیر معمولی قیمت محض اس لئے بتائی کہ اصل قیمت سن کر والدہ فضول خرچی گردان کر ناراض نہ ہو جائیں۔

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کیلئے

آپ کی بڑی خواہش تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم کیلئے بیرونِ ملک کا سفر کروں۔ اس کیلئے اپنے قریبی دوست محمد حنیف صاحب کو بستر مرگ سے تلقین بھی کی۔ میں بھی سن رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی اس خواہش نے مجھے بے شمار رکاوٹوں کے باوجود سہارا دیئے رکھا اور اب ایک ایسا وقت بھی آیا کہ آدھی دنیا کی سیاحت کر چکا ہوں لیکن پھر بھی ہر سال کوئی نہ کوئی بیرونی سفر انتظار میں رہتا ہے۔

آپ تو اپنے ہر تعلق رکھنے والے کے دل میں اپنی بے پناہ یادیں چھوڑ کر اپنے محبوب رب کے ہاں حاضر ہو گئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ موت کوئی نئی

چیز نہیں، اس کا ذائقہ تو ہر کسی نے چکھنا ہے، موت کے قانون سے نہ تو کوئی نبی مستثنیٰ ہے نہ ولی، جو بھی آتا ہے اپنا مقررہ وقت پورا کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، کسی کا حالتِ ایمان میں اس دنیا سے رخصت ہو جانا اس کے حق میں ایک بڑی نعمت ہے۔ پھر اس دنیا میں آنا ہی درحقیقت جانے کی تمہید ہے مگر بعض جانے والے اپنی دائمی جدائی کا ایسا غم دے جاتے ہیں جو بڑا ہی جانکاہ اور ہوشربا ہوتا ہے بلکہ اس صدمے سے سنبھلنے میں عمر صرف ہو جاتی ہے۔ آخر آپ بھی تو اپنی والدہ محترمہ کا تین مہینے سے زائد انتظار نہ کر سکے۔

ہے رشک اک جہان کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

بعض لوگوں کے جانے کی اطلاع پڑوسی کو بھی نہیں ہوتی، اگر ہو بھی جائے تو دو چار آنکھوں کے علاوہ ان پر رونے والا کوئی نہیں ہوتا، بعض لوگوں کے جانے سے دو چار خاندان غمزدہ ہوتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے جانے سے ایک عالم غمگیں اور اندوہگیں ہو جاتا ہے، جس تک بھی خبر پہنچتی ہے اس کی چشم نم اور دل غم سے لبریز ہو جاتا ہے۔ جن کے رخصت ہونے سے محبت والفت کی مسند سونی ہو جاتی ہے، پیار و شفقت کی بساط الٹ جاتی ہے، پورا کنبہ ان کی دعاؤں اور برکات و توجہات سے محروم ہو جاتا ہے۔

آپ کی موت ایک انسان کی موت نہیں بلکہ ایک عمل کی موت ہے جس کا خلاء ابھی اور برسوں رہے گا۔ آپ کی موت تو ایک انکساری و تواضع کی موت ہے، شرافت و نجابت کی موت ہے، شفیق باپ، محبت کرنے والے شوہر اور پرخلوص رفیق کی موت ہے۔ ایک ایسے عظیم انسان کی موت ہے جن کے نقشِ پا سے زندگی راستہ ڈھونڈتی ہے۔ ایک ایسے بلند پایہ خلیق باپ کی موت ہے جس سے محبت کا ایک باب مکمل طور پر بند ہو گیا ہے۔ آپ کے دل کی دھڑکن نے بند ہو کر سینکڑوں دلوں کی دھڑکن کو بری طرح پامال کیا ہے۔

آپ ہمارے لئے پند و نصائح کا مینارہ نور تھے جس کی روشنی میں مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت عود کر آتی تھی۔ آپ خود شمع کی مانند پگھل کر اک جہاں کو روشنی مہیا کرتے تھے۔ دنیا کی سخت دھوپ میں نہائت فرحت بخش سایہ بن کر ہر کسی کے سر پر موجود تھے، خود بے قرار ہو کر ہر کسی کو سکون کی دولت تقسیم کرتے رہتے تھے۔ بولتے تو منہ سے ایسے انمول موتی جھڑتے کہ ہر کسی کو سمیٹنے میں اپنی جھولی تنگ نظر آتی۔ اگر خاموش رہتے تو وقار و سکینت کا اعلیٰ نمونہ ہوتے تھے۔ کس کس خوبی کا ذکر کروں اور اب کس کس محرومی کی نشاندھی کروں، گویا اب تو تپتی دھوپ میں ان سنگلاخ پتھروں پر ننگے پاؤں چلنے کی بھی ایک عادت سی ہو گئی ہے۔

غم مختلف شخصیتوں پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں پر غم کی خبر بجلی کے کرنٹ کی طرح گرتی ہے، کچھ لوگوں پر غم کا دھارا چل کر انہیں بھگو دیتا ہے، کچھ لوگ غم کی خبر سن کر خالی الذہن ہو جاتے ہیں، پھر غم بوند بوند گرتا چلا جاتا ہے۔ آپ کو بھی جب منوں پھولوں میں سجا ہوا دیکھا تھا تو دفعتاً میں خالی الذہن ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ اب غم بوند بوند گرے گا، گرتا رہے گا، میرا سب سے بڑا محسن جو چلا گیا تھا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا مشاہدہ، وہ جو مجھ پر اللہ کی عظیم ترین کرم نوازی تھا، جس کے جانے کے بعد میں بالکل اکیلا رہ گیا، جیسے کسی مٹی کے پیالے سے دودھ نکال لیا جائے اور اب صرف خالی برتن رہ جائے!

آپ تو ایک عطیہ خداوندی تھے جس سے ہم سب استفادہ کرتے رہے اور اب اللہ نے آپ کو واپس بلا لیا ہے۔ آپ نے سفر آخرت کیلئے بھی کیسا دن

پایا۔ جمعتہ المبارک کی نماز پڑھ کر ہم سب تیزی سے لوٹے تو معلوم ہوا کہ مسلسل ایک گھنٹہ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی رفیقہ حیات کو دنیا کی گرم سرد ہواؤں کا مقابلہ کرنے کی نصیحتیں فرماتے رہے، بڑی عاجزی کے ساتھ اپنے معاملات کی صفائی طلب کرتے رہے، آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر بڑی بے بسی سے دعا کی۔

"اے غفورالرحیم! اپنے کھوٹے اعمال کے ساتھ تیرے دربار میں تیری رحمت کا امیدوار بن کر حاضر ہو رہا ہوں، اگر تو معاف کر دے تو کوئی بڑی بات نہیں،، دنیاوی سفر بھی زادِ راہ کے بغیر تیرے سہارے طے کیا ہے اور اب بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔" علامہ اقبال کی یہ رباعی دہراتے رہے

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر.....روز محشر عذر ہائے من پذیر

گر تو می بینم حسابم ناگزیر.....از نگاہ مصطفی پنہاں بگیر

اے اللہ میں تیرا منگتا ہوں، تو دو عالم کو عطا کرنے والا ہے۔ روزِ محشر میرا عذر قبول فرمانا اگر میرے نامہ اعمال کا حساب ناگزیر بھی ہے تو پھر اے میرے مولیٰ اسے میرے آقا محمد ﷺ کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا۔

کمرے میں موجود افراد کو گواہ بنا کر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے اپنے رب سے جا ملے۔ **انا اللہ و انا الیہ راجعون**

اداسی جو ایک سیاہ بادل کی طرح میرے دل میں اترتی چلی جا رہی ہے، نیچے ہی نیچے.....نیچے ہی نیچے، میں دل تھام کر ان کیلئے دعا کرتا ہوں کہ:

اے غفورالرحیم! آپ رب ہیں ہم عبد ہیں، آپ مسجود ہیں ہم ساجد ہیں، آپ دینے والے ہم لینے والے ہیں، آپ رحمٰن ہیں ہم طلبگار ہیں، غلطیوں سے درگزر فرما اور والد محترم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرما۔ ثم آمین

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے

ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

(والد محترم کی 58ویں برسی کے موقع پر)

بروز سوموار 22 جمادی الاول 1445ھ 4 دسمبر 2023ء

دعا کیوں ضروری ہے

میں نے ایک دن باباجی سے پوچھا "ہمارا نصیب اگر تحریر ہے تو پھر دعا کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟" وہ مسکرائے اور دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتے رہے، یہ سوال زیادہ تر لوگوں کے ذہن میں اٹھتا ہے اور یہ مدت تک پریشان رہتے ہیں۔ ہماری زندگی، ہماری موت، ہماری ترقی، ہماری خوش حالی، ہماری شادی، ہماری اولاد، ہمارا رزق، ہماری عزت اور ہمارا برا وقت اور ہمارے مسائل اگر یہ تمام چیزیں ہماری پیدائش سے قبل لوح محفوظ پر درج ہو چکی ہیں، اگر ابن فلاں، ابن فلاں اور ابن فلاں کی حیات کا ایک ایک سیکنڈ درج ہے تو پھر کوشش اور دعا کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

آپ قدرت کے فیصلے کو تسلیم کیجیے، سر نیچے کیجیے اور صابر اور شاکر رہ کر زندگی گزار دیجیے، آپ کو نماز کے دوران، درگاہوں میں، ذکر اذکار کے بعد اور خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں گڑگڑا کر دعا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کو آنکھوں میں آنسو بھر کر، بھرائی ہوئی آواز میں اپنے خالق، اپنے رب کو آواز دینے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سوال ہر ذہن میں اٹھتا ہے مگر زیادہ تر لوگ گستاخی اور خوف کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں۔

میں بھی اس سوال کا جواب چاہتا تھا، باباجی ایک دن تشریف لائے تو میں نے ڈرتے ڈرتے یہ سوال ان کے سامنے رکھ دیا، وہ مسکرائے اور میرے چہرے کو دیر تک دیکھتے رہے اور اس کے بعد فرمایا "اللہ کا سسٹم دو حصوں میں تقسیم ہے، ایک حصہ فائنل ہے اور دوسرا حصہ آپشنل، فائنل سب کے لیے مشترکہ ہوتا ہے مثلاً دنیا کا ہر ذی روح پیدا ہوتا ہے اور مرتا جاتا ہے، دنیا کے ہر انسان کو ہوا، خوراک اور روشنی چاہیے۔

گرمی اور سردی نبی کو بھی لگتی ہے اور اگر پتھر نبی اکرم ﷺ کے جسد اطہر کو بھی لگیں گے تو خون بہے گا، تیر لگے تو دندان مبارک شہید ہوں گے، غم آئے گا تو آپ ﷺ کو محسوس ہو گا، درجہ حرارت پچاس سینٹی گریڈ سے اوپر جائے گا تو ہر جان دار کی سروائیول خطرے میں پڑ جائے گی۔ پانی آپ کو بھی چاہیے اور نبی کو بھی، کھانا آپ کو بھی درکار ہے اور نبی کو بھی، آکسیجن آپ کے لیے بھی ضروری ہے اور نبی کے لیے بھی، اور روشنی ہم سب کو بھی چاہیے اور نبی کو بھی، اللہ کے سسٹم میں مشرق، مشرق رہتا ہے اور مغرب، مغرب، اور اللہ تعالیٰ یہ سسٹم کسی کے لیے تبدیل نہیں کرتا، ہم سب اس سسٹم کو فائنل جان کر اس کے ساتھ سمجھوتے پر مجبور ہوتے ہیں جب کہ دوسرا حصہ آپشنل ہے، یہ حصہ اللہ تعالیٰ کی نوازشات پر مبنی ہے۔ اللہ رزق ہر جان دار کو دیتا ہے، یہ فائنل ہے لیکن اس رزق کی کوالٹی اور کوانٹٹی کیا ہو گی، یہ اللہ کی خصوصی نوازش میں آتا ہے، ایک انسان گاؤں میں نہر کے کنارے پانی میں بہتا ہوا تربوز توڑتا ہے اور خول میں منہ ڈال کر تربوز کھا جاتا ہے، یہ رزق ہے، دوسرے انسان کو فائیو اسٹار ہوٹل میں باوردی بیرا، انتہائی شان دار ماحول میں، قیمتی ڈائننگ ٹیبل پر اور چمکتی سفید پلیٹ میں تربوز پیش کرتا ہے اور وہ فرانس کے کانٹے کے ساتھ تربوز کی قاشیں کھاتا ہے۔ یہ اللہ کی مہربانی، یہ اس کی نوازش ہوتی ہے، ایک شخص بدن پر چیتھڑے لپیٹ کر گاؤں کے جوہڑ میں نہاتا ہے اور پانی سے باہر آتا ہے تو اس کے جسم پر غلاظت لگی ہوتی ہے اور دوسرا فائیو اسٹار ہوٹل کے سوئمنگ پول میں صاف پانی میں غوطہ زنی کرتا ہے اور یہ جب پانی سے باہر آتا ہے تو اسے گرم تولیہ اور سفید گاؤن پیش کیا جاتا ہے۔

یہ اللہ کی نوازش، یہ اللہ کی مہربانی ہوتی ہے، ایک شخص رزق، دولت اور ضرورت کے لیے در در بھیک مانگتا ہے جب کہ دوسرا شخص کاغذ پر دستخط کرتا ہے اور درجنوں غریب امیر ہو جاتے ہیں، ان پر زندگی کی خوشیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں، ان کی اندھیری زندگی چمک اٹھتی ہے، یہ اللہ کی

خصوصی نوازش، خصوصی کرم ہوتا ہے۔

ہم سب بیمار ہوتے ہیں، ہمیں چوٹ لگتی ہے اور ہم لوگ مسائل میں الجھ جاتے ہیں مگر ہم میں سے کچھ لوگ جلد صحت یاب ہو جاتے ہیں، کچھ لوگوں کے درد جلد ختم ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگوں کے مسائل بہت جلد حل ہو جاتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ ان پر اللہ کا خصوصی کرم، اللہ کی خصوصی نوازش ہوتی ہے، یہ آپشنل ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آپشن کے لیے دو طریقے وضع کیے ہوئے ہیں،، وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا" وہ طریقے کیا ہیں؟" باباجی نے فرمایا" اللہ کی مخلوق پر مہربانی اور اللہ کے حضور دعا"۔ میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگا، وہ بولے "آپ اگر اللہ کے نادار بندوں کے لیے کام کر رہے ہیں، آپ ان کی مشکلیں آسان کر رہے ہیں اور ان کے دکھ درد میں کام آ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی نوازشات کے دروازے کھول دیتا ہے اور آپ کا تعلق خواہ کسی بھی مذہب، کسی بھی طبقے، کسی بھی گھرانے سے ہو آپ اللہ کی مہربانی کے حق دار ہو جاتے ہیں۔

آپ کے لیے زندگی کی تمام نعمتیں دستیاب ہو جاتی ہیں، آپ اس معاملے میں یورپ اور امریکا کے ارب پتیوں کی مثال لے سکتے ہیں، بل گیٹس پر اللہ کا کرم ہے، کیوں؟ کیونکہ اس نے انسان کی زندگی کو آسان بنا دیا، اس نے انسان کو پرسنل کمپیوٹر دے دیا، یہ پولیو کی ویکسین بنوا کر پوری دنیا کو مفت فراہم کر رہا ہے، پاکستان اور افغانستان کے بچوں کو بھی بل گیٹس کی عطیہ کردہ ویکسین پلائی جاتی ہے۔ اللہ نے انسانیت پر اس مہربانی کے بدلے بل گیٹس کیلئے اپنی نوازشات کے دروازے کھول دیے، دوسرا طریقہ دعا ہے، ہم لوگ جب اپنے خالق سے زندگی، رزق، غربت، صحت، سکون، شہرت اور اختیار کے لیے دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور ہم پر اپنی نوازشات کے دروازے کھول دیتا ہے، ہم اگر اس کا رحم، اس کا کرم چاہتے ہیں تو پھر ہمیں اس سے مانگنا ہو گا، ہمیں اس سے طلب کرنا ہو گا،، وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا" کیا اللہ تعالیٰ کی نوازشات کے دروازے مکمل بند ہوتے ہیں اور ہم جب تک مانگتے نہیں یہ دروازے نہیں کھلتے؟،، وہ مسکرائے اور جواب دیا" اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی کم ترین ضروریات طے کر رکھی ہیں، یہ پتھر کے اندر کیڑے کو ہوا، پانی اور خوراک پہنچاتا ہے، یہ ریشم کے کیڑے کو "کوکون" کے اندر ضرورت کے مطابق رزق دیتا ہے۔

یہ آگ کے کیڑوں کو بھی خوراک دے رہا ہے اور یہ سمندر کی تہوں میں قید میل میل لمبی مچھلیوں کو بھی رزق دیتا ہے لیکن یہ مچھلی اللہ کی نوازش کے بغیر سطح آب پر نہیں آ سکتی۔ ریشم کا کیڑا اس کی مہربانی ہی سے "کوکون" سے باہر جھانک سکے گا اور آگ اور پتھر کے کیڑوں کو بھی اس کی نوازش کے بعد ہی باہر نکلنے کی توفیق ملے گی اور زندگی کا یہ مرحلہ صدقے اور دعا سے طے ہوتا ہے۔

صدقہ اللہ کی رضا کے لیے اس کی مخلوق پر مہربانی ہوتا ہے جب کہ دعا اللہ سے مانگنا، اللہ سے طلب کرنا ہوتی ہے،، وہ خاموش ہو گئے، میں نے عرض کیا" حضور دماغ کی ابھی ساری گرہیں نہیں کھلیں؟"۔ خواجہ صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے "ہم لوگ جب پیدا ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نوازشات کی چیک بک سے ایک چیک کاٹ کر ہماری جیب میں ڈال دیتا ہے۔ اس چیک پر اللہ کی منظوری کی مہر لگی ہوتی

ہے بس اماؤنٹ اور موڈ آف پے منٹ کا خانہ خالی ہوتا ہے، اماؤنٹ اور موڈ آف پے منٹ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا پڑتی ہے اور ہم جوں جوں اس سے مانگتے جاتے ہیں وہ اماؤنٹ کی جگہ پر ہندسے بڑھاتا جاتا ہے یہاں تک کہ چیک کیش ہونے کا وقت آجاتا ہے اور ہم نہال ہو جاتے ہیں"۔

میں نے عرض کیا"مگر ہماری ہر دعا قبول نہیں ہوتی" انھوں نے فرمایا"دعائیں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کے ہم اہل ہیں اور دوسری وہ جن کے لیے ہم کوالی فائی نہیں کرتے، مثلاً امتحان میں پاس وہی ہو گا جس نے امتحان دیا ہو گا اور اولاد اسے ہی ملے گی جس نے شادی کی ہو گی، ہم اگر امتحان دیے بغیر پاس ہونے کی دعا کریں گے تو ہماری یہ دعا قبول نہیں ہو گی کیونکہ ہم اس کے لیے کوالی فائی نہیں کرتے اور ہم اگر نتائج کے لیے کوالی فائی نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ دعا کی قبولیت تھوڑے عرصے کے لیے مؤخر کر دیتا ہے۔

یہ ہمیں پہلے امتحان میں بیٹھنے کی توفیق دیتا ہے اور اس کے بعد پاس کر دیتا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو یہ ہمارے خاندان، ہماری نسل اور ہمارے دوستوں میں سے ایسے لوگوں کا انتخاب کرتا ہے جو ہماری دعاؤں کے لیے کوالی فائی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں کے نتائج ان کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے اور یوں ہماری دعاؤں کا فائدہ ان لوگوں کے ذریعے ہم تک پہنچ جاتا ہے۔

ہماری دعاؤں کا چیک بعض اوقات ہماری اولاد بھی کیش کرا لیتی ہے، اللہ تعالیٰ ہماری سن لیتا ہے اور ہماری اولاد کو ہماری دعاؤں کے نتائج کے لیے کوالی فائی کر دیتا ہے اور یوں ہم اپنی اولاد کو خوش حال، باعزت اور باختیار ہوتے دیکھتے ہیں"۔ وہ خاموش ہو گئے لیکن میں کسی اور دنیا میں پہنچ گیا اور ان افراد کو ڈھونڈنے لگا جو میری دعاؤں کی قبولیت کیلئے کوالی فائی قرار پا گئے۔ مجھے کبھی اپنے مرحوم والدین کے روشن چہرے نظر آتے ہیں یا پھر نظر اہلیہ مرحومہ پر آکر ٹک جاتی ہے کہ میری ازدواجی اور کاروباری زندگی کی کامیابی میں اس کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی طویل بیماری میں مبتلا دیکھ کر میں ہر روز اپنا خوب احتساب کیا کرتا تھا کہ آخر وہ کون سی وجہ ہے جس کی بناء پر اس شدید آزمائش میں مبتلا کر دیا گیا ہوں۔ اہلیہ کو قرآن سے بڑا عشق تھا اور قرآن کا بڑا وسیع مطالعہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اس حالت میں جبکہ ان کا پورا جسم فالج کی وجہ سے مفلوج تھا لیکن معجزاتی طور پر ان کے بولنے، سننے اور سمجھنے کی قوت اب بھی بے مثال تھی اور چہرہ اور دایاں بازو مکمل طور پر صحت مند تھا۔

وہ اکثر قرآنی آیات سنا کر میرا حوصلہ بڑھاتی تھیں اور میں ان کی قوت برداشت پر بعض اوقات بہت حیران ہوتا تھا۔ ان کی زندگی کے آخری چند مہینوں میں ان کی مصروفیات بہت بڑھ گئیں اور وہ مکمل طور پر اپنی عبادات میں مشغول ہو گئیں۔ ایک دن اچانک یہ معجزہ ہوا کہ نرسنگ ہوم میں ہمارے کمرے کے دروازے پر دو خواتین دروازے پر کھڑی اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھیں اور میں مارے حیرت کے گم سم، گنگ انہیں دیکھ رہا تھا کہ وہ نورانی چہرے والی خاتون نے دوبارہ اجازت مانگتے ہوئے کہا کہ آپ نے ہماری آمد کا اگر برا نہیں منایا تو ہم اندر آجائیں؟ لیکن میں تو اس لئے خاموش تھا کہ ان خاتون کے چہرے کے نقش و نین میری مرحومہ والدہ سے اس قدر مل رہے تھے کہ مجھے چند منٹوں کیلئے یہ شک ہوا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

ان کی پہلی ملاقات کے بعد ہی ہم دونوں میاں بیوی کو یہ یقین ہو گیا کہ یقیناً یہ اللہ کی کوئی غیبی امداد ہے جو اس مصیبت کی گھڑی میں ہماری ازمائش ختم کرنے کیلئے آئی ہے۔ مجھے اور میری اہلیہ کو ان سے ایسی شدید محبت ہو گئی کہ ہم اب ہر دن ان کا شدت سے انتظار کرتے تھے اور جہاں اہلیہ فون پر ان سے بات کر کے بڑا سکون محسوس کرتی تھیں، وہاں میرے لئے بھی وہ ماں جیسا بڑا پہاڑ بن گئیں اور آج وہ میری ایسی "ماں جی" ہیں کہ میں اب خود کو ان

کے بغیر ادھورا سمجھتا ہوں۔ اہلیہ تو اس دنیا سے 27 رمضان کی مبارک شب کو رخصت ہو گئیں لیکن میں جو اکثر اس حادثے کے متعلق سوچ کر بڑا پریشان رہتا تھا، میرے اللہ نے اہلیہ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد مجھے "ماں جی" جیسا عظیم تحفہ دیکر زندہ رہنے کا سہارا دے دیا جن کی شب و روز کی مخلص دعائیں میرا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ یقیناً بابا جی جب دعا کا ذکر کر رہے تھے تو بار بار میرا دھیان "ماں جی" کی طرف پلٹ رہا تھا کہ ان کی زبان پر ہر کسی کیلئے دعاؤں کی تسبیح جاری رہتی ہے۔ اللہ انہیں سلامت اور ہمارے سروں پر ان کا سایہ ہمیشہ قائم دائم رکھے، آمین۔

مجھ سے جب کوئی بڑی بے بسی سے اپنے کھوئے ہوئے سکون کا تذکرہ کرتا ہے تو میں بھی لاجواب ہو کر کہیں کھو جاتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ سکون جیسی عظیم نعمت کسی غیر حاضر کیلئے اخلاص کے ساتھ دعا میں مسطور ہے۔ کیا ہم اپنے ان تمام احباب کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں؟ اگر نہیں تو آج ہی سے اس توفیق کی دعا مانگیں!

بروز جمعرات 25 جمادی الاوّل 1445ھ 7 دسمبر 2023ء

رسوائیاں ہمارا مقدر کیوں؟

ہماری قومی بے حسی اور چشم پوشی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ وقت کی پکار صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے۔ کاش یہ صدا کسی گنبد میں دی گئی ہوتی، کم از کم واپس تو لوٹتی۔ جہاں میں پوری قوت سے قوم کی مظلوم بیٹی عافیہ کا نام لیکر پکارتا کہ تم کہاں ہو؟ تو سوال کا جواب نہ ملتا، سوال تو واپس آتا۔ آیئے حساب لگا کر دیکھیں کہ جس روز قوم کی اس مظلوم بیٹی کو جو اپنے دو معصوم العمر اور ایک گود میں لپٹے بچوں کے ساتھ تھی، ہماری خفیہ ایجنسیوں کے مستعد اور سائے کی طرح پیچھا کرتے بے رحم ہاکس نے پوری درندگی اور سفاکی سے اغوا کیا تو ان دنوں کون کون مسند اقتدار پر متمکن تھا۔ 23 جون 2003ء کے بدنصیب دن پرویز مشرف صدر، ظفر اللہ جمالی وزیر اعظم، فیصل صالح حیات وزیر داخلہ، خورشید محمود قصوری وزیر خارجہ تھے اور سید ضمیر جعفری کے فرزند ارجمند جنرل احتشام ضمیر ایک اہم ترین قومی ایجنسی کے سربراہ تھے۔ ان تمام اعلیٰ عہدیداروں کے علم کے بغیر ایک پتہ بھی جنبش نہیں کر سکتا تھا ۔ ظفر اللہ جمالی صاحب اس تاریخ سے مزید ایک برس 26 جون 2004ء تک اپنے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔

فاسق کمانڈو کی رخصتی کے بعد جمہوری اور عوامی حکومت کا دعویٰ کرنے والے صدر آصف علی زرداری، وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی، حنا ربانی کھر وزیر خارجہ اور وزیر داخلہ رحمان ملک یہ سب افراد بھی اس حقائق سے انکار نہیں کر سکتے کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی اور اس کے بچوں 7 سالہ احمد، 5 سالہ مریم اور چند ماہ کا سلمان کے اغوا، حبس بیجا، اور امریکیوں سے قیمت کی سودے بازی اور حوالگی میں ملوث خفیہ ایجنسیوں کے کارپردازوں اور ایوان اقتدار کے حاکموں میں ہونے والی ان کاروائیوں سے مکمل طور لاعلم ہیں۔ شرم کا مقام تو یہ ہے کہ اس مظلوم اور بے گناہ خاتون کی وہ دردناک چیخیں جس نے بگرام ایئر بیس کے در و دیوار تک ہلا کر رکھ دیئے، ان کی اذیت ناک ابتدا تو اسلام آباد سے ہوئی ہو گی، وہ یہاں کسی کو سنائی کیوں نہیں دیں؟ وہ تمام خفیہ ایجنسیاں جنہوں نے عزت و وطن کا یہ معرکہ سر کیا، براہ راست وزیر اعظم کو جوابدہ تھیں اور اگر وزیر اعظم، وزیر داخلہ اور وزیر خارجہ کے اختیارات کی حدود آگ کے اس دریا کے پار نہیں جا سکتی تھی تو بھی ان کو کسی حد تک اعتماد میں ضرور لیا ہو گا۔

میں پوچھتا ہوں کہ بگرام ایئر بیس سے 650 نمبر قیدی خاتون کی چیخیں ہمارے عالی مرتبت حکمرانوں اور منبر و محراب کے وارثوں تک تو کیوں نہیں پہنچیں لیکن اس قیدی اور مومنہ بیٹی عافیہ کی ماں عصمت صدیقی جو قوم کی عصمت کا استعارہ تھیں، یقیناً اپنی ساری مناجات کے ساتھ خود پر گزری قیامت کی گھڑیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر رب اور مولا کے حضور حاضر ہو گئیں۔ میرا ضمیر اکثر مجھے کچوکے لگا کر سوال کرتا ہے کہ آخر مفتیان کرام کہاں ہیں؟ الرشید ٹرسٹ کے محافظین کہاں ہیں؟ جامعہ بنوریہ بنوری ٹاؤن کے علمائے کرام کو کیا ہوا؟ جناب مفتی تقی عثمانی صاحب، عصمت صدیقی کا نماز جنازہ پڑھاتے ہوئے عافیہ صدیقی کا سوچ کر اشکبار تو ہوئے ہوں گے، مظلوموں کی آہ و بکا پر پہنچنے والے جماعتہ الدعوہ کے مخلصین کی تو سمجھ آتی ہے کہ وہ بھی آج وفا کی قیمت ادا کر رہے ہیں لیکن حکومت کے پرانے وظیفہ خور کہاں ہیں؟ آخر انبیاء کے وارث کہلانے والے کسی بھی علمائے کرام کے کانوں میں یہ چیخیں کیوں نہیں پہنچی؟ ان کو چھوڑیئے ذرا مذہبی سیاسی جماعتوں کو آواز دیجئے، کہاں ہیں سارے مذہبی رہنما...؟؟

کیا آج تک اسلام آباد میں بیٹھے کسی بھی حکمران کی آنکھوں میں کبھی نمی اتری ہے؟ مریم نواز، بختاور اور آصفہ کے باپ کو کسی اور بیٹی کی یہ چیخیں کیوں سنائی نہیں دیں؟ کیا حکمران قوت سماعت سے محروم ہیں یا کسی دائمی اور غفلت کی نیند میں مبتلا ہیں؟ ایوان اقتدار تک پہنچنے کیلئے مرحومہ عصمت صدیقی اور ڈاکٹر فوزیہ صدیقی سے ان سیاست دانوں نے کیا کیا وعدے کئے تھے لیکن اقتدار کی ان غلام گردشوں اور نمک کی کان میں پہنچتے ہی نمک بن کر بے

خبر ہو جاتے ہیں لیکن قصر سفید کے فرعون کی حاضری کے دوران تمام پاکستانی صحافیوں کو عافیہ کے بارے میں سوال کرنے کی ممانعت کا حکم جاری کر دیا جاتا ہے؟ سوچتا ہوں کیا دانشوری بھی سورج مکھی کا پھول ہو گئی؟

کیا اس قوم کے سارے بیٹے کھیت ہوئے کہ جب ان کا لیڈر اقتدار سے محرومی کے بعد ایک کاغذ لہرا کر للکارتا ہے کہ "کیا ہم کسی کے غلام ہیں؟" لیکن اس پر جان فریفتہ کرنے والوں کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اپنے رہنماء سے یہ پوچھتے کہ ہماری بے گناہ بہن کو امریکا سے واپس لانے کا وعدہ ایفا کیو نکر نہ ہوا؟ جبکہ تم نے برطانوی نو مسلم بہن ایوان رڈلے کے ساتھ پاکستان میں ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں کیا وعدے کئے تھے؟ کیا ہم واقعی ہی وہ قوم ہیں جس کے حکمرانوں نے ڈالروں کے عوض پاکستانی سپوت ایمل کانسی کو خود گرفتار کر کے قصر سفید کے فرعون کے حوالے کر دیا، جس کے جواب میں بھری عدالت میں امریکی اٹارنی جنرل نے کہا تھا کہ پاکستانی چند ٹکوں کی خاطر اپنی ماؤں کو فروخت کر دیتے ہیں!

بگرام ائیر بیس کی قیدی نمبر 650 صرف اپنے تین بیٹوں کی ماں نہیں بلکہ اس قوم کی ماں بہن اور بیٹی بھی ہے۔ نام اس کا ڈاکٹر عافیہ صدیقی ہے جس کی عافیت کی ذمہ داری ریاست پر تھی۔ وہ کراچی سے اچانک اچک لی گئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ پہلے یہ اطلاع آئی کہ وہ اپنے بچوں سے محروم کر دی گئی ہے۔ اس کی گود میں پلنے والا چند ماہ کا بچہ مار دیا گیا ہے اور اسے نامعلوم عقوبت خانوں، قید خانوں، تہہ خانوں اور بوچڑ خانوں سے گزار کر اس حال میں بگرام جیل پہنچا دیا گیا تھا کہ وہ اپنی پہچان تک بھول گئی، اس کے حواس خمسہ اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اسے زمانے کی نظروں میں ایک پاگل وجود قرار دے دیا گیا۔ وہ روتی نہیں، صرف چیختی تھی۔ اس کی چیخیں سننے والے قیامت کی آہٹ سنتے تھے اور سو نہیں پاتے تھے لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو فراموش کر گئی، اپنے آپ سے منہا ہو گئی، اپنے حواس کھو بیٹھی، اپنے وجود میں آپ تحلیل ہو گئی تو پھر وہ چیختی کیوں ہے؟ اس کی آواز میں بلا کا کرب کیوں ہے؟ بگرام جیل سے امریکی عقوبت خانوں کے در و دیوار پر یہ لکھی ہوئی ندامت کیسی؟ آخر عصمت صدیقی اور قوم کی بے گناہ بیٹی ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی دردناک چیخیں تمام عافیت خانوں کو دہلا کیوں دیتی ہیں؟ اس لئے کہ پاگل عورت بھی اپنے بچوں کو بھلا نہیں پاتی جس طرح آخری سانس تک عصمت صدیقی کی اپنی بیٹی کے انتظار میں آنکھیں پتھرا گئیں۔ شاعر نے کس کرب سے کہا ہے کہ:

خدا نے یہ صفت دنیا کی ہر عورت کو بخشی ہے
کہ وہ پاگل بھی ہو جائے تو بیٹے یاد رہتے ہیں

کوئی عصمت صدیقی، ڈاکٹر فوزیہ اور ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے کرب کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اقوام متحدہ خاموش ہے اور خواتین پر تشدد کے خلاف قائم تمام بین الاقوامی تنظیمیں گویا موت کی آغوش میں چلی گئیں ہیں کہ ان کو بھیجی جانے والی ایک بھی یادداشت پر ان تنظیموں نے کوئی بیداری کی انگڑائی لی اور نہ دکھ سے کوئی جھرجھری لی جبکہ درجنوں پلیٹ فارمز پر میں خود دہائیاں دے چکا ہوں۔ رپورٹ کہتی ہے کہ بے پناہ تشدد سے ڈاکٹر عافیہ صدیقی اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ برسوں تک انہیں نہانے اور دیگر ضروریات کیلئے مردانہ غسل خانہ استعمال کرنا پڑا جہاں پردے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ وہ بگرام جیل کی واحد خاتون قیدی تھی جس کو دیکھنے والی ایک باضمیر برطانوی صحافی ایوان رڈلے نے کہا تھا کہ "وہ ایک بھوت کی مانند لگتی ہے جس کی شناخت دھندلا چکی ہے۔" لیکن اب برسوں سے امریکی عقوبت خانوں میں اس پر کیا بیت رہی ہے، کوئی نہیں جانتا؟ ڈاکٹر فوزیہ کے آنسوؤں کے سامنے بے بس ہو گیا ہوں۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی اس کی چیخیں تمام ان بے ضمیر مقتدر لوگوں کا تعاقب کر رہی ہیں بلکہ اب تو معاملہ اور بھی سنگین ہو گیا ہے کہ عصمت

صدیقی ان تمام افراد کے خلاف ایک مضبوط ایف آئی آر کے ساتھ رب کے حضور پہنچ چکی ہیں جہاں وہ اپنی معصوم اور بے گناہ حافظہ عافیہ صدیقی کا مقدمہ پیش کریں گی اور وہ معصوم بچہ جس کا آج تک سراغ تک نہ مل سکا، وہ بھی اپنی نانی کے ہمراہ اس سارے ظلم کی گواہی دینے کیلئے پہلے سے موجود ہے، وہ یہ ہے کہ جیل عملے کی طرف سے اسے مسلسل جنسی ہو گا۔ رپورٹ کا سب سے دردناک پہلو جس نے ہر صاحب ضمیر باپ کو انگاروں پر لٹا دیا جس کے باعث اس کا کرب انگاروں سے زیادہ تیز اور شدید ہو گیا اور اب امریکی زنداں میں اس کی آبرو تھکی ہوئی اذانوں سے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا بوجھل اور گردوپیش کی تماشائی تنہائیوں سے چور زخمی حالت میں آسمان کی طرف منہ کر کے رب کو تو ضرور پکار رہی ہے۔

میں اس وقت بڑے کرب میں ہوں جب یہ سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے شب و روز ایک ایسے ظلم کا روز نشانہ بنتے ہیں جیسے دیہاتی گنے کی پوروں سے رس چوستے ہیں یا بے درد، بے حس اور شقی القلب حکمران اپنی رعیت کی بیٹیوں کا لہو چاٹتے ہیں۔ اب ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی آنکھوں کا بہتا ہوا دردناک پانی ہمارے مقتدر حلقوں کے قلب کی سیاہی اور عافیہ کی دردناک چیخیں حکمرانوں کی بے ضمیری کی پیداوار بن چکی ہیں۔ اس کی پیٹھ پر لگے گھاؤ ہمارے ان حکمرانوں کے گناہوں کی دستاویز بن چکے ہیں جنہوں نے محض چند ڈالروں کے عوض اسے فرعونی طاقتوں کے حوالے کر دیا اور صد آفریں ، عصمت صدیقی مرحومہ کی عظمت ملاحظہ فرمائیں کہ اپنی رحلت سے چند دن قبل خود مجھ سے فون پر اور اپنی بیٹی ڈاکٹر فوزیہ کو حکم دے رہی تھیں کہ کوئی مشرف کو یہ خبر کر دے کہ میں نے اسے معاف کر دیا، یہ اس کمانڈو پر ایسا گراں مایہ احسان تھا کہ ممکن ہے کہ اس کی زندگی کی آخری سانسیں کچھ ہموار ہو گئیں ہوں اور جان کنی کا عمل آسان ہوا ہو، واللہ عالم۔۔۔۔ جبکہ اس سے قبل لال مسجد کے مولانا عبدالعزیز جن کے بھائی اور جواں سال اکلوتے بیٹے کو برسٹ مار کر اڑا دیا گیا تھا، وہ بھی مشرف کو معاف کر چکے لیکن جامعہ حفصہ کی درجنوں یتیم بچیاں اور بچے جو اس روح فرسا حادثے میں گولیوں کا شکار ہو کر اپنے خون آغشتہ جسموں کے ساتھ اس طرح اللہ کے حضور پہنچ گئے کہ ان کے ساتھ درجنوں قرآن و حدیث بھی خاکستر کر دیئے گئے، کیا اس کا حساب نہیں ہو گا؟ یقیناً ظالم اور مظلوم ایک صف میں نہیں بلکہ آمنے سامنے کھڑے کئے جائیں گے!

ان کا خون جن افراد کے ہاتھوں پر ہے، ان کو تو بہر حال حساب دینا ہو گا اور اپنے شب و روز میں اگر ان کے ضمیر زندہ ہیں تو ضرور سوال کرتے ہوں گے کہ روز جزا کے دن جب اللہ کی عدالت میں شہداء پیش کئے جائیں گے تو یہ معصوم یتیم شہداء کن کے ساتھ کھڑے ہوں گے اور قاتلین کو کس ندامت کی قطار میں کھڑا کیا جائے گا.... ڈاکٹر عافیہ کے ساتھ ایسا سلوک کرنے میں معاونت کرنے اس وقت زندہ بچ جانے والے یہ ضرور سوچیں کہ روز آخرت کیلئے اپنے اعمال نامہ میں عافیہ کی دلدوز چیخیں کیا رنگ لائیں گی۔ اس مکروہ عمل کا وجود تا قیامت انسانیت کیلئے ایک سوال بنا رہے گا، اس کے گرد گونجنے والی تکبیریں، بکھرنے والے سجدے اور بلند ہونے والی اذانیں جو اپنی حقیقت کھو بیٹھی ہیں، اس کی پوری ذمہ داری ان تمام معاونین پر بھی عائد ہو گی جنہوں نے اس فاسق کمانڈو کے احکام کی تعمیل کی اور ان سیاستدانوں پر بھی یہ فرد جرم عائد ہو گی جنہوں نے اس عمل کا ساتھ دیا۔

کبھی سوچا ہے آپ نے کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا تحلیل ہوتا ہوا وجود ہم سے سوال کرتا ہے کہ وہ پاکستانی اخبارات اور جرائد کا موضوع کیوں نہیں، وہ ٹیلیویژن کی جگمگاتی ہوئی اسکرینوں پر مسکراتے چہروں کے ساتھ نمودار ہونے والے میزبانوں کیلئے سوال اٹھانے کا سبب کیوں نہیں؟ کیوں اخبارات و جرائد خاموش اور ٹیلیویژن کی اسکرینیں گونگی اور بہری ہو گئیں ہیں؟ کیا پاکستان میں ایک بھی ایسا فرد نہیں

جس کے کانوں میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی دردناک چیخیں اور دلدوز نالے پہنچیں؟ وہ حوا کی بیٹی ہے، اگر آپ اس مقدمے پر اپنی روشن خیال اعتدال پسندی کو قربان نہیں کرنا چاہتے تو یشودھا کی ہم جنس اور رادھا کی بیٹی خیال کیجئے۔ اس کیلئے آواز بلند کیجئے۔ اہل قلم نہیں جانتے کہ اگر فکر کی صالحیت سو جائے تو اظہار کی جامعیت کجلا جاتی ہے۔ پھر حرف مستحق ہوتے ہیں کہ بے حرمت ہوں، دھتکارے جائیں اور پامال ہوں۔ فقرے آوارہ قہقہے بن جاتے ہیں اور یوں ہر روز پیلے صفحات پر کالی سیاہی سے چھپنے والے سفید جھوٹ سے دل اوبھنے لگتا ہے۔

مملکت خداداد پاکستان جو کلمہ کی بنیاد پر ہمیں 27 رمضان الکریم کی مبارک شب کو اس اوفو بالعہد پر عطا کیا گیا کہ ہم یہاں مکمل قرآن نافذ کریں گے لیکن نہ صرف اپنے پالن ہار سے وعدہ شکنی کے مرتکب ہو رہے ہیں بلکہ سود کی حمائت میں عدالتوں سے رجوع کر کے اللہ اور رسول کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان کر چکے ہیں۔ ایک نیوکلیئر ریاست ہونے کے باوجود اقوام عالم میں ہماری کیا حیثیت ہے کہ ہر روز نکلنے والے سورج کی روشنی میں ہمارے تاریک اعمال اور نمایاں ہو جاتے ہیں مگر میرا رب جو دنیا کے تمام خزائن کا مالک ہے، ہم نے اس سے منہ موڑ کر دنیا کے استعماری آقاؤں کی غلامی قبول کر لی ہے جو ہزاروں میل دور بیٹھ کر ہماری قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ جسم میں سب سے چھوٹا لوتھڑا "دل" جس سے ہماری زندگی کی ڈور جڑی ہوئی ہے، اس میں صرف ایک ہی خوف سما سکتا ہے۔ اگر رب ذوالجلال کا خوف اوڑھنا بچھونا بن جائے تو ساری دنیا آپ سے خوفزدہ رہتی ہے لیکن اگر دنیا کا خوف پال لیا جائے تو دوسرا خوف چپکے سے رخصت ہو جاتا ہے اور پھر دنیا کی تمام رسوائیاں ہمارا مقدر بن جاتی ہیں اور اس وقت یقیناً ہم ایسی ہی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔

مگر میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کیلئے اس قوم سے کیا شکوہ کروں جس نے اپنے محسنوں کے کفن کے تار بیچے ہیں۔ جس نے ام کلثوم کے منہ پر طمانچے مارے ہیں، جس نے حیدر کرار کے خیموں کی طنابیں کاٹ ڈالیں، حضرت مجدد الف ثانی کو گوالیار کے قلعے میں قید کیا، شاہ ولی اللہ کے ساتھ ہمارا سلوک تاریخ کے صفحات پر آج تک شرمندگی کی فصل اگاتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا، حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید بالاکوٹ میں مسلمانوں کی غداری سے شہید ہوئے۔ تاریخ پاکستان کا تذکرہ مولانا محمد علی جوہر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا مگر جب وہ بیمار ہوئے تو کوئی مسلمان نواب یا رئیس نہیں پہنچا بلکہ ان کی مدد کو ریاست الور کا ہندو مہاراجہ آیا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی غلامی کے خلاف قربانی وایثار کی روح پھونکنے والے مولانا ظفر علی خان بیماریوں میں اس طرح جئے کہ ادویات کیلئے پیسے نہیں تھے اور جب ان کا انتقال ہوا تو چھٹا آدمی نہیں تھا۔

دور مت جایئے، ابھی کل کی بات ہے کہ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر جس کا محض قصور یہ تھا کہ اس نے پاکستان کو پہلی مسلم نیوکلیئر ریاست بنانے میں اپنی جان کھپا دی لیکن اس کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا کہ جیتے جی اس کی زندگی میں کن صدمات سے دوچار کیا گیا کہ اسے مجبور کیا گیا کہ وہ ٹی وی پر آ کر اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگے اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو ملک کا سربراہ جو شب و روز پاکستان کو ریاست مدینہ بنانے کا دعویٰ کرتا تھا، اور اپنے اقتدار سے محرومی پر یہ نعرہ لگا کر قوم کے جذبات سے کھیلتا ہے کہ "کیا ہم امریکا کے غلام ہیں"، محسنِ پاکستان کے جنازے میں نہ آیا کہ کہیں مبادا آقا کی نظروں میں مردود نہ ٹھہرایا جاؤں لیکن مکافات عمل کا پھر بھی شکار ہونا پڑا اور اب اسی اقتدار سے محرومی کا زخم اڈیالہ جیل میں درجنوں مقدمات کا بوجھ ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔

بگرام جیل میں چیخنے والی ڈاکٹر عافیہ صدیقی اگر امریکی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہماری تاریخ کی فریاد سن سکے تو اسے کچھ قرار آ جائے۔ ہم مسلمان تاریخی

طور پر کچھ ایسے ہی واقع ہوئے ہیں۔ خدا فراموش، خود فراموش اور اب ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو فروخت کرنے والے تازہ بے ضمیر بلکہ ہم نے تو قومی خزانے سے اس کی رہائی کیلئے مقدمہ لڑنے کے نام پر دو ملین ڈالر تک اڑا لئے۔ مسلمان ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے ساتھ جو مرضی سلوک کریں مگر ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا وجود شہنشاہ عالم قصر سفید میں مقیم فرعون کے آستانہ جبروت پر ایک مقدمہ بن کر ہمیشہ موجود رہے گا۔ کیا یہ مقدمہ شہنشاہ عالم قصر سفید میں مقیم فرعون کی فرمانروائی کو جھکا دے گا؟ کیا یہ مغربی طاقتوں اور امریکا کی لونڈی اقوام متحدہ کے ماتھے پر کلنک کا سوالیہ نشان ثبت کرے گا؟ کیا یہ عالم انسانیت میں کوئی بیداری پیدا کرے گا؟؟؟ اس کا جواب یقیناً تاریخ کے ذمہ ہے۔ کئی کردار اس دنیا میں باعثِ عبرت بن چکے اور باقی بھی مقام عبرت بنائے جائیں گے، اللہ کے کوڑے سے بچ نہ پائیں گے اور آخرت میں جہنم کی دہکتی آگ تو یقیناً ان کی منتظر ہے!

اَللّٰھُمَّ أَجِرنِي مِنَ النَّار۔۔اِنَّکَ اَنتَ غَفُورُ الحَلِیمْ، اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّی۔۔۔اے اللہ مجھے آگ سے بچا کیونکہ تو بخشنے والا اور بردبار ہے۔ اے اللہ تو معاف کرنے والا ہے اور معافی کو پسند کرتا ہے اس لیے مجھے معاف کر دے۔ اللھم آمین

منصفوں کی نظر دیکھتی رہ گئی
زندگی! تیرے قاتل بری ہو گئے

بروز ہفتہ 27 جمادی الاوّل 1445ھ 9 دسمبر 2023ء

ٹرائیکا اور پاکستانی ممکنہ انتخابات

پاکستان کے اندرونی معاملات میں بھارت کی مداخلت کے عمل کو سمجھنے کیلئے اس کے صحیح تاریخی پس منظر کا مطالعہ ضروری ہے۔ پاکستان کے خلاف بھارت کے عناد کا اصل سبب ہندوستان کو متحد رکھنے میں کانگریس قیادت کی کوششوں کی ناکامی تھا۔ ہندوئوں کیلئے پاکستان کی تخلیق دراصل بھارت ماتا کو دولخت کرنے کے مترادف تھی۔ اسی لیے انہوں نے تقسیم ہند کے نظریے کو کبھی بھی دل سے قبول نہ کیا۔ "اکھنڈ بھارت" کا خواب ہمیشہ سے ان کا اجتماعی آدرش رہا ہے۔ چنانچہ پاکستان میں پیدا ہونے والے 1971ء کے بحران نے بھارت کو اپنی اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کیلئے بہتر موقع فراہم کیا۔ بھارت کو یقین تھا کہ ایسا موقع دوبارہ نہیں آئے گا چنانچہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کیلئے بھارت نے تمام مسلمہ اقدار کو خیر باد کہہ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بھارت نے تقسیم کو اس امید کے ساتھ قبول کیا تھا کہ پاکستان کی نوزائیدہ ریاست حالات کا مقابلہ نہیں کر سکے گی اور تھوڑے ہی عرصہ میں دم توڑ جائے گی۔ بقول نہرو "پاکستان کی تخلیق ایک عارضی اقدام ہے اور یہ آخر کار متحدہ ہندوستان پر منتج ہو گی۔ جوزف کاربل سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پاکستان ناقابل عمل مذہبی نظریے کی حامل قرون وسطیٰ کی ایک ریاست ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ بھارت کے ساتھ اس الحاق ضروری ہو جائے گا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے 14 جون 1947ء کو ایسے ہی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی قرارداد میں کہا تھا کہ ہندوستان کی صورت گری اس کے جغرافیے، پہاڑوں اور سمندروں نے کی ہے اور کوئی انسانی کوشش اس کی ہیئت میں تبدیلی نہیں کر سکتی، نہ اس کی حتمی منزل کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کا جو نقشہ ہمارے خوابوں کی سرزمین ہے وہ ہمارے دلوں اور دماغوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی دیانت داری سے یہ سمجھتی ہے کہ جب جذبات کا یہ طوفان کم ہو گا تو ہندوستان کے مسئلے کا اس کے صحیح پس منظر میں جائزہ لیا جا سکے گا اور دو قوموں کے باطل نظریے کو کوئی حامی نہیں مل سکے گا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی یہ قرارداد پاکستان کے ہندوستانی رہنماؤں کے رویے پر ہمیشہ سایہ فگن رہی۔ اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا کہ تقسیم کے عمل سے صرف ہندوستان کا نقشہ متاثر ہوا ہے لوگوں کے دل تقسیم نہیں ہوئے، اور مجھے یقین ہے کہ یہ تقسیم عارضی ثابت ہو گی۔ گاندھی نے کہا: کانگریس پاکستان کی مخالف تھی اور وہ ان لوگوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے ہندوستان کی تقسیم کی ثابت قدمی سے مخالفت کی۔

مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی اور شیخ مجیب الرحمن کی گرفتاری پر بھارت نے فوری ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ بھارتی خوش تھے کہ ان کا دشمن پاکستان مصیبت میں مبتلا ہے۔ 27 مارچ کو جب بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے سرکاری طور پر بنگالیوں سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا تو اُس وقت تک ایک بھی بنگالی مہاجر سرحد پار کر کے بھارت نہیں پہنچا تھا۔ بھارتی مداخلت کے پس پشت کارفرما عزائم اور جذبات کا اظہار 27 مارچ کو لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں اندرا گاندھی کے خطاب سے ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا: "مشرقی بنگال میں حالات بدل چکے ہیں، ہم نے نئی صورت حال کو خوش آمدید کہا ہے، ہم حالات پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہیں اور ہم نے ممکنہ حد تک رابطہ قائم کر رکھا ہے، معزز ارکان بخوبی سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر حکومت کیلئے اس سے زیادہ کہنا ممکن نہیں۔ میں ان فاضل اراکین کو جنہوں نے سوال کیا ہے کہ کیا فیصلے بروقت کیے جائیں گے، یقین دلانا چاہتی ہوں کہ اس وقت ہمارے لیے اہم ترین کام یہی ہے۔ اس مرحلے پر ہمارا ردِّ عمل صرف نظری نہیں ہونا چاہیے"۔ مشرقی بنگال میں اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے اس امر کا اظہار کیا کہ بھارتی حکومت مناسب وقت پر عملی اقدامات سے گریز نہیں کرے گی۔ وقت آنے پر اندرا نے اپنے الفاظ کو سچ کر دکھایا۔

تقسیم کے بعد بھارتی حکومت نے پاکستان کی سالمیت اور یکجہتی کو گزند پہنچانا تھی۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان کے دگرگوں حالات نے وہ زریں موقع فراہم کر دیا جس کا بھارت کو برسوں سے انتظار تھا۔ بھارتی پارلیمنٹ کے رکن سبرا منیم سوامی نے پاکستان کے بارے میں بھارتی رویے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ حالات کے معروضی مطالعہ سے ظاہر ہو گا کہ بھارت نے پاکستان کو مہاجرین کے مسئلے سے نمٹنے کیلئے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا۔ یہ ایک لغو تصور ہے۔ بھارت نے پاکستان کے خلاف جنگ کا آغاز قوم پرستوں کی تشفی اور اس معقول نقطہ نظر کے پیش نظر کیا تھا کہ پاکستان کی تقسیم بھارت کے طول المیعاد مفاد میں ہے۔

بھارت نے پروپیگنڈہ کے محاذ پر بھی پاکستان سے سبقت لے جانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس نے صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور غیر ملکی پریس کی مدد سے خود کو بنگالیوں کے نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا۔ بھارت کی بہتر پروپیگنڈہ مشینری کے علاوہ اور عوامل بھی پاکستان کیلئے کامیابی سے اپنا مؤقف پیش کرنے کی مساعی میں رکاوٹ کا باعث بنے۔ ان میں سے بعض عوامل یہ تھے:

(1) بھارت سب سے بڑا ایشیائی جمہوری ملک تھا جبکہ پاکستان میں فوجی حکومت قائم تھی۔

(2) مغرب میں ذرائع ابلاغ کے بڑے حصے پر قابض صہیونی لابی نے بھارت کا کھل کر ساتھ دیا۔ تل ابیب (اسرائیل) نے مغربی دنیا میں بسنے والے اپنے پیروکاروں کو یہ پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ بنگلہ علیحدگی پسندوں کی اخلاقی اور مادی مدد کریں اور اس ضمن میں بھارت سے تعاون کریں۔

(3) سیاسی مسائل کے حل کیلئے فوجی کارروائی کے خلاف عمومی نفرت پھیلائیں۔

(4) عوامی لیگ کے رہنمائوں کے غیر ملکی نامہ نگاروں سے ذاتی مراسم اور سب سے بڑھ کر فوجی حکومت کا غیر ملکی نامہ نگاروں کے ساتھ غیر دانش مندانہ سلوک اور ڈھاکا کی فوجی انتظامیہ کی طرف سے انہیں شہر چھوڑ دینے کا حکم"۔

غیر ملکی نامہ نگاروں کی ذاتی رنجش اور غصے کا عکس، فوجی کارروائی کے بارے میں ان کی مبالغہ آمیز رپورٹنگ "میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ جنرل ٹکا خاں کا یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ دنیا آج بھی سمجھتی ہے کہ آغاز ہماری طرف سے ہوا، یہ تاریخ کے ساتھ سنگین مذاق ہے۔ مجیب الرحمن بہر صورت طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے، جس کے نتیجے میں جنم لینے والے تصادم میں بنگالی ہلاک شدگان کی تعداد کو ہزار فیصد اور بعض اوقات اس سے بھی بڑھا کر پیش کیا گیا۔ مجیب الرحمن کا جھوٹ کہ فوجی کارروائی کے دوران آبروریزی کے دو لاکھ 20 ہزار واقعات وقوع پذیر ہوئے جبکہ ایک رومن کیتھولک تنظیم کے مطابق جس کا ذکر اخبارات نے مناسب نہیں سمجھا، یہ تعداد دو ہزار تھی اور اس خوفناک عمل میں خود مکتی باہنی کے ہندو افراد کی تعداد زیادہ تھی۔ اس تنظیم کے چند افراد نے یہ رپورٹ خود ذاتی طور پر ان متاثرہ خواتین کے انٹرویو کے بعد تیار کی تھی۔ فوجی کارروائی کے بعد عوام کے جذبات اس بری طرح بھڑک چکے تھے کہ عوامی لیگ کی پروپیگنڈہ مشینری نے حق اور صداقت کو دبا دیا۔ جذبات کا یہ طوفان تھمنے کے بعد غیر ملکی اخبارات میں مشرقی پاکستان میں ہلاک شدگان کی مبالغہ آمیز تعداد کے بارے میں تردیدی رپورٹیں شائع ہونے لگیں۔ ایسی ہی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "میں نے بنگلہ دیش کا تفصیلی دورہ کیا ہے اور یہی عوام اور دیہی کارندوں سے بے شمار ملاقاتوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تیس لاکھ افراد کی ہلاکت کا دعویٰ

لغو اور لغو اور مبالغہ آمیز ہے۔ بنگلہ دیش کی وزارت داخلہ نے مارچ میں تحقیقات کی تو شہریوں نے پاکستانی فوج کے ہاتھوں تقریباً 2 ہزار افراد کی ہلاکت کی اطلاعات فراہم کیں جو مزید آزادانہ تحقیقات کے بعد 922 کی تصدیق ہو سکی۔

مئی 1971ء میں بھارتی انسٹی ٹیوٹ آف ڈیفنس اسٹڈیز کے ڈائریکٹر سبرا منیم نے یہ نظریہ پیش کیا کہ لاکھوں مہاجرین کو غیر معینہ مدت تک پالنے کی بجائے اقتصادی مشرقی پاکستان زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکے نقطہ نظر سے بہتر ہو گا کہ بنگلہ دیش کا مسئلہ جنگ کے ذریعے حل کر دیا جائے۔ گا۔ انہوں نے پیش گوئی بھی کی کہ پاک بھارت جنگ کے دوران بھارتی صنعتیں متاثر نہیں ہوں گی اور یہ کہ بنگلہ دیش کے مسئلے کا جنگی حل بھارت کی استعداد سے باہر نہیں۔ انہوں نے یہ پیشن گوئی بھی کی کہ پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں چین مداخلت نہیں کرے گا۔ انہوں نے یقین ظاہر کیا کہ پاکستان کی فوجی حکومت بھارت کے ہاتھوں شکست کو مجیب الرحمن کے ساتھ سیاسی سمجھوتے پر ترجیح دے گی۔ تاہم انہوں نے انڈیا کو مغربی محاذ پر اچانک پاکستانی حملے کے امکانات سے خبر دار کیا۔ سبرا منیم کے ان خیالات کو بھارت کے سرکاری حلقوں میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی اور نئی دہلی میں ہونے والے کئی فیصلے ان خیالات کے زیر اثر کیے گئے۔

بھارتی رہنماؤں کی کئی تحریروں اور تقریروں سے بھارت کے اس دعوے کی نفی ہوتی ہے کہ مشرقی پاکستان پر اس کے حملے کا مقصد مصیبت زدہ عوام کی امداد تھی۔ جے پرکاش نرائن نے بنگلہ دیش کے موضوع پر بند کمرے میں ہونے والے ایک سیمینار میں انکشاف کیا کہ "بھارت نے مشرقی پاکستان کی آزادی کیلئے مداخلت کا فیصلہ خدائی فوجدار کے طور پر نہیں کیا تھا بلکہ اس فیصلے کا واحد محرک ہمارا قومی مفاد تھا۔ ظاہر ہے کہ بنگالیوں کی ہلاکت اور ان کی جدوجہد کے بارے میں بھارتی پروپیگنڈے اور تارکین وطن سے اظہار ہمدردی کا ڈراما محض مشرقی پاکستان پر حملے کیلئے رچایا گیا تھا۔

"دی ٹائمز (لندن) نے درست لکھا تھا کہ مارچ سے لیکر نومبر 1971ء میں فوجی حملے تک بھارتی مداخلت میں ایک سست رو مگر مسلسل عمل کے تحت اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بھارت نے پہلے سے مشرقی پاکستان پر حملے کا منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ کلدیپ نیر نے اس امر کی تصدیق کی کہ بھارت کا ارادہ مئی، جون میں پاکستان پر حملہ کرنے کا تھا مگر چیف آف اسٹاف نے مشورہ دیا کہ مشرقی بنگال میں مون سون کی وجہ سے وسیع تر فوجی کارروائی نامناسب ہو گی ان کے خیال میں "اس مقصد کیلئے سردیوں کا موسم بہترین ہو گا۔ کلدیپ نیر نے مزید انکشاف کیا کہ "درحقیقت بھارت نے قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی مشرقی پاکستان پر قبضے کا ایک پندرہ روز منصوبہ تیار کیا تھا۔ یہی وہ منصوبہ تھا جسے اب جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے بروئے کار لایا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ سے بہت عرصہ پہلے ڈھاکا کے گردونواح میں سادہ کپڑوں میں ملبوس بھارتی فوجی دیکھے گئے۔ بعد ازاں اندرا نے خود اپنے بیان میں کہا کہ "گوریلوں کی تربیت اور انہیں بھارتی اسلحے کی فراہمی ہی "مشرقی پاکستان" کے بحران کا حتمی حل ہے۔ اور یہ حل آزاد بنگلہ دیش کے سوا کچھ نہیں۔ ایک بنگالی ہندو صحافی ایس براتا کے انکشافات مزید حیران کن ہیں، جن کے بقول مکتی باہنی دراصل بھارتی سپاہیوں کی ایک تنظیم تھی اور یہ کہ "اگر وہ بھارت میں رہتے ہوئے یہ بات کہتے تو انہیں یقیناً گرفتار کر لیا جاتا"۔

اس امر کی واضح شہادتیں موجود ہیں کہ مکتی باہنی تمام نہیں تو اس کا بڑا حصہ بھارتی فوجیوں پر مشتمل تھا۔ ٹائمز (لندن) کا یہ تبصرہ بالکل بجا تھا کہ "فوجی کارروائی کے بعد بھارت سے اسلحہ کی فراہمی رک گئی۔ اب بھارت کا اگلا اقدام یہ تھا کہ پاک فوج کے اقدام میں رکاوٹ کیلئے ذرائع مواصلات کو سبوتاژ کرنے اور باغیوں کی حوصلہ افزائی کی غرض سے مشرقی پاکستان میں تخریب کار بھیجے جائیں۔ ابتداء میں بھارت نے مکتی باہنی کو اسلحہ اور گولہ بارود فراہم

کیا لیکن جب یہ بات واضح ہو گئی کہ متعینہ مقاصد کا حصول مکتی باہنی کے بس کی بات نہیں تو بھارتی فوج بھی میدان میں کود پڑی"۔

دی ٹیلیگراف" نے اپریل میں شائع ہونے والی ایک خبر میں کہا کہ "قرائن بتاتے ہیں کہ بھارتی اسلحہ سے بھری ہوئی ایک ٹرین مدار پور کے قریب علیحدگی پسندوں کے پاس پہنچ چکی ہے۔ ایک غیر ملکی اخبار کے مطابق "انڈیا نے مشرقی سرحد کے ساتھ چوکیاں قائم کر رکھی تھیں، جہاں سے بھارتی اسلحہ مشرقی پاکستان پہنچایا جاتا تھا۔ "ایسی کئی اور رپورٹوں سے اس امر کی تصدیق کی گئی کہ بھارت تخریب کاروں کو براہِ راست اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔" گوریلا سرگرمیوں کے مراکز زیادہ تر ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز میں موجود تھے۔ طالب علموں خصوصاً مکتی باہنی فوج میں شمولیت کے خواہش مند ہندو نوجوان رضاکار بھی بھرتی کئے گئے، جن کا اہم مقصد سبوتاژ کی کارروائیاں کرنا تھا۔ ان رضاکاروں کو بھارتی فوج کے قائم کردہ پچاس سے زیادہ تربیتی مراکز میں تربیت دی گئی، دوسری طرف بائیں بازو کی نیشنل عوامی پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی کے گوریلا گروپ نے بھارتی سپاہیوں کے تعلق سے دوسری طرف بائیں بازو کی نیشنل عوامی پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی کے گوریلا گروپ نے بھارتی سپاہیوں کے تعلق سے مشرقی پاکستان کے اندرونی علاقوں کو اپنی تخریبی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ بھارت نے مکتی باہنی کے چھاپہ ماروں کو پناہ دینے کے علاوہ اس کے رضاکاروں کی تربیت کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ اس نے کئی مواقع پر انہیں توپیں اور مارٹر فائر بھی مہیا کیے۔

ایک بہترین عسکری ماہر کی رائے میں ڈھاکا کا قرض سری نگر میں چکایا جا سکتا تھا اور اس حوالے سے پاکستان کو کئی نادر مواقع بھی ملے لیکن سیاسی طور پر مضبوط نہ ہونے اور نظریاتی عدم یکسوئی کی وجہ سے یہ اہم مواقع ضائع کر دیئے گئے۔ صورتحال یہاں تک بھی رہتی تو ٹھیک تھا لیکن ستم یہ بھی ہے کہ جس ملک نے پاکستان کے دو ٹکڑے کئے اس کے ساتھ دوستی کے وہ راگ چھیڑے گئے جن کی بے سری تانوں نے ہر کشمیری کو بے چین کر کے رکھ دیا ہے۔ پاکستان کی سیاسی اور عسکری اشرافیہ کے پاس یقیناً اس سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ہے کہ سقوطِ ڈھاکا کا حساب بے باق کرنے کیلئے قدرت نے جو نادر مواقع فراہم کئے ان سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا گیا؟ ہم کسی کو ذمہ دار ٹھہرائیں یا نہ ٹھہرائیں، لیکن تاریخ ان لوگوں کا تذکرہ ضرور کرے گی جنہوں نے مواقع حاصل ہوتے ہوئے بھی نہ صرف سانحہ مشرقی پاکستان کا قرض چکانے سے گریز کیا بلکہ اب تو پہلی مرتبہ ملکی میڈیا کے دو درجن سے زائد اہم افراد کے سامنے اپنی بزدلی کے ساتھ ایسے شرمناک انکشاف کئے کہ لکھتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی کالی بھیڑوں نے دانستہ طور پر ملک کے کمزور سیاسی نظام کو اپنے ذاتی مفاد اور مقاصد کیلئے استعمال کرتے ہوئے کھلم کھلا اپنی آئینی ذمہ داریوں سے انحراف کرتے ہوئے سیاسی کٹھ پتلیوں سے وہ خوفناک کام لئے جس کے باعث آج ملک کمزور ترین معاشی سرحدوں کو چھو رہا ہے اور مودی جیسا مکار دشمن اپنے غیر ملکیوں دوستوں کے ساتھ مل کر آج بھی ملک میں انہی سازشوں پر عمل پیرا ہے جس کو مکار ہندو نے مشرقی پاکستان میں استعمال کیا تھا۔ یہ بات ذہن نشیں رہے کہ 1971 کے انتخابات میں انتخابات کو تسلیم نہ کرنے کے خوفناک نتائج نے ہمارے ملک کو دولخت کر دیا تھا اور اب ایک مرتبہ پھر انتخابات متنازعہ بنانے کیلئے وہی اسرائیل اور امریکا) اپنی سازشوں میں مصروف ہیں جس کو ناکام بنانے کیلئے ہم سب کو کھلی آنکھوں سے اس کو ٹرائیکا (بھارت، کا مقابلہ کرنا ہو گا۔

حذر کرو مرے تن سے یہ سم کا دریا ہے
حذر کرو کہ مرا دل لہو کا پیاسا ہے

بروز سوموار 29 جمادی الاوّل 1445ھ 11 دسمبر 2023ء

شاہی فرمان اور کورا کاغذ

کل ہی پتہ چلا کہ کہ اندر کھاتے یہ ہدایات اور شاہی فرمان جاری ہو گیا ہے کہ اب لب بند، قلم بند، زباں بند... اس کے بعد جاری مہیب سناٹا، خاموشی، اضطراب اور بے کلی کے سوا کیا بچا ہے؟ پوری رات یوں ہی گزر گئی۔ پھر سناٹے، خاموشی اور اضطراب کو توڑتی ہوئی ایک آواز بلند ہوئی۔ رب کی برتری ، عظمت اور جلال کی آواز..... خانۂ خدا کے بلند میناروں سے گونجتی ہوئی، جسے کوئی نہیں روک سکتا... ہاں کوئی بھی نہیں۔ رب ذوالجلال کی کبریائی بیان کرتی ہوئی آواز، زمینی خداؤں کے منہ پر خاک مل دینے والی آواز، خود ساختہ دیوتاؤں کو لرزا دینے والی آواز، انسانیت کیلئے نویدِ مسرت... حوصلہ اور امید کا نقارہ، نقارہ خداوندی... سربلند و باوقار جلال اور جمال... سربلند باد دوستانِ دیں کی نوید۔

ہم بھی عجیب ہیں۔ وہ پکارتا ہے: آؤ تم فلاح چاہتے ہو ناں۔ تو آؤ۔ اور ہم کیا کرتے ہیں؟ زمینی خداؤں کے آگے بھکاری بن کر کھڑے رہتے ہیں اور دھتکار دیے جاتے ہیں، دھتکارے ہوئے لوگ... اور جب ہر طرف سے، ہر در سے محروم و نامراد لوٹتے ہیں، تب وہ ہمیں یاد آتا ہے۔ ہاں وہ پھر بھی ہمیں گلے لگاتا ہے۔ پیغامِ مسرت سناتا ہے، اصل کی طرف بلاتا ہے۔ بس وہی ہے اور ہے کون؟ ہم گداگر اور بھکاری بن گئے ہیں۔ ہم فقیر کہاں ہیں! فقر کی تو شان ہی نرالی ہے۔ وہ میر اجواں مرگ دوست یاد آ گیا۔ اس نے کیا خوب کہا تھا: ہم کہاں ایک ہی بابِ طلب تک رہتے ہیں! بے شمار و لاتعداد دروں کے محتاج ہو گئے ہیں اور وہ پھر بھی ہماری بے وفائی، ہماری غلطیوں، ہماری سیہ کاریوں، ہماری بداعمالیوں، منافقتوں اور ہمارے کھوٹ کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ آؤ فلاح کی طرف... بس یہی درِ خالص ہے، باقی سب جھوٹ ہے، مکر ہے، فریب ہے۔ مکر و فریب کی سہانی دنیا... بے چینی کا سرچشمہ۔ رات بھر آنکھوں میں کاٹنے کے بعد علی الصبح جب بہت بے کلی بڑھی تب بابا جی اقبال یاد آنے لگے:

صد نالۂ شب گیرے، صد صبح بلا خیزے
صد آہ شرر ریزے، یک شعر دل آویزے
در عشق و ہوس ناکی، دانی کی تفاوت چیست؟
آں تیشۂ فرہادے، ایں حیلۂ پرویزے

(رات بھر کے سینکڑوں نالے، سینکڑوں آفت لانے والی صبحیں، سینکڑوں شعلے پھینکنے والی آہیں ایک طرف اور ایک دل کو لبھانے والا شعر ایک طرف۔ کیا تو جانتا ہے کہ عشق اور ہوس میں کیا فرق ہے؟ عشق فرہاد کا تیشہ ہے اور ہوس خسرو پرویز کا حیلہ، مکاری اور فریب ہے۔)

واصف علی واصف کا کیا خوب قول یاد آ گیا "ہم سب فرعون کی زندگی اور موسیٰ کی عاقبت چاہتے ہیں۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا"۔ اور پھر تو تانتا بندھ گیا۔ یہ جو زمینی خدا بن بیٹھے ہیں، اور وہ جو گزر گئے، اب تماش بینوں کیلئے سامانِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔ اس سے بھی سبق حاصل نہیں کرتے۔ اندھے، بہرے ، خود فریبی کا شکار فرعونِ زمانہ... یہ سمجھتے ہیں ہم ہیں پالن ہار۔ بس ہم۔ عجیب سی بات ہے۔ یہ لبرل، سیکولر اور روشن خیالی کے دعویدار... اور وہ بھی اصل نہیں بالکل جعلی۔ اصل تو ہر بات اچھی لگتی ہے ناں۔ ٹھیک ہے اختلاف اپنی جگہ، اصل تو ہو ناں۔ سراسر جعل سازی کے ماہر۔ منافقت کے مجسم شاہکار خود فریب۔ یہ سمجھتے ہیں نظامِ کائنات یہ خود فریب چلا رہے ہیں۔ عقل و فکر کے اندھے، انسانیت کے نام پر دھبہ۔

ایوان اقتدار میں سستانے والوں کو یہ خبر ہو کہ سیاست ٹھہرے ہوئے پانی کا نہیں بلکہ اس کی روانی کا نام ہے۔ اپنی عقل و فراست کے ساتھ اس کے بند مضبوط بنانے کی ضرورت ہے ورنہ اس روانی کو بند کرنے میں کسی قسم کی مروت کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔ اوپر کی سطح پر تبدیلیاں ہی تبدیلیاں اور نیچے ؟ کیا اب بھی وہی ہم اور وہی غم ہوں گے۔ چہرے بدلنے سے کبھی مقدر نہیں بدلتے۔ تبدیلی کا عمل جب تک نچلی سطح تک نہیں جائے گا، عوام کے احساسات و جذبات اسی طرح سلگتے رہیں گے۔ مہنگائی، لوڈ شیڈنگ اور آئے دن ایک دوسرے پر کرپشن، بدانتظامی اور دیگر الزامات کے ذکر پر انہیں ڈرائیں اور دوڑائیں نہ، وہ تو پہلے ہی بہت ڈرے ہوئے اور تھکے ہوئے ہیں۔ حالات و واقعات نے انہیں اس قدر پکی بنا دیا ہے کہ سوئی کی آواز بھی انہیں کسی دھماکے سے کم نہیں لگتی ۔ رہی سہی کسر اب اس نئی ڈاکٹرائن نے نکال دی ہے کہ پھر سے نئے لاڈلوں پر سیاسی سرمایہ کاری جبکہ درجنوں مرتبہ ہم ان سب کو آزما چکے ہیں۔

اس کیلئے موجودہ سرکار کو عوام کیلئے اللہ سے "کاروبار" کرنا ہو گا پھر کہیں جا کر ان کا بازار چلے گا۔ ان کی مسکراہٹ سے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں ۔ مسکراتے ہوئے چہروں کے دل بہت اداس ہوتے ہیں، ان کے تو خواب بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتے۔ ہر رات کو شب برات سمجھنے والوں کو یادوں کی بارات کا کیا پتہ، انہیں اس کا پہلے سے اندازہ ہو جائے تو وہ آنکھ بند کرنے سے ہی توبہ کر لیں۔ بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں مگر ان کے ضمیر سو رہے ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جاتی ہیں مگر ان کی تعبیر جاگتی رہتی ہے۔ بہت سے خواتین و حضرات کو آنکھوں کی "چہل قدمی" کا بڑا شوق ہوتا ہے، انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ آنکھیں بھٹک جائیں یا کہیں اٹک جائیں۔ اسی شوق چشم میں وہ بہت سے روگ بھی لگا جاتے ہیں۔ دوسروں کے گھروں میں "نظر اندازی" کرنے والوں کو اپنی چادر و چار دیواری کے اندر بھی دیکھنا چاہئے کہ اس تاک جھانک سے دل پر کیا گزرتی ہے۔ من کا ویسے بھی دھن سے کیا رشتہ ہے، اسی لئے کہتے ہیں کہ دل نہ بھریں، یہ بھر گیا تو بہت سے سیلاب جسم کو ڈبو دیں گے۔ سیاست میں یہی سیلاب سونامی بن جاتے ہیں۔

پیارے پاکستان میں بہت سے سیاستدان اقتدار کے بغیر نہیں رہ سکتے اور اسلام آباد ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہماری بربادی میں ان لوگوں کی آبادی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ ارض وطن کی معاشی بدحالی اور سیاسی انتشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئی بیرونی دباؤ کی وجہ سے استعمار سے جلد دوستی کی بیماری اب وبا کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ جب تک ان تمام افراد کو انصاف کے کٹہرے میں لا کر کھڑا نہیں کریں گے جنہوں نے ہمیں اس حال تک پہنچایا ہے، مسئلہ حل نہیں ہو گا، اس کیلئے چاہے جتنے مرضی الفاظ جمع کر لیں، "کاغذ کورا" ہی رہے گا۔ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت صرف ایک بار ہوتی ہے اور اس کے بعد سمجھوتے ہی چلتے ہیں، جب تک جان ہے، جہان داری تو نبھانی ہی پڑے گی، جس میں ہار جیت چلتی رہتی ہے۔ جیتنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قوم دکھوں سے ہار رہی ہے اور آپ مخالفین کو قابو کرنے کی تعریفیں سن کر نہال ہو رہے ہیں۔ آئے دن بھوک کے ہاتھوں دلبرداشتہ ماں اپنے معصوم بچوں سمیت خود کو ٹرین سے کٹوا کر ہمارے سسٹم کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے، ہمارے ہاں زندہ لوگوں کا حساب نہیں لیا جاتا تو مرے ہوئے کس کھاتے میں آئیں گے۔ امیر شہر کا تو اپنا یہ حال ہے۔

امیر شہر غریبوں کا خیال کیا کرتا
امیر شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

ہوش میں آؤ۔ تمہارے فرمان تمہیں نہیں بچاسکتے۔ کبھی نہیں! سربلند رہے گا سدا میرے رب کا فرمان۔ ہاں اصل فرمان۔ تمہیں شوق چڑ آیا ہے تو پوری کرلو اپنی حسرت... جانا تو ہم سب کو ایک ہی جگہ ہے۔ پھر تم اپنی کرنی کر گزرو۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ جو چاہے کرو، بس یاد رکھنا تم خالق و مالک نہیں ہو۔ بن ہی نہیں سکتے۔ کبھی نہیں۔ باب علم جناب علی کرم اللہ وجہہ کے قول کو ہم کیوں بھول رہے ہیں کہ "لوگوں پر ایک زمانہ آنے والا ہے جب صدقہ کو خسارہ، رحم کرنے کو احسان اور عبادت کو ایک دوسرے پر برتری اور سبقت کا ذریعہ قرار دیا جائے گا۔ ایسے وقت میں حکومت عورتوں کے مشورے، بچوں کے اقتدار اور خواجہ سراؤں کی تدبیر کے سہارے رہ جائے گی"۔

بس نام رہے گا اللہ کا۔

بروز بدھ یکم جمادی الثانی 1445ھ 13 دسمبر 2023ء

سیاست میں کس کا سکہ معتبر؟

اگلے عام انتخابات کیلئے جو قومی آپشن سامنے آرہے ہیں، ایک حالیہ تحقیق کے مطابق ان میں سے 2 کی قیادت وہ "رہنما" کر رہے ہیں جنہیں بالترتیب پاکستان کا پہلا اور دوسرا امیر ترین شخص سمجھا جاتا ہے۔ اپنی بیرونِ ملک موجود پوشیدہ دولت کے ساتھ یہ دونوں ڈالروں میں ارب پتی ہیں۔ تیسرے آپشن کا نمائندہ وہ رہنما ہے جو امیر ترین ہونے کے قریب بھی نہیں بلکہ خود ہماری سپریم کورٹ نے "سراج الحق" کا نام لیکر کہا تھا کہ پھر یہی صادق اور امین بچتا ہے لیکن اس بیان کے بعد ان کے دیگر ساتھیوں نے جس کو امین اور صادق کا سرٹیفکیٹ عطا کیا تھا، آج اسی عدلیہ کے سامنے نہ صرف اس کی کارکردگی پر 75 سے زائد مقدمات زیر سماعت ہیں بلکہ اسی عدلیہ نے اسے اڈیالہ جیل میں بھیج کر اسے آئندہ انتخابات کیلئے نااہل بھی کر دیا ہے گویا عدلیہ نے اپنے ہی فیصلے کے خلاف فیصلہ دیکر کیا نظیر قائم کی ہے، وہ بھی ہم سب کے سامنے ہے۔

ادھر قوم کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ انہیں یہ قابلِ قبول نہیں ہے کہ ملک کیو بیدردی سے لوٹنے والے یہ دو امیر ترین شخص اس ملک کی قیادت کریں جو بظاہر اب ایک دوسرے کی نہ صرف ٹانگیں کھینچ رہے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے کپڑے تار تار کرنے میں مصروف ہیں، جس کے عوام کو غریب اور جاہل رکھ کر ان سے منافع کمایا گیا ہے۔ ان کی زبردست ذاتی دولت اعلیٰ ترین عوامی عہدوں پر رہتے ہوئے بنی۔ ان تینوں کے علاوہ 3 دیگر ووٹنگ آپشن بھی ہیں: ووٹ نہ ڈالیں: صرف مستحق آزاد امیدواروں کو ووٹ دیں یا ان میں سے کوئی بھی نہیں پر نشان لگائیں۔ یہ ووٹنگ آپشن ضرور ہونا چاہیے۔ اس پر نشان لگانے والے ایک واضح سیاسی مؤقف کا اظہار کریں گے کہ وہ کسی کو بھی اپنے ووٹ کا حقدار نہیں سمجھتے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں چل رہے سیاسی ڈرامے میں فی الوقت کوئی بھی اچھا نہیں ہے، سوائے ظلم و ستم کے شکار عوام کے۔ ہیروز کی بات کی جائے تو ان کی اتنی قلت ہے کہ انہیں بنانا پڑتا ہے۔ نایاب، اصلی ہیروز وہ موتی ہیں جو لوگوں کو متاثر کرتے ہیں، امید فراہم کرتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا چہرہ ہوتے ہیں۔ انہیں شدید اور مسلسل نفرت اور بدکلامیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستانی سیاست قابلِ رحم حالت سے گزر رہی ہے، جس میں صرف مشکوک اور بدنام سیاستدانوں کی بیان بازیاں ہیں، مسائل پر معقول اور دیانتدار بحث کے بجائے الزامات اور گالیاں دی جاتی ہیں، پارلیمنٹ غیر فعال ہے، طاقت کے مراکز سے چمٹا رہا جاتا ہے، تفریقی، انتہاپسند اور خصوصی مفادات کی پالیسیوں کے لیے مذہب کا استعمال کیا جاتا ہے، جہالت کو علم قرار دیا جاتا ہے، ناقابلِ فہم کرپشن اور دھوکا دہی موجود ہے، الیکشن صرف مشکلات کے شکار لوگوں کے لیے تفریح ہیں، گمشدگیاں، تشدد اور لاشیں، جھوٹ، بدترین جھوٹ اور اعداد و شمار، اور اشرافیہ کے دلوں میں خوف کہ کہیں عام پاکستانی اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے نہ ہوں۔

وہ لوگ جن پر تحفظ کی ذمہ داری ہے، وہ بچوں، عورتوں اور اقلیتوں کو غیرت اور مذہب کے نام پر قتل کرنے والوں، انتہاپسندوں اور ریپ کرنے والوں سے بچانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ نہ ہی انہوں نے امداد دینے والے ممالک کے ملکی خودمختاری کے خلاف مطالبوں سے پاکستان کے خود مختار مفادات کا تحفظ کیا ہے۔ اس دوران میڈیا کو بھی اپنی اوقات میں رہنے کا کہہ دیا گیا ہے۔ ان بنیادوں پر جمہوریت قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ کوشش ہی مشکوک ہو گی۔ اشاروں یا اشاروں کے بغیر دہشت گرد فیصلہ کرتے ہیں کہ کون بحفاظت مہم چلا سکتا ہے اور کون نہیں۔ 2013 میں جو آپشن ہمیں دستیاب تھے، آج بھی تقریباً وہی ہیں۔ مگر حالات بدل چکے ہیں اور ترجیحات بھی تبدیل ہو چکی ہوں گی۔ مگر سب سے بہترین راستہ اب بھی تبدیل نہیں

ہوا ہے۔ یعنی وہ بنیادی سطح کی تحریکیں جو پاکستان کے غریبوں، استحصال کی شکار اور محروم اکثریت کی ترجیحات کو فروغ دینے کی تحریکیں ہیں۔ دعوؤں کے باوجود یہ بات یقینی نہیں کہ کوئی بھی سیاسی جماعت خود کو ایسی تحریک کی معتبر نمائندہ قرار دے سکتی ہے۔

اشرافیہ کی ترجیحات مسلط کرنے کے لیے اشرافیہ کی مداخلت نے ملک کی سیاسی اور اقتصادی ترقی کو تہہ وبالا کر دیا ہے۔ اس طرح کی مداخلتوں نے جمہوری فقدان بڑھایا ہے، احساسِ عدم تحفظ کو مزید گہرا کیا ہے اور ملک کو بے فائدہ کاموں میں الجھا دیا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے۔ کچھ قیمتی لوگوں کے علاوہ ہمارے زیادہ تر چیمپئنز اس حقیقت کے ہاتھوں شکست کھا چکے ہیں۔ نسبتاً ایماندار غیر ارب پتی رہنما کے پاس بظاہر انتخابات جیتنے کا سب سے بہترین موقع ہے بھلے ہی ان کی مقبولیت میں مبینہ طور پر کمی آ رہی ہے، خاص طور پر پڑھی لکھی نوجوان مڈل کلاس میں۔ جیت سے اس لیڈر کو نئے امکانات کے دروازے کھولنے کا موقع ملے گا۔ یہ آسان کام نہیں ہو گا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر بے چہرہ فیصلہ سازوں کا اثر ہے۔ یہ فیصلہ ساز انہیں اسکرپٹ سے ہٹنے نہیں دیں گے۔ وہ انہیں دور نکل جانے سے روکنے کے لیے اتحاد اور دیگر حکمتِ عملیاں استعمال کریں گے۔ اس سے جلد یا بدیر، وہ توقعات ٹوٹیں گی، جو لوگ ان سے وابستہ کر بیٹھے ہیں۔ اس دوران اگلی دہائی میں رونما ہونے والے ممکنہ حالات اپنی تمام تر مشکلات کے ساتھ ہمارے سر پر ہتھوڑے برسانے کی مکمل تیاری کے ساتھ آن دھمکے گا اور ہمارے پاس وہاں تک ٹھیک حالت میں پہنچنے کے لیے کوئی قومی توانائی بھی نہیں ہو گی۔ اگر ایسی سیاست ہو تو آپ کو دشمنوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟

ان حالات میں جمہوریت کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ جمہوریت کے حامیوں کے درمیان راستے اور مقصد کے بارے میں اختلافات موجود ہیں۔ جمہوریت کا مقصد راستے پر منحصر ہے مگر یہ خود ایک راستہ نہیں ہے۔ جمہوریت ایک سیاسی حالت ہے جبکہ اس تک پہنچنے کا راستہ ایک سیاسی تحریک ہے۔ جمہوریت اچھی حکمرانی اور تمام طبقات کو ساتھ لے کر چلنے والے سیاسی مرحلوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح کی تحریکوں کے بغیر جمہوریت کی کوششیں اور انتخابات صرف جمہوریت کو درپیش مشکلات میں سے ایک کا انتخاب کرنے کے برابر ہیں۔ یہ کوئی "سیکھنے کا عمل" نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ ایک دھوکا ہے جو ہمیں ٹھوس ترقی اور مستحکم جمہوریت کی جانب جانے سے روکتا ہے۔

روایتی معاشروں میں جدید جمہوریت بعد میں آتی ہے، اور اس سے پہلے کثیر السطحی جدوجہد اور انسانی ترقی کے ذریعے سماجی و سیاسی تبدیلیاں آتی ہیں۔ پڑوسی ملک جزوی طور پر مستثنیٰ ہو سکتا ہے، مگر زیادہ امکان ہے کہ نہیں۔ فوری ترقی ایک ٹیکنالوجیکل مرحلہ ہے، یہ سیاسی اور سماجی مرحلوں کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ آپ ایک ہدایت نامہ یا بلیو پرنٹ چرا سکتے ہیں مگر سیاسی تجربہ، سماجی تاریخ اور دانا قیادت نہیں چرا سکتے۔ سماجی و سیاسی جدوجہد کے بغیر ٹیکنالوجیکل ترقی صرف معاشی ناہمواریوں اور سماجی تفریق کو بڑھاتی ہے۔

اسی طرح سے جمہوریت کی نقل کرنا اور انتخابات کا پردہ فراہم کرنے سے سیاسی نظام نہیں فروغ پا سکتا اور عوام کو طویل عرصے سے گھیری ہوئی محرومیوں کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ انتخابی اونچ نیچ کے باوجود اس طرح کے انتخابات صرف موجودہ استحصالی نظام کو مضبوط کرتے ہیں، جس سے پاکستان سیاسی طور پر ناخوشگوار ملک بن چکا ہے۔ کمزور ریاستوں کو اس طرح کے سچ سے نفرت ہوتی ہے۔ جمہوریت چاہے جھوٹی ہو یا نہیں، ان کے لیے مقدس گائے ہی سمجھی جاتی ہے۔

"مگرلی کوان یو" کے مطابق جمہوریت رولز رائس گاڑی کی طرح ہے۔ اگر آپ اس کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں تو یہ سڑک پر موجود سب سے بہترین گاڑی ہے۔ ورنہ یہ بدترین سرمایہ کاری ہے۔ پاکستان کے جمہوری رہنما اپنی رولز رائس چلاتے ہیں جبکہ عوام ٹول ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ سیاسی گہما گہمی چاہے جتنی بھی ہو، مگر پاکستان میں انتخابات کا تب تک کوئی مطلب نہیں جب تک کہ وہ ان تحریکوں کے ساتھ مجتمع نہیں ہو جاتے جو انتخابات ہوتے ہی ختم نہ ہو جائیں۔ یاد رکھیں! ہمارے ہاں انتخابات صرف اعلیٰ عہدوں کے لیے ہوتے ہیں۔ تحریکیں پاکستان کیلئے ہوتی ہیں۔

اب وقت گیا ہے کہ ایمانداری کے ساتھ یہ تاثر دور کرنا ہو گا کہ پاکستانی سیاست میں اسی کا سکہ معتبر ہوتا ہے جس پر اسٹیبلشمنٹ کی مہر لگی ہو۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہر گلی محلے کے چوک میں نئے لاڈلے کا نام گونج رہا ہے جبکہ اس سے پہلے کا لاڈلا محبت کا قرض بمعہ سود ادا کرنے کیلئے اب بھی بے تاب ہے اور نیا لاڈلا جس نے اس سے پہلے کئی مرتبہ اپنے اقتدار کو داؤ پر لگانے کے باوجود کھلم کھلا گوجرانوالہ کے جلسے میں بھرپور تنقید کا نیا راستہ کھولا، جس کے بعد مسلسل "مجھے کیوں نکالا" کا نعرہ لگا کر ہمدردیاں سمیٹنے کی کوششوں میں آج تک مصروف ہے۔ ملک واپسی سے قبل ایک ایسا بیان داغ دیا کہ چھوٹا بھائی جو دو دن قبل ہی ہاتھ جوڑ کر واپس لوٹا تھا، فوری بھاگم بھاگ پاؤں میں پڑ کر سیز فائر کروانے پہنچ گیا جس کے بعد ہی واپسی ممکن ہو سکی لیکن اب ایک عجیب مخمصے میں مبتلا جہاں اقتدار کی غلام گردشوں کے حصول کیلئے دیگر جماعتوں کے ساتھ انتخابی اتحاد کئے جا رہے ہیں، وہاں "لاڈلے" کے شور نے عزتِ سادات کے پرزے پرزے بیچ چوراہے میں اڑا کر رکھ دیئے ہیں۔

ابھی ملک واپسی کو چند ہفتے گزرے ہیں کہ عدالتوں نے قبل از گرفتاری ضمانت کے ساتھ مقدمات کی تیزی سے سماعت بھی شروع کر دی اور مقدمات سے بری بھی کرنے کے احکام جاری ہونے شروع ہو گئے ہیں تاکہ آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کی راہیں ہموار کی جا سکیں اور جس کے لئے دکھائی دینے والے پرتپاک پروٹوکول کے ساتھ سیاسی میدان بھی کھلا ملنا شروع ہو گیا ہے۔ ان حالات میں "لاڈلے" کے نعرے کا تاثر ختم کرنے اور ممکنہ بدنامی کہ مہیب سائے سے بچنے کیلئے اپنے پرانے مؤقف کو بار بار دہرا کر نکالنے والوں کے احتساب کا نعرہ بلند کرنا شروع کر دیا ہے تاکہ عوام کو ایک مرتبہ پھر گمراہ کیا جا سکے۔ جولائی 2018ء میں پاکستانی عدالت نے انہیں لندن کے مہنگے ترین علاقے "پارک لین" میں 4/اپارٹمنٹس کی خریداری کیلئے منی ٹریل مہیا نہ کرنے کے جرم میں دس سال کی سزا سنائی تھی۔ شریف خاندان پر الزام تھا کہ انہوں نے ان جائیدادوں کو غیر قانونی طور پر منتقل کی گئی منی لانڈرنگ سے خریدا ہے۔ ان کی بیٹی مریم نواز کو بھی اس جرم میں معاونت کرنے پر 7 سال کی سزا سنائی گئی تھی جس کو کچھ عرصہ قبل ختم کیا جا چکا ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس مقدمے کو تیار کرنے والی نیب نے عدالت کے سامنے یہ اعتراف کیا کہ وہ اپنے مقدمے کو نہ صرف واپس لے رہی ہے بلکہ وہ مقدمہ میں تمام الزامات ثابت کرنے میں بھی ناکام رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی نیب نے "فلیگ شپ انویسٹمنٹ" ریفرنس بھی دائر اپیل بھی واپس لے لی ہے۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے جب نیب کے وکیل بڑے دھواں دھار دلائل کے ساتھ ایون فیلڈ اور مے فیئر کے چار فلیٹس کو میاں نواز شریف کی کرپشن سے لوٹی ہوئی ملکی دولت سے بنائی ہوئی جائداد ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور آج وہی نیب اپنے ان تمام الزامات کو واپس لیکر مکمل خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ جب سپریم کورٹ نے نیب کے پراسیکیوٹر سے الزامات کے بارے میں استفسار کیا تو نیب کے پراسیکیوٹر نے 360 ڈگری کا "یوٹرن" لیتے ہوئے سارا ملبہ سپریم کورٹ پر ڈال دیا کہ نیب تو یہ مقدمہ دائر

کرنے کے حق میں نہیں تھی بلکہ اس وقت کی سپریم کورٹ کے کہنے پر یہ مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ اس سے قبل اسلام آباد ہائی کورٹ نے میاں صاحب کے سمدھی اور سابقہ وزیر خزانہ اسحاق ڈار کے خلاف آمدنی سے زائد اثاثوں کے مقدمے کو خارج کرتے ہوئے ان کے تمام اثاثوں کو بحال کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ سابقہ وزیر ریلوے خوجہ سعد رفیق اور ان کے بھائی وزیر صحت پنجاب خواجہ سلمان کے خلاف 2018ء میں پیراگون ہاؤسنگ سوسائٹی میں بے ضابطگیوں کا ریفرنس 11 اکتوبر 2023ء کو خارج کر کے ان کو بے گناہ قرار دیتے ہوئے باعزت بری کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ سابق وزیر داخلہ رانا ثناء اللہ جن کو یکم جولائی 2019ء میں 15 کلوگرام ہیروئن جیسی خطرناک منشیات کی اسمگلنگ میں گرفتار کیا تھا، اینٹی نارکوٹکس کی طرف سے ان کی ضمانت منسوخی کی اپیل کو اگست 2023ء کو غیر مؤثر قرار دیتے ہوئے ان کی ضمانت کو برقرار رکھا ہے، سماعت کے دوران اے این ایف کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر امتیاز احمد اور انسپکٹر احسان اعظم نے رانا ثناءاللہ کے خلاف الزامات کو غلط قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔

یاد رہے کہ اینٹی نارکوٹکس پاکستانی فوج اور وزارت انسداد منشیات (پاکستان) کی چھتری تلے کام کرتی ہے۔ رانا ثناءاللہ کے خلاف اے این ایف کی تاریخ کا یہ اس لحاظ سے بھی ایک انوکھا مقدمہ ہے کہ اس میں مدعی ایک حاضر سروس فوجی افسر میجر عزیز اللہ تھے اور رانا ثناء اللہ کی گرفتاری کے موقع پر اس وقت کی حکومت پی ٹی آئی کے وزیر داخلہ شہریار آفریدی نے پارلیمنٹ اور میڈیا کے سامنے کلمہ پڑھتے ہوئے اور قرآن پر حلف دیتے ہوئے اس مقدمے کی سچائی کی شہادت دی تھی۔ اسی طرح فیڈرل کورٹ نے مسلم لیگ کے قومی اسمبلی کے رکن حنیف عباسی کو جون 2023ء کو ایفیڈرین کی غیر واضح تعریف کی بناء پر کالعدم قرار دے دیا اور ان پر یہ مقدمہ 2018ء میں دائر ہوا تھا۔ پچھلے چند ہفتوں سے نواز شریف اور ان کی جماعت کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ اچانک نرمی کا سلوک آخر کیا چغلی کھا رہا ہے، یہ کوئی نہ بھی بتائے تو سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے ہوا کا رخ جان چکے ہیں۔

ہماری قابل احترام عدلیہ نے آخر ان مقدمات کے نتیجے میں ملک کو ہونے والے سیاسی، معاشی ساری بربادی کے ذمہ داروں کے خلاف مقدمات دائر کرنے کا حکم کیوں جاری نہیں کیا؟ قومی خزانے سے کروڑوں روپے کے اخراجات کی ذمہ داری کس پر عائد ہونی چاہئے؟ مسلم لیگ ن کے تمام رہنماء اپنی تقاریر میں تواتر سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو انتخابات میں حصہ لینے کیلئے برابری کے مواقع ملنے ضروری ہیں تاکہ آئندہ انتخابات کے منصفانہ نتائج پر کوئی اعتراض نہ کر سکے تو پھر قوم کو ایسا نظر کیوں نہیں آرہا؟ یہ مبنی بر حقیقت تلخ سوال آپ سب کیلئے چھوڑ کر جا رہا ہوں!

بروز جمعرات 2 جمادی الثانی 1445ھ 14 دسمبر 2023ء

پائے رسول ﷺ کے نقوش

ہر سال 16 دسمبر ہی اپنی دلخراش یادوں سے ہم دل جلوں کو اشکبار کرنے کیلئے کیا کم تھا کہ ایک اور قیامت صغریٰ نے بھی اس میں اپنا ایسا حصہ ڈال دیا ہے کہ زندگی بھر اس درد کی ٹیسیں ہمیں یاد دلاتی رہیں گی کہ پھولوں کے شہر پشاور میں 132 پھولوں کو مسل کر رکھ دیا گیا، وہ جو اپنے ہاتھوں میں قلم اور کتاب تھامے اپنی نبی ﷺ کے احکام کی تعمیل میں علم حاصل کر رہے تھے، ان کو اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ اپنی ماں سے یہ کہہ سکیں کہ دیکھ ماں! میرے لباس پر اس سرخ روشنائی ہم سب کی عقبیٰ و آخرت کی نجات کا وسیلہ بن گئی ہے۔ میں یہ دن کیسے بھلا دوں جب پشاور کی سڑکوں پر اچانک چیختی چنگھاڑتی سائرن بجاتی ایمبولنسوں کا اژدہام جہاں قیامت صغریٰ کا سماں پیش کر رہا تھا وہاں پوری قوم غم واندوہ اور شدید صدمے اور سکتے کی حالت میں گم سم اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر اپنے رب سے رحم و کرم کی فریاد کر رہے تھے۔ یہ دلدوز خبر سنتے ہی ننگے سر اور پاؤں ماں باپ اپنے پیاروں معصوموں کو دیوانوں کی طرح ڈھونڈنے کیلئے سڑکوں پر دوڑ رہے تھے کہ وہ آنے والی قیامت صغریٰ کو اپنے سینے پر روک کر اپنے بچوں کو بچالیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ قوم کے نونہال اس فانی دنیا سے دار بقاء کی طرف تشریف لے گئے ہیں، اس عارضی زندگی کی بہاروں اور گلوں کی خوشبوؤں سے منہ موڑ کر دائمی بہار، سدا خوشبوؤں و مہک کے گلستانوں میں براجمان ہو گئے ہیں اور اپنے ہر تعلق رکھنے والوں کو چھوڑ کر اپنے مولا کے ساتھ مضبوط تعلق کا رشتہ جوڑ چکے ہیں۔ موت تو کوئی نئی چیز نہیں، موت تو ہر ایک کو آنی ہے۔ موت کے قانون سے نہ تو کوئی نبی مستثنیٰ ہے نہ کوئی ولی، جو بھی آیا ہے اپنا مقررہ وقت پورا کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ موت زندگی کی سب سے بڑی محافظ ہے۔ ہم سب اس کی امانت ہیں پھر کس کی مجال جو اس میں خیانت کر سکے لیکن اس بھری معصومیت میں اس طرح حالتِ ایمان میں قربان ہو جانا اس کے حق میں بڑی نعمت ہے اور پھر کیوں نہ ہو، ایسی موت تو وصل حبیب اور بقائے حبیب کا خوبصورت سبب اور حسین ذریعہ ہے اور پھر بقائے حبیب سے بڑھ کر اور نعمت کیا ہو گی!

اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اسے یقیناً ایک دن جانا ہے اور اس دنیا میں آنا ہی درحقیقت جانے کی تمہید ہے مگر بعض جانے والے اپنے ماں باپ، لواحقین اور اہل وطن کیلئے دولت اور فخر وانبساط کی ایسی وراثت چھوڑ جاتے ہیں کہ جس کے آگے خزائن و حشم سے مالا مال شہنشاہ بھی سو فقیروں کے فقیر اور سو کنگالوں کے کنگال لگتے ہیں۔

ان معصوم شہداء نے بھی اپنے خونِ دل اور جان سے پائے رسول ﷺ کے نقوش کو ایسا اجاگر کیا ہے کہ ہر کسی کو اب اپنی منزل آسان دکھائی دے رہی ہے۔ ان نونہالوں کی للّٰہیت، اخلاص نیت اور بے لوث ادائے فرض نے ایک ہی جست میں تمام فاصلے عبور کر لئے ہیں جس کی تمنا انبیا، اصحابہ اور صالحین نے ہمیشہ کی۔ ان معصوم عظیم شہداء کا خون پاکستان کی ان بنیادوں میں جا کر اپنے آباؤ اجداد میں جا کر ضم ہو گیا ہے جنہوں نے اس ملک کو کلمہ کی بنیاد پر وجود میں لانے کیلئے اپنی جانیں قربان کی تھیں اور میرا وجدان، ایقان اور ایمان اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ ان کی قربانیاں اب تا قیامت تک کفر کے ان تاریک جزیروں پر ایمانی قوت کے ساتھ کڑکتی اور کوندتی رہے گی جنہوں نے یہ ناپاک منصوبہ تیار کیا۔

ان شہادتوں نے جہاں اور بے شمار باتوں کا سبق یاد دلایا ہے وہاں ایک یہ بات بھی ہمارے ذہن نشین کروائی ہے کہ عالمِ اسباب میں سانس کا ایک تموج اور ذرے کا ایک حقیر وجود بھی تخلیق اسباب اور ترتیب نتائج میں اپنا حصہ رکھتا ہے۔ جس طرح عمل بد کی ایک خراش بھی آئینہ ہستی کو دھندلا جاتی ہے

اسی طرح عمل خیر کا ایک لمحہ بھی عالم کے اجتماعی خیر کے ذخیرے میں بے پناہ اضافہ کر دیتا ہے اور لوحِ زمانہ میں ریکارڈ ہو کر کبھی نہ کبھی ضرور گونجتا ہے اور میزان نتائج میں اپنا وزن دکھاتا ہے اور یوں آخرت کو جب گروہ در گروہ اپنے رب کے ہاں حاضر ہوں گے تو یہ معصوم بھی شہداء کے گروہ میں شامل اپنے رب کے ہاں اس شان سے حاضر ہوں گے کہ تمام عالم ان پر رشک کرے گا۔

لیکن خدا سے ہم نے بھی ملاقات کرنی ہے، خدا جانے کب.....؟ خدا جانے کہاں...؟ اور کس حال میں ہوں گے؟ کتنی بڑی ملاقات ہو گی جب ایک عبد ذلیل اپنے معبود اکبر سے ملے گا! جب مخلوق دیکھے گی کہ خود اس کا خالقِ اکبر اس کے سامنے ہے، خدا کی قسم.....! کیسے خوش نصیب ہیں یہ نوجوان کہ جلوہ گاہ میں اس شان سے جائیں گے کہ اس ملاقات کے موقع پر خدا کو نذر کرنے کیلئے خدا کا کوئی انتہائی محبوب تحفہ ان کے کفن میں موجود ہو گا۔ جی ہاں! ان کفنوں کی جھولیوں میں جن میں بدن اور سچے ایمان و عمل کی لاش ہو گی مگر شہادت کے طمطراق تمغے سے سجی ہو گی۔ ان تمغوں کو خدائے برتر کی رحمت لپک لپک کر بوسے دے گی۔

کاش ہمیں بھی اس ملاقات اور یقینی ملاقات کا کوئی خیال آتا اور تڑپا دیتا، کاش ہم بھی ایسی موت سے ہمکنار ہو جائیں جہاں فانی جسم کے تمام جسم تمام اعضاء باری باری قربان ہو جائیں، سب خدا کیلئے کٹ جائیں، سب اسی کے پائے ناز پر نثار ہو جائیں جس کے دستِ خاص نے ان کو وجود کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یقیناً ان بچوں کے دھڑ شیطانی قوتوں کا شکار ہو گئے ہیں مگر اشک بار آنکھوں سے سو بار چومنے کے لائق ہیں کہ فرشتے ان کو اٹھا کر اللہ کے ہاں حاضر ہو گئے ہیں اور ان کی معصومیت اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ دنیا پر نہیں یہ آخرت پر نثار ہوئی ہیں گویا انہوں نے دنیا کی کسی چیز سے نہیں خود خدا سے عشق کیا، انہوں نے دنیا کی ساری اشیاء او عیش و عشرت پر نہیں خود رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک پر ایمان کی بنیاد رکھی ، اسی لئے انہیں دنیا کی نشیلی چھاؤں میں نہیں بلکہ شہادت کے پر شوق سائے میں پناہ مل گئی، اللہ نے انہیں زندگی کی دلفریب اور ایمان کی شاہکار شاہراہ پر اس طرح گامزن کیا ہے کہ زندگی سے ہٹ کر شہادت اور شہادت کے اس پار تک کچھ سوچنے کا کوئی موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ اپنے معصوم بچپن، شباب و حسن سے وجد کرتے ہوئے اللہ کے ہاں اس طرح حاضر ہو گئے ہیں کہ حسن و جوانی بار بار ایسی حسرت کرے!!!

وہ زندگی اور دنیا پر جھومنے کی بجائے سچائی اور آخرت پر مر جانے کی ایسی رسم ادا کر گئے کہ زمین و آسمان ان کی موت پر آنسو بہائیں لیکن خدا اپنے فرشتوں کی محفل میں خوش ہو کہ اس کے محبوب نبی ﷺ کی امت کے یہ بچے اور بڑے اس کی بارگاہ تک آن پہنچے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شہادت کے رتبے نے انہیں یہ پیغام دے دیا کہ ان کا گھر اس دنیا میں کہیں نہیں بلکہ اس دنیا میں ہے جو جسم و جاں کا تعلق ٹوٹتے ہی شروع ہوتی ہے۔ ایسی دنیا جہاں خود خدا اپنے بندوں کا منتظر ہے کہ کون ہے جو دنیا کے بدلے آخرت اور آخرت کے بدلے اپنی دنیا فروخت کر کے مجھ سے آن ملے۔ جہاں وہ جنت ہے جس کے گہرے اور ہلکے سبز باغات کی سرسراہٹوں اور شیر و شہد کی اٹھلاتی لہراتی ہوئی ندیوں کے کنارے خوف و غم کی پرچھائیوں سے دور ایک حسین ترین دائمی زندگی، سچے خوابوں کے جال بن رہی ہے۔ جہاں فرشتوں کے قلوب بھی اللہ کے ہاں پکار اٹھیں گے کہ خدایا.....! یہ ہیں وہ شہداء بچے! جن کی ساری دنیا تیرے عشق میں لٹ گئی ہے، یہ سب کچھ لٹا کر تیری دید کو پہنچے ہیں، شائد ان کے قلوب میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ راہِ حق میں مارا جانا ہی دراصل تجھ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور شہادت کے معنی ہی ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ یہ تو سب کچھ لٹا کر اس یقین تک پہنچے ہیں!

اور ہاں! کتنا قابل رشک ہے ان نوجوانوں کا یقیں اور ایمان، جن پر ملائکہ ایسی گواہی دیں گے اور کس قدر رونے کے لائق ہیں ہمارے ایمان جن کیلئے ہمارے دل بھی گواہی دیتے دیتے کسی خوف سے چپ ہو جاتے ہیں۔ کل جب میدان حشر میں اشک ولہو میں نہائے ہوئے یہ بچے خداوندی لطف واعزاز سے سرفراز کئے جارہے ہوں گے، خدا جانے ہم کہاں اور کس حال میں ہوں گے.....! آیئے ہم بھی آج اپنی اولاد کے قلب وذہن میں عمل خیر کا ایسا بیج بو دیں تاکہ اس بیج پر مشیت کی برسائی ہوئی برسات سے ایسی عمل خیر کی لہلہاتی ہوئی کھیتی اگ جائے کہ جب اس فصل کی تقسیم شروع ہو تو سب کو اپنا دامن تنگ نظر آئے لیکن اسے کیا کہیں کہ دشمن نے اس دردناک سانحے کیلئے بھی اسی تاریخ کا انتخاب کیا جب 52 سال پہلے اس نے ملک کو دولخت کیا تھا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ کیا اب وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے ملک میں ہر شہری کیلئے فوجی تربیت لازمی کر دیں تاکہ ہم اپنی افواج کے دست وبازو بن کر ملک کی طرف دیکھنے والی ہر ناپاک آنکھ کو پھوڑ دیں۔

بروز ہفتہ 4 جمادی الثانی 1445ھ 16 دسمبر 2023ء

سنہری کلغیوں والے مرغانِ چمن

ماضی قریب میں ہمہ مقتدر شخصیات کے چند ہونہار، نونہال آج نہ صرف ارب پتی ہیں بلکہ کھلے بندوں اپنی بیش بہا دولت کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کتنے ہی اعلیٰ عہدوں پر فائز سرکاری افسر، سیاستدان اور ٹیکنوکریٹ بیرونی ممالک میں دادِ عیش دے رہے ہیں حالانکہ ان میں سے کئی ایک کے خلاف بھاری رشوت اور سنگین بدعنوانی کے مقدمات زیرِ التوا تھے جن کی پہلے این آر او کے تحت گلو خلاصی ہوئی اور باقی ماندہ کے مقدمات کی تیزی سے نہ صرف سماعت ہو رہی ہے بلکہ انہیں باعزت بری کرے قوم کے سامنے سرخروئی کا میڈل پہنایا جا رہا ہے۔ انہی افراد میں چند ایک مقدر کے سکندر ایسے بھی ہیں جو دوبارہ مملکتِ خداداد کی قسمت کے مالک بن گئے اور اپنے دورِ اقتدا میں سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سوئٹزرلینڈ کی عدالتوں میں اپنے خلاف چلنے والے تمام مقدمات کو بند کرنے کے احکام کے ساتھ وہ فائلیں بمعہ ثبوت و شواہد جن پر مملکت نے کروڑوں روپے صرف کئے تھے، کو وصول کر کے ٹھکانے لگا دیئے گئے اور آج تک کسی کو ان مقدمات کے بارے میں نہ تو لب کشائی کی ہمت ہوئی اور نہ ہی میڈیا یا اور عدالت میں اس کا کبھی ذکر ہوا۔ بعد ازاں اس قوم کو یہ نوید بھی سنائی گئی کہ جلد ہی سوئٹزرلینڈ کے بینکوں سے مملکت خداداسے لوٹی ہوئی دو سو ارب ڈالر کی رقوم واپس لانے کا معاہدہ ہو گیا ہے لیکن یہ بہروپئے اس بات سے واقف ہیں کہ پاکستانی قوم کو نسیان کا مرض ہے، اس لئے "ڈھنگ ٹپاؤ اور مٹی پاؤ" کا فارمولہ پہلے بھی استعمال ہوتا رہا، اب بھی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

کچھ تو ایسے تھے جو مملکتِ خداداد پاکستان کے مالیاتی شعبے کے نگران بھی تھے اور پالیسی ساز بھی، جب تک ہوا کا رخ موافق رہا وہ سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔ ان کو اپنا اور ان مہربانوں کا مفاد، جن کے وہ ممنونِ احسان تھے، اس قدر عزیز تھا کہ ستم رسیدہ عوام کی بھلائی کا خیال تک بھلا بیٹھے، ملک تو کیا، آنے والی نسلوں تک کو گروی رکھتے گئے۔ اشرافیہ کو عیش و عشرت کی لت ڈال گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستان میں سادگی، کفائت شعاری اور خود کفالت کو رواج دیا۔ سنہرے مستقبل کیلئے وہ عارضی محرومیوں کو برداشت کرتے رہے۔ یہی روّیہ ہمارے عظیم دوست چین کے عظیم ترین انقلابی قائد ماؤزے تنگ اور چو این لائی نے اپنایا۔ وہ اور ان کے ساتھی سختیاں جھیلتے رہے، جن اصولوں پر قائدین خود کاربند ہوں، عوام کیلئے ان کو دل و جان سے قبول کرنا اور ان پر بخوشی عمل کرنا نہائت آسان ہو جاتا ہے۔ انقلاب کے بعد پہلی نسل کی قربانیاں رنگ لائیں اور چین اب دنیا کا عظیم ترین ملک بن گیا ہے۔

پچھلے چند برسوں میں ہمارے ہمسایہ ممالک باوجود اندرونی اور بیرونی مشکلات کے، اکیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں ہی وہ کہاں پہنچ گئے ہیں، پاکستان دولخت ہونے کے بعد بنگلہ دیش کو دیکھ لیں کہ وہ اقتصادی ترقی میں کہاں کھڑا ہے، اس کے پڑوس میں نیپال، بھوٹان اور دیگر ہمسایہ ممالک معاشی طور پر کہاں پہنچ گئے ہیں اور ہم.....ہاتھ میں کشکول لئے پھرتے ہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ سات دہائیوں سے امریکا کی بارگاہ میں سربسجود ہیں، جس کے منشی اور کارندے حکم چلاتے ہیں اور ہم بلاچوں چراں حکم بجالاتے ہیں۔ ستم بالائے ستم ان کارندوں میں سے بہت سے ہمارا ہی کھاتے ہیں اور خوب کھاتے ہیں مانگ تانگ کے۔ کئی دفعہ ناک سے لکیریں کھینچ کر، جو قرضہ ہم غیر ممالک یا مالیاتی اداروں سے لیتے ہیں اس میں سے یہ "فرشتے" مشاورت اور خدمات کے نام پر بہت کچھ ہتھیا لے جاتے ہیں۔ "مالِ غنیمت" میں سے کچھ سکے وہ "مقامی ہم جولیوں" کی جھولی میں بھی ڈال دیتے ہیں تاکہ نہ صرف اصل کھیل پردوں کے پیچھے چھپا رہے بلکہ سنہری کلغیوں والے مرغانِ چمن بہار کے گیت اس وقت تک گاتے رہیں جب تک حکومت نہ بدل جائے۔

حکومت بدلتے ہی یہ موسمی مینڈک تھوڑی دیر کیلئے اس طرح خاموش ہو جائیں گے جیسے دلدل میں گھس گئے ہوں مگر جلد ہی پھر نکل آئیں گے۔ راگ پھر شروع ہو گا مگر سر تال پہلے سے مختلف۔ اب خانہ بربادی کا ذکر شروع ہو چکا، ستیاناس اور بربادی کے ایسے قصے سنائیں جا رہے ہیں کہ سننے والا توبہ توبہ کا ورد کرتے کانوں کو ہاتھ لگائے اور سوچے کہ یہ حسین ملک کتنا بدقسمت ہے کہ اس میں بھیڑیئے نہ صرف دندناتے پھرتے رہے بلکہ ملک کی بے لوث خدمت کرنے والوں کو کئی سنگین مقدمات میں ملوث کر کے برطرف کر دیا گیا اور آج وہ دوبارہ قوم کی توجہ ہٹانے کیلئے اپنی معصومیت ثابت کرنے کیلئے احتساب کا نعرہ لگا رہا ہے تا کہ قوم کی توجہ اپنے کارہائے سے ہٹائی جا سکے اور اسی آڑ میں دوبارہ ایوانِ اقتدار کی غلام گردشوں میں اپنا راج قائم کیا جا سکے۔

یہ طالع آزما ایسی چکنی مٹی سے بنے ہوتے ہیں کہ عوام کے اعتماد کی مقدس امانت بھی ان کی گھٹی میں پڑے حرص وہوس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، نہ صرف پوری ڈھٹائی سے وہ موقع ملتے ہی کھل کھیلتے ہیں بلکہ اپنی "جرأت و بہادری" پر فخر کرتے ہیں۔ بعد میں پکڑے جائیں تو بھی اپنے کئے پر نادم ہونے کی بجائے یوں سینہ تان کر اپنا دفاع کرتے ہیں کہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کو بھی یہ کہنا پڑ جاتا ہے کہ "کرپٹ عناصر شرمندہ نہیں بلکہ وہ اکڑ کر بڑے فخر کے ساتھ اپنے پروٹوکول اور درجن بھر ذاتی باڈی گارڈز کے ساتھ کروڑوں کی گاڑیوں کے جلوس کے ساتھ چلتے ہیں تا کہ عام شہری پر ان کے مال و دولت کے ساتھ ان کی طاقت کی دھاک بھی بیٹھ سکے.....ان سے کئی کئی ملین ڈالر عدالتوں کے حکم پر حکومت نے وصول بھی کئے، اربوں لوٹ کر لاکھوں واپس کر کے بھی کسی خسارہ میں نہیں رہے اور اس کے باوجود وہ گالف بھی کھیل رہے ہیں، ٹی وی پروگرامز میں قوم کو دانش وسیاست کا سبق بھی پڑھا رہے ہیں۔ معاشرہ کو ان سے الگ تھلگ رہنا چاہئے تھا اور ان کا بائیکاٹ کرنا چاہئے تھا لیکن وہ اب پیچھے بیٹھ کر دھوکہ بازی اور کرپشن کے سارے داؤ پیچ اپنی اولادوں کو سکھا کر میدان میں اتار دیتے ہیں اور ہماری قوم کے پڑھے لکھے نونہال الیکشن کی سرگرمیوں میں ان کی گاڑیوں کے ساتھ بھاگ بھاگ کر خود کو اس امید پر ہلکان کرتے ہوئے ان کے زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہوتے ہیں کہ ممکن ہے کہ ان کے اقتدار میں ہمیں نوکری مل سکے تا کہ ہم اپنے بوڑھے ماں باپ کی کفالت کے ساتھ ساتھ اپنی جوان بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے قابل بن جائیں۔

خطا تو معاشرہ کی بھی ہے۔ اچھائی برائی میں تمیز کمزور پڑ جائے، عجز وانکسار کمزوری کی علامت تصور ہونے لگے، برائی سے بچنا بزدلی ٹھہرے اور چور ڈاکو رہزن کیلئے دلوں سے نفرت مٹ جائے تو کیوں نہ بھیڑیئے بھیڑوں کے گلے کے نگہبان کردار ادا کریں۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ انسان کی سرشت میں مضمر ہے کہ ہر انسان دل کی گہرائیوں میں نہ صرف نیکی اور بدی کا واضح احساس رکھتا ہے بلکہ وہ برائی کے خلاف جدوجہد کے جذبہ سے بھی عاری نہیں۔ حالات کا جبر البتہ اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ روزمرہ مشاہدہ اسے واضح اشارے دیتا ہے کہ خواہ مخواہ "پنگا" لینا سراسر حماقت ہے جو سر پھرے پرائی آگ میں کود پڑتے ہیں ان کے نہ صرف پاؤں جھلس جاتے ہیں، بعض اوقات یہ تن سوزی انہیں عالمِ نزع سے عدم کی منزل تک لے جاتی ہے۔

عقلمندی، انہیں ناانصافی، ظلم اور بے رحمی سے نبرد آزما ہونے کی بجائے خاموش رہنے اور بہت کچھ "پی جانے" کی ترغیب دیتی ہے، یوں ان کی قوتِ برداشت کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے جس سے برخود غلط ظالموں کا حوصلہ بڑھتا ہے۔

وہ چنگیز خان کے لشکریوں کی طرح ہر مرغزار پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ بڑھتے ہوئے طوفان کے سامنے نہ صرف نہتے اور بے بس عوام کی طاقت جواب دے جاتی ہے بلکہ انسانیت کی روح تک ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ آٹھوں پہر گردش کرنے والا آسمان پھر عجیب و غریب منظر دیکھتا ہے۔ مفتوحہ شہر میں ایک ممتاز شہری کسی غیر مسلح تاتاری کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، اسے وہی لیٹ جانے کا حکم ہوتا ہے جس کی بلاچوں چراں تعمیل ہوتی ہے۔ تاتاری یہ کہہ کر "یہیں لیٹے رہنا جب تک میں کیمپ سے تلوار لا کر تمہارا گلا نہ کاٹ دوں" چلا جاتا ہے۔ معزز شہری بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے، نہ اسے فرار کا خیال آتا ہے، نہ جان بچانے کی سوجھتی ہے۔ کافی دیر کے بعد تاتاری آتا ہے، اس کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ :لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ:یقیناً ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت (احسن تقویم) میں پیدا کیا ہے اور پھر اسے نیچوں سے نیچا (اسفل سافلین) کر دیا، ماسوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، ان کیلئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔

حد سے بڑھ جانے والی سفاکی غلامی کو جنم دیتی ہے۔ کوئی بھی خواہ مخواہ گردن کٹوانا نہیں چاہتا۔ نہتے انسانوں کا جمِ غفیر توپ و تفنگ سے مسلح لشکر کے سامنے کیسے ٹھہر سکتا ہے، خصوصاً جب قتلِ عام کا اذن ہو چکا ہو یا ہو سکتا ہو۔ ہلاکو خان نے اہلِ بغداد کو تہ تیغ کیا تو دریا کا پانی گلرنگ ہو گیا، نادر شاہ نے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ گلیوں میں انسانی خون بارش کے پانی کی طرح بہنے لگا۔ 1857 میں بار بار اجڑنے والی دلی کو پھر ویسا ہی المیہ پیش آیا۔ شہزادگان کی لاشیں کئی دن درختوں سے لٹکتی رہیں، ناز و نعمت میں پلے بڑھے کتنے ہی اہلِ ثروت خون کی ہولی کی بھینٹ چڑھ گئے، جو بچ رہے وہ فاتحین کی قدم بوسی کو بڑھے۔ اپنی وفاداری کا یقین دلانے کیلئے ایڑھی چوٹی کا زور لگایا، تابعداری کو شرطِ استواری سے یوں سنوارا کہ وہ اصل ایمان ٹھہری۔

عرب کے خیمے میں اونٹ گھسنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ سردی میں ٹھٹھرتا بیچارہ عرب کر ہی کیا سکتا ہے۔ اونٹ کی ناک میں نکیل ہوتی اور رسی کو سوار نے مضبوطی سے تھاما ہوتا تو یہاں تک نوبت ہی نہ پہنچتی۔ اترنے پر اونٹ خیمے سے باہر زمین میں گاڑے کھونٹے سے باندھ دیا جاتا۔ ایک دفعہ وہ خیمے میں گھس جائے تو بازی مالک کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے، اب وہ بے بس اور لاچار ہے۔ انحصار اب اونٹ کی خصلت پر ہے، اگر نیک طینت ہے تو مالک کیلئے بھی خیمے کے اندر گنجائش پیدا کرے گا، اگر کینہ پروری پر تل گیا تو مالک کیا اس کا باپ بھی آجائے پر نالہ وہی رہے گا جہاں تھا۔ فاتح طبقے روایتی اونٹ کی طرح ہوتے ہیں، ان کی شرافت، رعایا پروری اور بندہ نوازی کے گن گاتے ہوئے التماس کی جاسکتی ہے کہ شرفِ انسانی کی لاج رکھیں اور غلاموں کو آزادی کی نعمت لوٹا دیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ آزادی تو کبھی بھی التجاؤں اور درخواستوں سے نہیں ملی:

جسٹس مرحوم محمد رستم کیانی نے 1959 میں دیئے گئے خطبہ یومِ اقبال میں ایک شوریدہ سر شاعر کے اس شعر کا حوالہ دیا تھا:

دیکھتا کیا ہے میرے منہ کی طرف
قائداعظم کا پاکستان دیکھ

جسٹس مرحوم محمد رستم کیانی اس وقت حکومت کے قانونی مشیر تھے۔ ان سے رائے طلب کی گئی تھی کہ اس پر کون سی دفعہ لگتی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ "خدا کے بندو! وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ میرے منہ کی طرف کیا دیکھتے ہو، پاکستان کی طرف دیکھو، کیا یہ وہی ملک ہے جو قائداعظم نے تراشا تھا..... اب تو غالباً روحِ پاکستان بھی اپنے "جانثاروں" سے یہ سوال کرتی ہو گی۔ کیا ہم سے کوئی جواب بن پاتا ہے؟ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے زندگی کے کسی لمحے میں بھی یہ سوچنے یا معلوم کرنے کی زحمت بھی گوارہ کی کہ مملکتِ خداداد پاکستان کیونکر صفحہ ہستی پر نمودار ہوا؟ بانیانِ پاکستان کے خواب کیا

تھے؟ آرزوئیں، تمنائیں اور آدرش کیا تھے؟ بابائے قوم نے کیا سوچا تھا، کیا چاہا تھا، کون سی منزل متعین کی تھی؟ کیسے وہاں تک پہنچنا تھا؟ وہ منزل کن اندھیروں میں کھو گئی، کبھی کوئی دکھائی پڑتا ہے یا نہیں؟

صحرائے سینا میں چالیس سال تک بھٹکنے کے بعد حضرت موسیٰ کی قوم کو بھی بالآخر منزل مل گئی تھی۔ احساسِ زیاں اگر دامن گیر ہو جائے تو کیا خبر ہم بھی گم گشتہ راہوں کو از سرِ نو پالیں۔ اپنی اپنی ذات کی قید سے آزاد ہو جائیں۔ ذاتی مفاد کو ہی زندگی کا واحد مقصد سمجھنا ترک کر دیں۔ ملک و قوم کی فلاح و بہبود کو نہ صرف اپنا فرض سمجھیں بلکہ اس کیلئے تھوڑی بہت قربانی دینے کیلئے تیار ہو جائیں۔ کیا وہ ایک نئی صبح نہیں ہو گی جب ہم میں سے کئی ایک دیوانے سچ کو برملا سچ کہنے سے نہیں ہچکچائیں گے۔ کتنا ہی خوشگوار اجالا ہو گا جب جماعتی وفاداریوں سے بالاتر ہو کر، یاری دوستی اور برادری کی زنجیروں سے آزاد ہو کر ہمارے اربابِ اختیار حق و انصاف کے تقاضے پورے کریں گے، قائداعظم کے حسین چہرہ پر جمی گرد جھڑنے لگے گی۔

ملک کی عدلیہ نے ملک کے دو وزیراعظموں کو گھر بھیج کر اپنی آزادی اور قانون کی سربلندی کا نعرہ تو بلند کیا لیکن کیا وجہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں قاضی کے ہاتھوں انصاف کا ایسا قتل عام کیا گیا کہ اب خود چیف جسٹس کو ایسے ججز کی کورٹ روم سے تصاویر ہٹانے کا عندیہ بھی سامنے آ چکا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج بھی انصاف طلب کرتے کرتے کئی نسلیں راہِ عدم کو سدھار جاتی ہیں۔ میرا کرب تو اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب یہ خبر آتی ہے کہ اعلیٰ عدلیہ نے ملزمان کو بے گناہ قرار دیکر بری کرنے کا حکم دیا تو پتہ چلا کہ وہ برسوں قبل پھانسی پر لٹک کر منوں مٹی کے نیچے پہنچ چکا ہے، وہ تو پھانسی گھاٹ جاتے ہوئے چلا چلا کر اپنی بے گناہی کی فریاد کر رہا تھا لیکن کسی نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا اور رسہ گلا میں پہنتے ہوئے نجانے اس کے دل سے کیا کیا بد دعائیں اس نظام اور اس کے چلانے والوں کو دیکر رخصت ہو گیا اور اس کے لواحقین اور بچے اب دربدر گلیوں کی خاک چھان رہے ہیں۔

آج ایک مرتبہ ملک میں تبدیلی کے نعرہ کا چلن جاری ہے۔ پاکستان میں نظام مصطفیٰ لانے کیلئے سڑکوں کو انسانی خون سے رنگین کیا گیا، بعد ازاں اس کو ریاست مدینہ بنانے کا مبارک عزم کیا گیا، بڑی دھوم کے ساتھ دعوے کئے گئے لیکن بد قسمتی سے ملک کے تمام بڑے شہروں میں ایک مختصر گروہ نے "میرا جسم میری مرضی" کے ساتھ انتہائی توہین آمیز نعروں، بیہودہ مطالبوں کے ساتھ شاہراہوں پر رقصِ دیوانگی اور بے حیائی کا کھلے عام مظاہرہ کیا لیکن ریاست اسے شہری آزادی کے نام پر ان کا دفاع کرتی رہی، آخر کار اس کا انجام یہ نکلا کہ اس گروہ میں آزادی کے نام پر بڑا بینر اٹھانے والی لڑکی کا ملک کے دارلحکومت میں اپنے عیاش و بدکار سرمایہ دار ساتھی کے ہاتھوں تین گھنٹے شدید ترین اذیت دینے کے بعد بہیمانہ انداز میں سر کو تن سے جدا کر دیا گیا اور اس لرزہ خیز قتل پر "میرا جسم، میری مرضی" والوں کو تو گویا سانپ سونگھ گیا اور کوئی موم بتی مافیا بھی کسی قسم کے احتجاج کیلئے ان شاہراہوں پر نہ آیا جہاں وہ سارا دن جنسی گندگی کے ساتھ ہڑبونگ مچایا کرتے تھے۔ یقیناً اس تازیانے کے بعد وہ ماں باپ بھی دم بخود ہوں گے جنہوں نے اپنی اولادوں کی ایسی پرورش کی ہے کہ "میرا جسم، میری مرضی" کے نام پر دی گئی بے مہار آزادی کا انجام کیسا نکلا۔ اب ایک دفعہ پھر ملک میں انتخابات کا طبل جنگ بجا دیا گیا ہے۔ قوم کے اندر محبت اور اتفاق کو پارہ پارہ کرنے کیلئے ایک دوسرے کے خلاف جلد ہی بیہودہ الزامات کی بارش شروع ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ملک میں دوبارہ شہد اور دودھ کی نہریں بہانے کے وعدے کریں گے لیکن ایوان اقتدار میں جانے کیلئے یہی الزامات لگانے والے شیر و شکر ہو کر قوم کو یہ نوید سنائیں گے کہ یہ اتفاق و محبت کے زمزمے صرف قوم کو سیراب کرنے کیلئے ہیں۔

اب یہ پاکستانی قوم پر منحصر ہے کہ وہ اپنی مشکلات کے حل کیلئے اپنے رب کے بتائے ہوئے احکام کی تعمیل کرتی ہے یا پھر دوبارہ مادی سہاروں کے جھوٹ پر بھروسہ کر کے اپنے ہاتھوں سے اپنی بد قسمتی پر مہر لگاتی ہے۔ ایک کڑا امتحان ہے اور وقت بھی ہاتھوں میں پھندہ لئے منتظر ہے۔ دیکھیں کون کون جھولتا ہے!

رہے نام میرے رب کا جو علیم و خبیر ہے۔

بروز اتوار 5 جمادی الثانی 1445ھ 17 دسمبر 2023ء

"حادثہ یا اتفاق"

اسلام کو علامہ اقبال نے دورِ حاضر میں ایک ایسے ضابطہ حیات کی حیثیت سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے جس میں فکری، علمی اور عملی ہر حیثیت سے ہر دور میں انسان کی ہدائت کی صلاحیت اور توانائی موجود ہے۔ انہوں نے اسلام کو ایک زندہ نظامِ حیات کی حیثیت سے پہلے خود از روئے ایمان و علم سمجھا اور پھر اسی فکر کو اپنے فن کے وسیلے سے عام کرنے کی جہدِ مسلسل میں مصروف ہو گئے۔ شعرا کے افکار کے بارے میں عام طور پر ایک تاثر یہ ہوتا ہے کہ ان میں کشش تو ہوتی ہے لیکن زندگی کے حقائق کا مقابلہ کرنے کی تاب و توانائی عطا کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ علامہ اقبال نے اس کلئے کو غلط ثابت کر دیا۔ وہ نہ صرف بہت بڑے شاعر تھے بلکہ بہت بلند سطح کے مفکر بھی تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی عطا کہ انہوں نے اپنے فکر و فن کو کلیتاً اپنے ایمان کی توانائی کے تابع کر لیا تھا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں پاکستان کے قیام کا واقعہ غیر معمولی اہمیت کا واقعہ ہے اور قیامِ پاکستان میں فکرِ اقبال کی توانائی اور قائد اعظم کی قیادت کی صداقت اور دیانت نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن وہ آزمائشیں ان کیلئے پست ہمتی کا نہیں بلکہ عزمِ تازہ پیدا کرنے کا وسیلہ بنتی چلی گئیں۔ مسلمانوں میں دینی شعور بیدار رکھنے میں علماء، اہل علم و دانش اور سیاسی رہنماؤں سمیت مؤثر اور مثبت کردار سب نے ادا کیا ہے لیکن منزل کا تعین کرنے اور پھر جذبہ ایمان کے تحت وحدت فکر و عمل کے وسیلے سے اسے حاصل کر لینے میں فکرِ اقبال کا بڑا کلیدی کردار ہے۔ اقبال جہاں بہت بڑے شاعر اور اسی سطح کے مفکر تھے وہاں ان کے خطبات نے خصوصاً خطباتِ مدارس نے ہماری فکری بیداری کی تاریخ میں بہت مؤثر کردار ادا کیا ہے، اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"۔ اقبال کی قلبی بے قراری کا ان کے فکر و فن میں بھرپور اظہار موجود ہے!

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

ان کی بے چینی محدود نوعیت کی نہیں تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بھرپور مادی ارتقاء کے مراحل طے کرنے والا انسان اس حقیقی روشنی سے محروم ہے جو اسے رازِ حیات سے آشنا کرتی ہے۔

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
انہی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

دورِ حاضر کے انسان کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ:

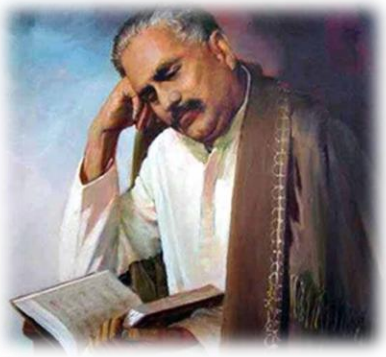

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انساں کو حیران بنانے کا طریقہ

ایمانی توانائی نے اقبال کو ساری انسانیت کیلئے فوز و فلاح کا اندازِ فکر عطا کیا تھا لیکن اس کیلئے ایک عملی مثال کی بھی ضرورت تھی اور وہ از روئے ایمان یہ سمجھتے تھے کہ انسانیت کو اسلام کے سوا کہیں اور امن و سلامتی نہیں مل سکتی، اسی لئے دور حاضر میں ایک ایسے نظامِ اجتماعی کے قیام کے آرزو مند تھے جو بلا مذہب و ملت ساری انسانیت کیلئے امن و سلامتی کا وسیلہ بن جائے اور اس مقصد کیلئے برصغیر میں مسلمانوں کی ایک آزاد و خود مختار حکومت کے قیام کی آرزو ان کا مقصد بنی کیونکہ انہیں اس حقیقت کا ادراک تھا لیکن اسلام کی وحدت خیر قوت کا بہترین اظہار برصغیر میں ہوا ہے۔ اقبال کی فکر و فن کی بنیاد کیونکہ ایمانی توانائی پر تھی اس لئے اس میں بڑا گہرا داخلی ربط پایا جاتا ہے۔ وہ احترامِ آدمیت کے علمبردار ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امکانی طور پر ہر انسان کو محض آزاد ہی "قابلِ تکریم" پیدا کیا۔ اس اصول کے تحت وحدتِ نسلِ انسانی پر ایمان ضروری ہو جاتا ہے اور مردہ فکر و عمل جو اس وحدت کے برعکس ہیں وہ باطل طاقتوں کے مقاصد کی تکمیل کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

علامہ اقبال محض جذباتی بنیاد پر اسلام سے وابستہ نہیں، وہ وابستگی گہرے علم اور تاریخی شعور کی بنیادوں پر ہے۔ علامہ اقبال نے بالکل درست کہا ہے کہ اسلام مذہب نہیں ہے بلکہ ایک ریاست ہے اور غور کیا جائے تو یہ بنیادی اہمیت کی بات ہے۔ دنیا کے دیگر مذاہب کے ماننے والے زندگی کے سارے معاملات کو اپنے مذہبی عقائد سے الگ رکھتے ہیں، یہ ان کی مجبوری ہے۔ ان افکار و اعمال سے جن کو وہ مذہب کی بنیاد سمجھتے ہیں، ان لوگوں کو زندگی کے معاملات اور مسائل میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی، اس لئے انہوں نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے، مذہب الگ اور ریاست الگ.....! یہ روش غیر مسلمانوں کیلئے درست ہو سکتی ہے لیکن مسلمانوں کیلئے ہرگز درست نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہادیٔ برحق رسول کریم ﷺ نے اسلام کو ایک مکمل ریاستی نظام کی صورت میں عطا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں پیشوائیت نہیں ہے کیونکہ جہاں پیشوائیت ہو گی وہاں سیکولرازم لازمی طور پر آئے گا۔

معاشرتی زندگی نظامِ حکومت کے بغیر بسر نہیں ہو سکتی۔ قائداعظم نے جب یہ کہا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اسلام میں مذہبی پیشوائیت کا الگ کوئی تصور نہیں ہے بلکہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہونے کی حیثیت سے ایک نظامِ ریاست بھی ہے۔ یہ حقیقت اسلام کے نظام کی تفہیم پر مبنی ہے اور اقبال کے خطبات اور ان کی شاعری دونوں میں اس کی بھرپور جھلک موجود ہے۔ قائداعظم نے علامہ اقبال کیلئے "مائی گائیڈ اینڈ فلاسفر" کے جو الفاظ استعمال کئے تھے وہ حقیقی مفہوم رکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہم سب پر چند خصوصی ذمہ داریاں عائد ہو گئیں ہیں۔ قیامِ پاکستان کوئی تاریخ کا "حادثہ یا اتفاق" نہیں ہے۔ اس ملک کا قیام دورِ حاضر میں حقیقی معنوں میں عالمگیر سطح اسلام کے احیاء کی علامت ہے۔

یہی ہماری توانائی بھی ہے اور یہی ہمارے مسائل کا سبب بھی۔ ہمیں اس حقیقت کو اور اس کے پس منظر میں اپنی ذمہ داریوں کو نہ صرف سمجھنا بلکہ ہمہ وقت ہر سطح پر اپنے پیشِ نظر بھی رکھنا چاہئے۔ ہمارے فکری، علمی اور تاریخی اثاثے بہت ہیں۔ ایسی دولت دنیا میں کسی دوسری قوم کو میسر نہیں اور اس دولت کی خصوصیت میں ہے کہ وہ تاریخ کا حصہ نہیں، ہر دور میں ہمارے فکر و عمل کیلئے مہمیز کا کام کر سکتی ہے۔ خود پاکستان کا قیام، اس کا استحکام اور اس کی علاقائی اور جغرافیائی اہمیت اس حقیقت کا سب سے بڑا واضح ثبوت ہے۔

علامہ اقبال کا یومِ پیدائش یا یومِ وفات ہمارے لئے ایک محض رسم کی ادائیگی کی صورت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ رسم بھی اہم ہوتی ہے کیونکہ وہ حقیقت تک پہنچنے میں وسیلہ بنتی ہے لیکن یہ بات ہمارے لئے توجہ کا سبب بننی چاہئے کہ قائداعظم، علامہ اقبال اور دیگر زعماء کی یادیں رسم کیوں بن رہی ہیں۔ جس طرح ہم اپنی جسمانی صحت کا خیال رکھتے ہیں ہمہ وقت اسی طرح ہمیں اپنی "ایمانی صحت" کا خیال بھی رکھنا چاہئے، کیونکہ ایمان کے بغیر انسان اور حیوان کے جسدِ خاکی ایک جیسے ہوتے ہیں۔

رہے نام میرے رب کا جس نے عزت کا معیار تقویٰ میں رکھا ہے!

یہ افسردہ اور پریشان بابا اقبال کہاں یاد آگئے!

آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک

بروز منگل 7 جمادی الثانی 1445ھ 19 دسمبر 2023ء

غلامی کا طوق؟

کوئی امریکا اور ان کے اتحادیوں سے پوچھے کہ سات سمندر پار سے ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے کبھی مشرق وسطیٰ کبھی خلیج کی ریاستوں کبھی جنوبی ایشیا اور سینٹرل ایشیا میں لاؤ لشکر اور ساز شیں لیکر کیوں نازل ہوتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قوتیں موت فروخت کرنے اور زندگی خریدنے آتی ہیں۔ ان کی اس خواہش میں مہم جوئی توسیع پسندی مجرمانہ کاروبار طاقت کا بیجا استعمال اور مذہبی جنونیت کا عنصر بھی شامل ہے اگر ان قوتوں کو انسان اور انسانیت امن و آشتی سے الفت ہوتی، اگر انہیں غربت جہالت مفلسی بیماری سے نفرت ہوتی تو یہ دنیا جنت کا نظارہ پیش کر رہی ہوتی۔ ان مقاصد کو پانے کیلئے جنگ و جدال، آگ و خون کے سمندر سے دنیا کو نہیں گزرنا پڑتا، نہ گولہ بارود کی ضرورت ہوتی بس صرف جیو اور جینے دو، انسان اور انسانیت رنگ و نسل و مذہب، باہمی احترام کسی قوم کی آزادی اس کی سرحدوں کے اعلیٰ اصولوں کی پاسداری طاقتور اور کمزور کا برابری کی بنیاد پر احترام بلا امتیاز کے تقدس کو تسلیم کرنا بنیادی شرائط ہیں اور ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ کسی کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنا بہت ضروری ہے مگر موت کے سوداگر اور زندگی کے خریدار یہ نام نہاد امن و آشتی کے دعویدار جنہوں نے اپنے ملکوں کے چاروں طرف طویل اور دیو قامت حفاظتی دیواریں اور فصیلیں بنا رکھی ہیں، ان میں بسنے والے انسان بھی نظر آتے ہیں اور انسانیت سے بھی واقف ہیں، آزاد بھی ہیں اور گولہ بارود کے زہر سے محفوظ بھی۔ غریب بھوک و افلاس و بیماری کے مارے کمزور ناتواں انسان اور ممالک بچارے کیا ان کی سرحدوں میں دراندازی کر سکیں گے۔ یہ شیطانی قوت تو ان شکار کی تلاش میں محو پرواز خونخوار عقابوں کو حاصل ہے جو جہاں چاہیں حملہ آور ہو جائیں اور انسان اور انسانیت کے جسم سے بوٹی بوٹی نوچ لیں۔

خونی عقابوں کا ٹولہ جو ننگے بھوکے انسانوں کی لاش کو گولہ بارود میں بھون کر نوچنے والے دہشتگرد عقاب اپنے ہی ہاتھوں ستائے ہوئے انسانوں میں دہشتگرد تلاش کر کے شکار کرنے پر آمادہ اور بضد ہیں۔ ان دہشتگرد عقابوں کے اپنے بھی کوئی اصول نہیں ہیں اور شکار کی تلاش میں کبھی خود بھی دست و گریباں ہوتے رہے ہیں۔ 1950ء میں برطانیہ فرانس اور امریکا نے ایک سہ فریقی معاہدہ کیا تھا جس کے تحت مشرق وسطیٰ کی تمام سرحدوں کی سلامتی کی ضمانت اس شرط پر دی گئی تھی کہ کوئی فریق جارحیت کا ارتکاب نہیں کرے گا مگر حرص و ہوس کے مارے مغرب کو کہاں قرار۔ 6 سال ہی اس معاہدے کو گزرے تھے کہ برطانیہ اور فرانس نے نہر سویز پر حملہ کر دیا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ سر دست امریکا اور اس کے موجودہ اتحادیوں کے تین بنیادی مفادات زیرِ قلم ہیں۔

پہلا مفاد یہ ہے کہ خلیج کے ممالک سے جہاں سے دنیا کی 60 فیصد تیل کی ضرورت پوری ہوتی ہے ان کے وسائل پر قبضہ کر کے اس علاقہ میں ان کی اجارہ داری قائم ہو۔ (اس دوڑ میں سوویت یونین بھی شامل رہا ہے) امریکی پالیسی کے تحت امریکا اسرائیل کی سلامتی کی ضمانت فراہم کرنے کے علاوہ اس کی آزادی اور وجود کو اس قدر مضبوط کرنا چاہتا ہے کہ اسرائیل کے خوف سے عرب ممالک پریشان اور دبے رہیں اور اس کی آڑ میں امریکی پالیسوں کو عربوں پر مسلط کیا جاتا رہے، جبکہ دوسری حکمت عملی یہ ہے کہ بعض عرب ریاستیں جن میں سعودی عرب، مصر، اردن اور خلیج کی دیگر بادشاہت اور حاکمیت پر مشتمل ریاستوں کے اقدار کے تحفظ اور اسرائیلی خوف سے نجات دلانے کی یقین دہانی پر نام نہاد دوستی کے نام پر امریکا نے ان کی معیشت اقتصادیات اور دفاعی شعبوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی ہے، سلامتی کے خوف میں مبتلا سعودی عرب سمیت دیگر خلیجی ریاستوں میں امریکی فوجیں

موجود ہیں۔ ایک طرف امریکی فوجوں اور ساماں حرب کے اخراجات ان ممالک کو برداشت کرنے پڑ رہے ہیں تو دوسری طرف امریکی فوجوں کی ان ریاستوں میں موجودگی اسرائیل کیلئے تحفظ اور سلامتی کا باعث ہیں۔

ایران میں انقلاب کے بعد امریکا اپنے ایک معتمد سے محروم ہو گیا۔ اس تبدیلی کے باعث امریکا نے سریع الحرکت فوج تیار کی جس کا مقصد خلیج اور ساری دنیا میں اپنے مفادات کا تحفظ بذریعہ طاقت کرنا تھا۔ عراق، شام، لبنان امریکی تسلط سے آزاد مگر سوویت یونین کے زیر اثر تھے۔ ایران کو کھونے کے بعد امریکا نے عراق کو اپنے حصار میں لے لیا چونکہ ایران عراق میں سرحدی و دیگر ایشوز پر شدید اور دیرینہ اختلافات اور تنازعات تھے، امریکا اس کا فائدہ اٹھا کر ایران کے انقلاب کو ناکام بنانے کیلئے دونوں میں تصادم کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ 8 سالہ عراق ایران جنگ نے دونوں ملکوں کو شدید جانی و مالی نقصانات سے دوچار کیا جبکہ اسلحہ ساز فیکٹریاں رکھنے والے امریکا سمیت دیگر ممالک نے ان دونوں ممالک کو 83 بلین ڈالر کا اسلحہ فروخت کیا۔

ایران کو بھی سرحدی تنازعات اور دیگر دعوؤں کی تکمیل کی صورت صدام اقتدار کے خاتمے میں نظر آئی۔ جنگ کی بساط بچھائی گئی۔ خلیج کی ریاستوں کو عدم تعاون کا سگنل دیا گیا، خلیج سے باہر اسلامی ملکوں کو جنگ میں شرکت کی دعوت دی گئی یا غیر جانبدار رہنے کا حکم صادر کیا گیا۔ مغربی اتحادیوں کے یہاں جنگ کا طبل بجایا گیا۔ دورانِ ریہرسل خلیجی ریاستوں کو اپنے تحفظ کے نام پر اسلحہ خریدنے کا حکم دیا گیا۔ اس خلیجی جنگ کی وجہ سے امریکی دفاعی صنعتوں کو تقریباً 210 بلین ڈالر صرف خلیجی ممالک کی طرف سے ملے تھے جس میں سعودی عرب نے تقریباً 60 بلین ڈالر کا اسلحہ امریکا سے خریدا اور بعد ازاں ٹرمپ کے دور حکومت میں 300 بلین ڈالر کے معاہدوں پر بھی دستخط ہوئے اور اسی آڑ میں اسرائیل کو اپنے جہازوں کیلئے سعودی سرزمین کے اوپر سے گزرنے کی بھی اجازت دلائی گئی۔

یہ معاملہ یہاں رکا نہیں بلکہ اسرائیل کو مسلم ممالک سے تسلیم کروانے کے سلسلے میں یو اے ای، بحرین، اردن اور دیگر ممالک نے نہ صرف سفارتی طور پر تسلیم کیا بلکہ اب تجارتی تعلقات بھی مستحکم کئے جا رہے ہیں۔ اسرائیل نے ان عرب ممالک میں نہ صرف اپنے سفارت خانے قائم کر لئے ہیں بلکہ اپنے شہریوں کے ذریعے تجارتی تعلقات کے نام پر اپنے دفاتر بھی قائم کر لئے ہیں۔

ادھر دوسری طرف امریکی ایماء پر اسرائیل عراق سے چھیڑ چھاڑ اور فلسطینیوں پر مظالم کی رفتار بڑھا چکا تھا۔ ماسوائے دو تین ممالک کے تمام خلیجی ریاستیں عراق کے خلاف امریکا کے پہلو میں کھڑی تھیں۔ امریکی ایماء پر کردوں کی تحریک میں تیزی آچکی تھی۔ امریکی خفیہ ایجنسیاں اور ادارے فرقہ وارانہ صوبائیت لسانیت اور علاقائیت کے سوئے ہوئے فتنے کو جگانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ عراقی تینوں افواج میں نفاق کی سازشیں کامیاب ہو چکی تھیں۔ سیکولرازم اور اشتراکیت کا پرچار کرنے والے صدام حسین کا خیال تھا کہ وہ مختلف المذاہب اور فرقہ واریت اور صوبائیت کے فتنے کو ختم کر کے ایک عراقی قوم پرست عوام تیار کر چکے ہیں۔ اظہار رائے کی آزادی سے محروم عراقیوں کے اندر پکنے والا لاوا تب سامنے آیا جب امریکا جو عراق پر ایٹمی و کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی کا الزام لگا کر (جو برآمد نہ کر سکا جس پر امریکی خارجہ سیکرٹری کولن پاؤل نے اقوام متحدہ میں اور ٹونی بلیئر نے معافی مانگ

کر اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیا ہے) اپنی پوری قوت اور طاقت کے ساتھ عراق پر حملہ آور ہوا، اور عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی پورا عراق آگ وخون میں نہلا کر ہزاروں سال پرانی تہذیب کا خاتمہ کر دیا۔ ہزاروں عراقی بلاامتیاز بوڑھے، جوان بچے خواتین بے رحمی سے شہید کر دیئے گئے مقدس مقامات کو نشانہ بنایا گیا۔ مظالم کے ایسے خوفناک پہاڑ توڑے گئے کہ ساری دنیا نے ابو غریب جیل میں مسلمانوں کی غیرت کے جنازے نکلتے دیکھے۔

عراقی فرقہ واریت صوبائیت اور علاقائیت کی بنیاد پر باہم متصادم ہوئے۔ عراقی عوام یکجہتی برقرار نہ رکھ سکے اور عراق کی افواج نے صدام سے غداری کی۔ تمام جہاز، میزائل اور سامان حرب دھرا کا دھرا رہ گیا۔ امریکا کو لتاڑنے پر صدام کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ تین دہائیوں کے بعد مصر میں منتخب حکومت نے اپنی خود مختاری کا جونہی احساس دلایا فوری طور پر اس کا دھڑن تختہ کر کے اپنا نمائندہ سامنے لے آئے۔ ان حالات میں امریکا اور مغرب یہ سمجھتے ہیں کہ اسرائیل کو خلیجی ممالک کے علاوہ دیگر اسلامی ملکوں سے تسلیم کا عمل اور بھی آسان ہو گا۔ خلیجی ممالک سے دوستی کی آڑ میں باقی ماندہ فلسطین پر قبضہ بھی آسان ہو جائے گا۔ آج ہم غزہ میں جو صورتحال دیکھ رہے ہیں، یہ اسی کا شاخسانہ ہے کہ خود اقوام متحدہ کا سیکرٹری جنرل دنیا بھر کے ممالک کے سامنے اپنی بے بسی کا شور مچا رہا ہے۔

خلیجی ممالک کو ڈرانے دھمکانے کیلئے ایک دفعہ پھر ایران کے ساتھ امریکا اور مغرب کی ایٹمی پروگرام پر مفاہمت کی پھلجڑی چھوڑ دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی خلیجی ریاستوں کے بادشاہوں اور حکمرانوں کو یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ تمہارے اقتدار کو اس وقت تک کوئی خطرہ نہیں جب تک وہ امریکا اور مغرب کے تابعدار ہیں البتہ یمن کے مسئلے پر ایران اور عرب ممالک میں مستقل مخاصمت برقرار رکھی جائے گی تاکہ اسلحے کی فروخت کا سلسلہ جاری رہے۔ اس جاری سنگین صورتحال میں مسلم ممالک کو سر جوڑ کر سوچنا ہو گا کہ انہوں نے امریکا اور مغرب کی غلامی کرنی ہے یا پھر تائب ہو کر اللہ کی غلامی اختیار کرنی ہے۔

بروز بدھ 8 جمادی الثانی 1445ھ 20 دسمبر 2023ء

قائداعظم، اقبال اور پاکستان

علامہ اقبال کا کلام انسانی فکر و عمل کی تاریخ کا نہائت دقیق تجزیہ ہے۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی بصیرت کی بنا پر تاریخی حوادث سے متعدد دوررس نتائج اخذ کئے، بعض وہ نتائج بھی جو ابھی رونما نہیں ہوئے تھے۔ ان کا یہ شعر مبنی بر حقیقت ہے:

حادثہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ پر اقبال نے خصوصیت کے ساتھ توجہ دی، انہوں نے دیکھا کہ یہ وسیع و عریض خطہ مدت تک مسلمانوں کے فکر و عمل کی عظیم جولانگاہ بنا رہا اور انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ایک عظیم الشان اسلامی معاشرہ تشکیل کیا جس کے برجستہ تمدنی نقوش ناقابل محو ہیں۔ مسلمان یہاں اگرچہ دوسری اقوام کی نسبت تعداد میں کم اور مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے لیکن عقیدہ توحید نے انہیں ہمیشہ اسلام کے رشتہ وحدت میں منسلک رکھا۔ متعدد مسلمان خاندانوں نے یہاں ایک ہزار سال تک حکومت کی، ان میں غزنوی، غوری، خلجی، تغلق، لودھی اور مغل خاندان زیادہ معروف ہیں۔ یہ حکومتیں اگرچہ مذکورہ خاندانوں کے نام سے منسوب تھیں لیکن چونکہ وہ اسلامی اصولوں کی اساس پر استوار کی گئیں اور اسلامی اقدار کی حفاظت اور نشر و اشاعت کیلئے کوشاں رہیں، اس لئے انہیں اسلامی حکومتوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے حکمران مسلمان تھے مساجد کی اور دین اسلام کو اپنی حکومت کا تشخص اور طرہ امتیاز قرار دیتے تھے۔ وہ اپنی قائم کردہ عدالتوں میں اسلامی قوانین رائج کرتے، مدرسوں اور تاسیس کرتے اور ان میں اسلامی تعلیمات و روایات اور مسلمانوں کی زبان و ادب کو فروغ دیتے، اکثر سلاطینِ وقت صوفیا اور علما کی عزت و تکریم کرتے اور ان سے ہدایات حاصل کرتے، صوفیا ہمیشہ سلاطین کو رعایا کے ساتھ عدل و احسان کی تلقین فرماتے۔

محمد بن قاسم کے بعد محمود غزنوی نے مسلمانوں کیلئے ہندوستان کے دروازے کھول دیئے، محمود غزنوی نے دہلی کو مسلم حکومت کا دارلسلطنت قرار دیا۔ تمام مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں نے اپنی حکومت کی شناخت دین اسلام کو قرار دیا اور ہر ایک نے اپنے آپ کو دین کے مبلغ و محافظ اور اس کی عظمت کے مظاہر و موید کے طور پر ملقب کیا، اس حوالے سے اکثر سلاطین کے القاب قابل ملاحظہ ہوں مثلاً معزالدین غوری، قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، رکن الدین فیروز شاہ، غیاث الدین بلبن، علاؤالدین محمد شاہ، ظہیر الدین بابر، نصیر الدین ہمایوں، جلال الدین اکبر، نورالدین جہانگیر، شہاب الدین شاہجہان اور محی الدین اورنگزیب عالمگیر وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین تخت نشینی کے وقت یہ اصرار کرتے تھے کہ وہ دین سلام کے تحفظ اور ترویج میں ہمیشہ کوشاں رہیں گے۔ اگر کوئی بادشاہ دینی امور کی اشاعت میں کچھ کوتاہی کرتا تو صوفیا اور علما اسے متنبہ کرتے اور اس کی اصلاح کی بھرپور کوشش کرتے۔ صوفیا میں نظام الدین اولیاء، بہاالدین ذکریا، شرف الدین بو علی قلندر، جلال الدین بخاری، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ سلاطین وقت کو اسلامی احکام کی تعمیل کی تاکید فرماتے رہے۔

برصغیر کی تاریخ سے متعلق جن عظیم حکمرانوں کو علامہ اقبال نے خراجِ تحسین ادا کیا ان میں محمود غزنوی، اورنگ زیب عالمگیر، احمد شاہ ابدالی اور ٹیپو سلطان خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ اشخاص ہیں جنہوں نے پرچمِ توحید کو ہمیشہ بلند رکھا اور باطل قوتوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اٹھارویں صدی میں جب مسلمانوں کا عظیم الشان معاشرہ بادشاہوں اور امیروں کی اخلاقی بے راہروی کی بنا پر فتنہ و فساد اور انتشار کا شکار ہوا تو اقتدار انگریزوں کے

ہاتھوں میں چلا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی بیداری میں سر سید احمد خاں، شبلی نعمانی، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی اور سب سے بڑھ کر علامہ اقبال نے نہائت اہم کردار ادا کیا۔ علامہ اقبال نے ہندو قوم کے تاریخی کردار اور اس کے عصری خطرناک عزائم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے دین و مذہب، جان و مال اور تہذیب و تمدن کی حفاظت کیلئے اپنی فکری اور عملی توانائیاں وقف کر دیں، انہوں نے فرمایا:

"آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے، ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے اور رفتہ رفتہ ان کا دین اور کلچر اس ملک میں فنا ہو جائے"۔ علامہ اقبال نے برصغیر میں مسلمانوں کیلئے ایک آزاد مملکت کا تصور ہزار سالہ اسلامی تمدن کی حفاظت اور بقا کیلئے پیش کیا، ان کے نزدیک مذہب قوت کے بغیر محض ایک فلسفہ ہے۔ انہوں نے فرمایا "اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام ایک تمدنی قوت کے طور پر زندہ رہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرے"۔

علامہ اقبال اسلام کے بغیر مسلمان کی زندگی کا تصور بھی نہیں کرتے تھے، وہ مسلمانوں کی آزادی کی حفاظت صرف نفاذِ اسلام کیلئے چاہتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: "اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاست سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظتِ اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں جیسا کہ آج کے قوم پرستوں کے رویئے سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی بھی کامیاب نہ ہوں گے"۔ ہماری تاریخِ ادب میں علامہ اقبال آزادی وطن کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اس حوالے سے ان کے سازِ سخن کے نغمات حریت و استقلال ہیں لیکن وہ اسلام کے بغیر آزادی وطن کا تصور بھی نہ کرتے تھے۔ انہوں نے بڑے غیورانہ لہجے میں فرمایا:

"اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا دار لکفر ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بھی بدترین ہو جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے"۔ علامہ اقبال نے برصغیر میں ایک آزاد اسلامی ریاست کی تشکیل کا مطالبہ محض اس لئے کیا تھا کہ شریعت اسلامی کا نفاذ ہو سکے تاکہ اس کے نتیجے میں ہر شخص کو معاش کی ضمانت مل سکے۔ اس بارے میں انہوں نے قائداعظم کے نام خط میں لکھا....."شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے لیکن کسی ایک آزاد اسلامی ریاست یا چند ایسی ریاستوں کی عدم موجودگی میں اسلامی شریعت اسلامیہ کا نفاذ اس ملک میں محال ہے"۔

انہوں نے مسلمانوں پر واضح کیا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی قومیت کے تصور کو ترک کر کے اسلامی قومیت کو اپنی شناخت بنائیں کیونکہ اسلام ہی انہیں موجودہ تباہ کن حالات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں پر اسلام کے احساناتِ عظیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزوِ ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دار و مدار ہے اور جن سے متفرق اور منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز اور معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے"۔

حکیم الامت کا سب سے بڑا کارنامہ جس کی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا، یہ ہے کہ انہوں نے ہندی قومیت کے تصور کی مکمل نفی کی اور مسلمانوں

میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کیا۔ اقبال جغرافیائی وطن پرستی کے سخت مخالف تھے کیونکہ یہ ان کے نزدیک وحدتِ ملی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ انہوں نے اسلام کو زندگی بخش قوت قرار دیتے ہوئے فرمایا "اسلام ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے جس کا عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی حیثیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے"۔ اسلام بحیثیت مذہب کے دین و سیاست کا جامع ہے، یہاں تک کہ ایک پہلو سے دوسرا پہلو کا جدا کرنا حقائق اسلامیہ کا خون کرنا ہے۔

اقبال کیلئے اسلام ہی مسلمان کی زندگی ہے، کوئی مسلمان اسلام سے باہر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ انہوں نے فرمایا: اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، جو نسبت انگلستان کو انگریزوں سے اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے"۔ رسالتِ محمدیہ کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ہمارے عقیدے کے مطابق بحیثیت مذہب کے اللہ تعالی نے اسلام کو بذریعہ وحی نازل کیا لیکن ایک معاشرت یا ملت کے طور پر اسلام کا وجود کلیتاً رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کا رہینِ منت ہے۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

1919ء میں ایک خط میں لکھا: خدا کی راہ میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے کیا، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہئے تھا اور زندگی تمام و مکمل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بسر ہونی چاہئے تھی"۔ اقبال اسلام کے ابدی حقائق پر محکم ایمان رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اسلام کی تفسیر و توضیح میں صرف کی تاکہ مسلمان عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس کی لامتناہی برکات سے مستفیذ ہوں۔ حضرت علامہ کے نزدیک اسلام ہی مسلمانوں کا بہترین مدافع اور محافظ ہے۔ اسلام مسلمانوں سے اپنے تحفظ کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ انہیں تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ مسلمانوں کے ملک و ملت اور جان و مال کی حفاظت صرف اسلام سے وابستگی میں ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"ایک سبق جو میں نے تاریخِ اسلام سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ آڑے وقت میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی"۔ اس دین کی حقانیت اور اہمیت کے بارے میں رقمطراز ہیں: میری طلب و جستجو صرف اس بات پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے او عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات مٹا دینا ہے"۔

اسلام تمام نوعِ انسانی کے حقوق کا احترام کرتا ہے۔ اس دین میں اسود و احمر، عربی اور عجم اور بندہ و آقا کی تمیز کچھ حکم نہیں رکھتی۔ اقبال اس جاہلانہ تصور کو سختی سے مسترد کرتے ہیں کہ اسلام کو معاشرتی حیثیت سے نکال کر شخصی ضابطہ بنا دیا جائے۔ انہوں نے 1930ء کے تاریخی خطبے میں فرمایا: کیا آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم عجمی اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہ رہتا ہو..... اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نصب العین سے الگ نہیں، دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں

۔اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کو ترک کرنا بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کیلئے بھی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کیلئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطن یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصولی اتحاد کے منافی ہو"۔

حضرتِ علامہ کے نزدیک اسلام ہی عالمِ انسانیت کیلئے فلاح اور امن کا دستور ہے، اسلام ایک سوشل نظام ہے جو حریت و مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے اور اس وقت احترامِ انسانی کیلئے سب سے بڑی نعمت ہے۔ اسلام کا مطالبہ وفاداری صرف خدا کیلئے ہے، تخت و تاج کیلئے نہیں اور چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ تمام زندگی کی روحانی اساس ہے اس لئے اس کی اطاعت کا دراصل مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ہی فطرتِ صحیحہ کی اطاعت کرتا ہے۔

حضرتِ اقبال کے نزدیک "اسلام "ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہو گی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ حضرتِ علامہ نے مسلمانوں کے تاریک ترین ایام میں اپنی قوتِ ایمانی سے فرمایا:
"دنیا میں کارفرما قوتیں اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں لیکن "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" کے دعوے پر میرا ایمان ہے کہ انجام کار اسلام کی قوتیں کامیاب اور فائز ہوں گی"۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ وطن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

حضرتِ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے تحفظ و بقا کیلئے جو راستہ دکھایا، قائداعظم مسلمانوں کے قافلے کو لیکر اس پر چل پڑے اور بہت قلیل عرصے میں منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے یعنی پاکستان..... اسلام کا پاکستان، ہمیشہ زندہ رہنے والا پاکستان۔ قائداعظم نے علامہ اقبال کو کیا خوب خراجِ تحسین پیش کیا ہے: اقبال سے بہتر اسلام کو کسی نے نہیں سمجھا، میں نے ان سے زیادہ وفادار اور اسلام کا شیدائی کسی کو نہیں دیکھا۔ اقبال اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ ہے" اور بلاشبہ اسلام ہمیشہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ آج علامہ اقبال سے محبت کرنے اور خراج تحسین پیش کرنے کا بہترین طریقہ ان کی تعلیمات پر عمل درآمد ہے۔

بروز جمعرات 9 جمادی الثانی 1445ھ 21 دسمبر 2023ء

اندلس کے بعد اب بھارت

کلنگہ کے مقام پر آخری لڑائی ہوئی، شام کے وقت وہ شمالی ہندوستان کا بلاشرکت غیرے مالک تھا، وہ گھوڑے سے اترا، سامنے میدان میں ہزاروں نعشیں بکھری پڑی تھیں، اس نے زندگی میں کبھی اتنی نعشیں نہیں دیکھیں تھیں۔ اس نے اپنے مشیر سے پوچھا "بھلا کتنے لوگ مارے گئے؟" مشیر نے سینہ پھلا کر جواب دیا "کم وبیش ایک لاکھ" وہ فوری نیچے بیٹھ گیا، اس کے سینے سے ہوک اٹھی اور ہندوستان کا سب سے بڑا بادشاہ دل پر ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اس کی مال ومتاع سمیٹتی فوج ٹھٹک کر رہ گئی، وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا "اشوک تم نے ایک لاکھ لوگ مار دیئے، ان کا کیا قصور تھا؟" وہ بلک بلک کر روتا رہا، آنسو تھمے تو وہ ایک نیا انسان تھا، اس نے نیام سے تلوار نکالی، دریا میں پھینکی اور ہندو دھرم ترک کرنے کا اعلان کر دیا۔

اشوک کے باپ نے 16 شادیاں کیں، اس کے 100 سے کہیں زیادہ بیٹے تھے۔ اشوک پیدائشی بادشاہ تھا لیکن دنیا کا سب سے بڑا فاتح اور بادشاہ بننے کیلئے اس نے فتوحات کا آغاز اپنے بھائیوں سے کیا۔ ایک ایک کر کے سارے بھائی مروا دیئے، آخر میں بادشاہ بن گیا۔ ہوسِ اقتدار زیادہ تھی اور سلطنت چھوٹی لہٰذا فاتح عالم بننے کیلئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں جو آیا کچل دیا، جس نے سر اٹھایا روند ڈالا۔ ہزاروں لاکھوں لوگ اس کی خواہش کا ایندھن بن گئے لیکن کلنگہ کی فتح، ہاں! اس خرابے نے گویا اس کی کایا پلٹ دی۔ اس نے سر اٹھایا، سامنے اس کی فوج کھڑی تھی۔ اشوک کے پاس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور انتہائی جدید اور بہادر فوج اس کے ایک اشارے پر جان دینے کیلئے تیار تھی۔ اس کے پاس سات لاکھ پیادے، تیر انداز اور گھڑ سوار تھے۔ اس نے یہ سورما چن چن کر سارے ہندوستان سے اکٹھے کئے تھے۔ اس نے کلنگہ کے میدان میں ہی فوج کے خاتمے کا اعلان کر دیا، اس طرح سات لاکھ فوجی فی الفور بے روزگار ہو گئے۔

وہ واپس پلٹا، ہندو دھرم سے لاتعلقی کا اعلان کیا اور بدھ مذہب اختیار کرنے کا اعلان کر دیا۔ حکومت کاری کے چند اصول وضع کئے۔ یہ اصول ایک ایک شہر، ایک ایک گاؤں اور قریہ قریہ کندہ کر دیئے گئے۔ اس نے پورے ملک سے چن چن کر ایماندار، محنتی لوگ اکٹھے کئے، انہیں "مہامیر" کا خطاب دیکر مختلف علاقوں کا والی بنا دیا۔ ان لوگوں نے سب سے پہلے برہمن اور شودر کا تصور توڑا، امیر اور غریب کی تعریف ختم کی اور پھر خدمت میں جت گئے۔ اشوک کی حکومت کاری کے دو بڑے اصول تھے، خدمت اور انصاف! اس نے پوری سلطنت میں سڑکیں بنوائیں، سڑکوں کے کنارے درخت لگوائے، کنوئیں کھدوائے، درس گاہیں اور منڈیاں بنوائیں۔ مسافروں کیلئے مسافر خانے بنوائے جہاں مفت قیام کی اجازت تھی۔

وہ دنیا کا پہلا بادشاہ تھا جس نے جانوروں کے ہسپتال کا تصور دیا، جس نے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے، جو یہ کہتا تھا کہ بچوں کی پرورش والدین نہیں بلکہ حکومت کا فرض ہے۔ جو یہ سمجھتا تھا جو حکمران اپنی عوام کو روٹی کپڑا، تعلیم اور دوا نہ دے سکے اسے حکومت کا کوئی حق نہیں۔ رہا انصاف تو اس کی سلطنت کے آخری گاؤں میں بھی کسی کے ساتھ کوئی ظلم ہوتا تو ظالم کو معلوم ہوتا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے اشوک سے نہیں بچا سکتی۔ کلنگہ کی فتح تک وہ صرف شمالی ہندوستان کا بادشاہ تھا لیکن جوں جوں اس کی خدمت اور انصاف کی شہرت پھیلی ارد گرد کی ریاستوں نے خود ہی شامل ہونے کی درخواست کر دی، یہاں تک کہ وہ اشوک سے اشوک اعظم بن گیا۔ اس کی سلطنت اڑیسہ سے گلگت اور بنگال سے دکن تک پھیل گئی۔ پورے ہندوستان پر حکومت کا اعزاز صرف تین بادشاہوں کو حاصل ہے، اشوکِ اعظم، اورنگ زیب عالمگیر اور آخر میں تاجِ برطانیہ۔ ان تینوں میں اشوکِ اعظم پہلا شخص تھا۔

فوج کے بغیر حکومت کا تصور اس کا خدمت اور انصاف سے بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے پاس سات لاکھ فوج، دس ہزار جنگی رتھ اور نو ہزار تربیت یافتہ ہاتھی تھے۔ اشوک کے ایک حکم سے ساری فوج بے روزگار ہو گئی، اس کے مشیروں نے سمجھایا، جہاں پناہ! چین کے ہن اور یونان کے طالع آزما سرحدوں پر کھڑے ہیں، ہمارے پاس فوج نہ ہوئی تو وہ حملہ کر دیں گے۔ اشوک مسکرایا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "میں سات لاکھ کی بجائے سات کروڑ کی فوج تیار کروں گا۔" "مشیروں نے حیرت سے دیکھا، اشوک نے کلام جاری رکھا" فوجوں کی ضرورت ان بادشاہوں کو ہوتی ہے جن کے عوام ان سے خوش نہیں ہوتے، میں اپنے شہریوں کو اتنا سکھ، اتنا چین، اتنا آرام اور اتنا انصاف دوں گا کہ اس ملک کا بچہ بچہ اپنی سرحدوں کی جان دیکر بھی حفاظت کرے گا۔ "اشوک نے یہ سچ کر دکھایا، اس کے دور میں کوئی بیرونی حملہ آور ہندوستان میں داخل ہوا اور نہ ہی کسی اندرونی شورش نے سر اٹھایا۔ وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے فوج کے بغیر ہندوستان جیسے ملک پر حکومت کی۔ اشوک کی موت کے بعد 47 برس تک اس کا نظام قائم رہا پھر محلاتی سازشیں شروع ہوئیں، اس کا پوتا برہدرتا قتل ہوا، گپتا خاندان برسرِ اقتدار آیا، فوج بنی اور اس کے بعد ہندوستان ایک بار پھر قتل وغارت گری کا ایسا شکار ہوا کہ آج اس ترقی یافتہ دور میں بھی سب سے بڑی جمہوریت کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے باوجود اپنے ہی شہریوں کو جان سے مارنے کی دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اشوک کہتا تھا خدمت اور انصاف ہو تو فوج کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی روپے پیسے کی۔ میرا خیال ہے اشوک کا فلسفہ ادھورا تھا کیونکہ وہ اپنی اس قدر بڑی اور فلاحی ریاست میں آر ایس ایس اور بی جے پی جیسی فرقہ پرست تنظیموں کا احیاء نہ کر سکا جو اس کے جانے کے بعد اس سرزمین پر صرف برہمن ہندوؤں کو اونچی ذات قرار دیکر سفید وسیاہ کا مالک قرار نہ دیکر ایسا خلاء چھوڑ گیا جس کی تکمیل کیلئے آج کے ہندو پرست مودی اور اس کے ہمنواؤں کو اشوکا کا جانشین بننے کی بجائے چانکیہ کی اولاد بننا زیادہ پسند ہے۔

اکیسویں صدی میں دنیا جیسے جیسے گلوبلائز ہوتی گئی اور مادی ترقی بڑھتی گئی تو ساتھ ہی انسانی حقوق کے خدشات نے بھی عالمی جگہ لے لی جس میں بالخصوص ناپاک سیاسی عزائم کی تکمیل اور قومی مفاد کی خاطر انسان نسل پرستانہ وشدت پسندانہ نظریات کی بھینٹ چڑھ گیا اور نسلی بنیادوں پر انسانی استحصال و نسل کشی اور انسانی حقوق کی پامالی میں مودی سرکار نے ایسا بھیانک ریکارڈ قائم کیا ہے کہ وراثت میں آئندہ نسلوں کیلئے تاریخی شرمندگی کا خاصا سامان چھوڑ کر جائی گی۔ انتہاء پسندانہ نظریات کی حامل شخصیات وارباب اقتدار نے انسان دشمنی کو فروغ دیتے ہوئے انسانی حقوق کی پامالی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی یہاں تک کہ عصرِ حاضر کے نام نہاد داعی امن ممالک اور جمہوریت پسند ریاستیں انسانیت سے ایسا برتاؤ دیکھ کر بھی بالکل خفت محسوس نہیں کرتیں اور یہ تلخ حقیقت ہے کہ اب عالمی ہیومن رائٹس واچ کی سالانہ رپورٹ کے مطابق جمہوریت کا خود ساختہ علمبردار اور انسانی حقوق پر مصنوعی راگ الاپنے والا بھارت اب عدمِ تحفظ کے لحاظ سے صفِ اول میں قرار دیا گیا ہے۔

اقلیتوں کے حقوق ہوں یا بھارت میں دیگر بسنے والوں کے حقوق، ہندو بنیا اپنے نسل پرستانہ اور انتہاء پسندانہ نظریات کی تقلید میں انہیں تحفظ فراہم کرنے میں ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ اسی ضمن میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ بھارت میں بالخصوص مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور ان کی شناخت ختم کرنے کیلئے جو ناپاک اقدامات کئے جا رہے ہیں اس سے یہ خدشہ جنم لیتا ہے کہ مسلمانوں کیلئے بھارت ایک اور اندلس بننے جا رہا ہے۔ اشوکا کی روح تو یقیناً تڑپتی ہو گی جب بھارت

میں بسنے والی اقلیتوں کے حقوق کی پامالی، عدمِ تحفظ اور نام نہاد داعی امن ریاست (بھارت) کی انسان دشمنی وانتہاء پسندی دنیا کے سامنے عیاں ہوتی چلی جارہی ہے جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ سیکولر بھارت ہندو نیشنلزم اور ہندو بالادستی کو فروغ دینے کی خاطر کس قدر مکار ہتھکنڈے اپنا رہا ہے۔

جب سے انڈیا اور اسرائیل میں محبت کی پینگیں بڑھی ہیں اور امریکا سرکار کی پشت پناہی سے بے لگام ہوا ہے، اس نے بھی موساد کی طرح اپنی خفیہ ایجنسی "را" کو بیرونی ممالک میں اپنے مخالفین کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں کینیڈا میں سکھ رہنما ہردیپ سنگھ نجر کے قتل اور کینیڈا کے وزیر اعظم جسٹن ٹروڈو کی جانب سے ممکنہ طور پر انڈین اداروں کے ملوث ہونے کے الزام کے بعد، دونوں ملکوں میں سفارتی کشیدگی اپنی بلند ترین سطح پر پہنچ چکی ہے۔ نجر سنگھ کے قتل کے بعد سکھوں نے دنیا بھر میں احتجاج کیا ہے۔ مظاہرے صرف کینیڈا میں ہی نہیں ہوئے بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں جہاں سکھ برادری کی تھوڑی بہت تعداد موجود ہے، وہاں خالصتان تحریک کے رہنما ہردیپ سنگھ نجر کے قتل پر غم وغصہ کا اظہار کیا گیا۔ اب ایسی ہی صدائیں امریکا سے آنا شروع ہو گئیں ہیں اور امریکا نے بھی کھلے لفظوں نہ صرف کینیڈا کی حمائت کی ہے بلکہ اپنے ہاں بھی "را" کی کاروائیوں کو نکیل ڈالنے کو کہا ہے۔ خود امریکی سیاستدانوں نے برملا یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ خطے میں تمام امریکی انڈوں کو انڈین ٹوکری میں رکھنا کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے۔

فرانسسکو کیپوٹرٹی جو اقوامِ متحدہ میں امتیازی (جیسے نسلی، لسانی، مذہبی) کی روک تھام اور اقلیتوں کے تحفظ کیلئے بنائے گئے سب کمیشن کے خصوصی رپورٹر رہ چکے ہیں-1977ء میں انہوں نے اقلیت کی یہ تعریف پیش کی کہ: ایسا گروہ جو کسی ریاست میں اس کی کل آبادی کی نسبت عددی طور پر کم تر ہو، غیر غلبہ کی پوزیشن میں ہو، جس کے افراد ریاست کے شہری ہوتے ہوئے ریاست کی باقی آبادی کی نسبت مختلف نسلی، مذہبی یا لسانی خصوصیات رکھتے ہوں اور اگر صرف اپنی ثقافت، روایات، مذہب یا زبان کے تحفظ کیلئے واضح طور پر یکجہتی کا احساس ظاہر کریں۔ معروف امریکی مصنف جوئل آرپروس اقلیت کی جداگانہ حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اقلیتی گروہ کی جداگانہ حیثیت سے مراد یہ ہے کہ معاشرے میں اس گروہ کے غلبے کی کمی ہو- ضروری نہیں کہ اس گروہ کی حیثیت کل آبادی کے نصف سے بھی کم ہو۔ اگر اقلیتوں کی بات کی جائے تو اس وقت بھارت میں مسلمان، عیسائی، سکھ اور بدھ مت جیسی مذہبی اقلیتیں بستی ہیں جو اپنے جان ومال کے تحفظ اور مذہبی آزادی کیلئے ہندو بنیے کے رحم وکرم پر ہیں۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق بھارت میں اقلیتوں کی تعداد (مسلم 18.2 فیصد)، (عیسائی 2.3 فیصد)، (سکھ 1.7 فیصد) اور (بدھ مت 0.7 فیصد) ہیں۔

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو تقسیم ہند (1947ء) کے بعد بھارتی قیادت نے اقلیتوں کا اعتماد جیتنے کیلئے وقتی طور نعرہ بلند کیا کہ ہندوستان ایک سیکولر ریاست ہو گی جس میں ہندو، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے لیکن ایسا عملی طور پر ہندستان کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا اور اقلیتوں کو ہمیشہ انتہاء پسند ہندوؤں کی طرف سے ظلم وجبر اور امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ ہندو بالادستی قبول کر لیں- ایسے ہی جیسے تاریخ میں اندلس کے مسلمانوں کے ساتھ ظلم کیا گیا اور انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ تین میں سے ایک آپشن قبول کر لیں (1) عیسائیت قبول کر لیں (2) ہجرت کر جائیں (3) قتلِ عام کیلئے تیار ہو جائیں- موجودہ ہندوستان میں بھی اقلیتیں بالخصوص مسلمان کچھ اسی طرح کی صورتحال سے دوچار اپنے حقوق سے محروم بے دست وپا زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ بھارت میں اقلیتوں کو مذہبی آزادی کا نہ ملنا، حقِ رائے دہی کا نہ ملنا، انصاف کا نہ ملنا، بنیادی حقوق (صحت، تعلیم، رہن سہن) سے محرومی، غربت، بیروزگاری، تشدد، دہشتگردی وانتہاء پسندی جیسے مسائل کا سامنا ہے

جس کے خاتمے کیلئے بھارتی حکومت انتہائی غیر سنجیدہ، نسلی تعصب کی بناپر اقلیتوں کے حقوق کی کھلی خلاف ورزی کر رہی ہے اور خود کو اشوکا کی وارث بھی کہہ رہی ہے۔

معروف بھارتی مصنفہ ارون دتی رائے نے 23 دسمبر 2015ء کو بمبئی میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ بھارت میں اقلیتیں خوف کے ماحول میں رہ رہی ہیں اور تشدد پرستی کے بڑھتے ہوئے جارحانہ رویّوں کو "عدم رواداری" کے چھوٹے سے نام میں موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ یونائیٹڈ سٹیٹ کے بین الاقوامی مذہبی آزادی کمیشن (یو ایس سی آر آئی ایف) کی سالانہ رپورٹ کے مطابق آخری عشرے سے ہندو قومیت پسند گروہوں کی کثیر الجہتی مہم کی وجہ سے اقلیتوں کے حالات بگڑ گئے ہیں-(مذہبی اقلیتیں) تشدد اور غنڈہ گری سے لیکر، سیاسی طاقت کے خاتمے، حقِ رائے دہی سے محرومی اور اختلافی پن جیسے مسائل کا سامنا کر رہی ہیں مثلاً مزید اقلیتوں کو ہندو بالادستی قبول کرنے کیلئے مجبور کیا جانا بھی ایک سنجیدہ مسئلہ ہے-اطلاعات کے مطابق دسمبر 2014ء میں آگرہ آگرہ (اُترپردیش) میں عوامی اجتماع میں سینکڑوں مسلمان جبری طور پر ہندوازم میں تبدیل کیے گئے اور آج بھی مذہبی تبدیلی کیلئے تشدد کا یہ ناروا سلوک جاری ہے۔

بھارت میں اقلیتوں کیلئے باقاعدہ قوانین موجود ہونے کے باجود وہ اپنے حقوق سے محروم ہیں جس کی بڑی وجہ اس قانون کا برائے نام (لاگو نہ ہونا) ہے۔ ہے۔ مثلاً اقلیتوں کے تعلیمی حق سے متعلق انڈین آئین آرٹیکل 30 کے مطابق "ریاست تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہبی ہوں یا لسانی، انہیں اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حق حاصل ہو گا اور ریاست تعلیمی اداروں کو امداد فراہم کرنے میں کسی بھی اقلیت کے زیرِ انتظام تعلیمی ادارے سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کرے گی"۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے باوجود اقلیتوں کے بیشتر افراد اپنے تعلیمی حق سے محروم ناخواندگی کی زندگی گزار رہے ہیں- اگر بالفرض کہیں تعلیم دی بھی جاتی ہے تو صرف ہندومت کی اور پورا نصابِ تعلیم ہندو مذہب کے گرد گھومتا ہے جو فی الحقیقت اقلیتوں (بالخصوص مسلمانوں کی) تہذیب و ثقافت ختم کرنے کیلئے ایک چال ہے-یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمان تیار ہو جائیں ان کے آثار مٹائے جارہے ہیں جس طرح تاریخ میں مسلمانانِ اندلس کے ساتھ کیا گیا بعین وہی بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ کیا جارہا ہے۔

اسی طرح اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی اور ان کیلئے غیر مؤثر قانونی نظام کا غیر مبہم اظہار ہمیں ان سطور میں بھی ملتا ہے۔ کہ بھارتی حکومت اکثر قومی اور ریاستی دونوں سطح پر مذہبی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے اپنے کیے گئے آئینی وعدوں کو نظر انداز کرتی ہے- قومی اور ریاستی قوانین اقلیتوں کی مذہبی آزادی کی خلاف ورزی کیلئے کھلم کھلا استعمال ہوتے ہیں۔ بی جے پی، کانگریس پارٹی اور (بھارتی عوامی پارٹی) کی زیرِ قیادت حکومتوں کے تحت مذہبی اقلیتی برادریوں اور دلتوں کو امتیاز اور ظلم و ستم کا سامنا ہے جس کی وجہ حد سے زیادہ توسیع یا غیر واضح قوانین، غیر مؤثر فوجداری نظامِ انصاف اور قانونی تسلسل کا فقدان ہے-بالخصوص 2014ء سے، نفرت انگیز جرائم، سماجی بائیکاٹ، حملوں اور جبری تبدیلی میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔

مودی سرکار کی تعصبانہ پالیسیوں کے باعث اس ریاست کے آزاد اور خود مختار ادارے بھی اقلیتوں کے خلاف متعصب ہو گئے ہیں اور یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ مودی سرکار فاشسٹ ہٹلر اور مسولینی سے بھی بدتر نظام کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مودی سرکار اور ان کے وزراء بالکل ہٹلر کی مانند ہیں-اپنی پارٹی کے منشور اور ملک کے دستور اور جمہوریت سے ان کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں-ملک میں بسنے والی اقلیتوں سے وہ ہٹلر جیسا سلوک کرتے ہیں، جس طرح ہٹلر صرف جرمن قوم کو اعلیٰ سمجھتا تھا اسی طریقے سے مودی سرکار ہندوؤں کو اعلیٰ سمجھتے ہوئے اقلیتوں پر اوچھے، غیر اخلاقی اور غیر انسانی حربے استعمال

کر رہی ہے۔

آپ شاہراہِ ریشم پر سفر کریں آپ کو راستے میں آج بھی اشوک کے کتبے نظر آئیں گے۔ ہزاروں سال بعد آج بھی ہندوستان میں اشوک کے کھدوائے کنوئیں اور سڑکیں موجود ہیں۔ یہ سڑکیں، یہ کنوئیں اور یہ کتبے آج بھی چیخ چیخ کر مودی سرکار کے متعصب چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے لیکن جن پر احسان کئے گئے ہوں ان کی نسلیں تک اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں۔ اہل سندھ آج بھی محمد بن قاسم کی یاد مناتے ہیں اور یہ آج بھی محمد بن قاسم کی تصویر کی طرف پشت نہیں کرتی۔ لیکن خود کو انسانیت کی چیمپئن کہلانے والوں کے ملک امریکا کا یہ حال ہے کہ وہاں ورمونٹ کے شہر برلنگٹن میں 24 نومبر 2023ء کو "امریکن تھینکس گیونگ ویک اینڈ" پر تین فلسطینی نژاد امریکی طالب علموں (شام آوارتانی، کنان عبدالحمید اور تحسین علی احمد) کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا ہے۔ تعصب کا یہ عالم ہے کہ اوبامادور کے سابق مشیر سٹیورٹ سیلڈووٹز نے سوشل میڈیا پر وائرل ویڈیوز میں اپنی شناخت کی تصدیق کرتے ہوئے واشگاف الفاظ مسلم مخالف نفرت انگیز گفتگو کرتے ہوئے کہا: اگر ہم نے چار ہزار فلسطینی بچوں کا قتل کیا تو یہ کافی نہیں۔

"يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ" اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائیں جائیں اور پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی، وہ اس کو دیکھ لے گا۔" محسنوں کو کوئی نہیں بھولتا، صرف ہٹلر مسولینی، وائٹ ہاؤس کے مکین، نیتن یاہو اور اب مودی کے نام ایسے ہیں جن کو تاریخ نفرت کیلئے محفوظ رکھے گی۔

بروز ہفتہ 11 جمادی الثانی 1445ھ 23 دسمبر 2023ء

نوحہ پڑھتے صبح وشام

کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہتا اور اس کی شکائت میں نے اپنی مربی سے بھی کی۔ ان کی تشویش اور فکر بھی دل کو کھائے جا رہی ہے۔ تنہائی ہے، دکھ ہیں، اداسی ہے چار سو پھیلی ہوئی، غم ہیں بادلوں کی طرح چھائے ہوئے، بھیڑ ہے، اژدھام ہے اور پھر بھی ہر کوئی اکیلا ہے۔ آسرا، کوئی چھپر نظر نہیں آتا کہ تھوڑی دیر سستا لیں، ہر ایک پسینے میں ڈوبا ہوا، سڑک پر کھڑا بیروزگار نوجوان، سامنے سے پولیس اسکواڈ کے ساتھ سائرن بجاتی ہوئی پراڈو میں بیٹھا ہوا غریبوں کی قسمت سنوارنے کا دعویدار لیڈر، بیان ہی بیان، تقریریں ہی تقریریں، بینرز ہی بینرز، مباحثہ اور ٹاک شو، دانشوری ہر جگہ دیگوں میں پک رہی ہے جس کی سڑاند سے جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ قیمتی لباس میں مسکراتے ہوئے تجزیہ کار، غریبوں کو بیچ کھانے والے دلال، انسانی منڈی جس میں ہر شئے برائے فروخت ہے۔ ضمیر، جسم، قول و فعل، بولو جی تم کیا کیا خریدو گے۔ آوازوں کا جنگل جس میں تنہا کھڑا بے دست و پا بندہ بشر!

حکمرانی کی مئے میں مدہوش زردار، یارو مجھے معاف کرو میں نشے میں ہوں، یوں کر لو، نہیں جناب ایسا کرو، نہیں نہیں یہ کرو جو میں کہتا ہوں۔ کہیں میلہ ہے زندگی کا اور کہیں برپا ہے ماتم، ہر جگہ بھوک ناچ رہی ہے جسے خودکشی آسودہ کرتی ہے اور کہیں بتائی جا رہی ہیں ترکیبیں انواع واقسام کے کھانوں کی، کہیں بچیاں منہ اندھیرے اپنے خواب دفن کر کے کام پر جانے کیلئے اسٹاپ پر کھڑی ہیں جنہیں من چلے اپنی جاگیر سمجھ بیٹھے ہیں اور کہیں ہے کیٹ واک، کہیں بدن چھپانے کیلئے ڈھنگ کے کپڑے نہیں، او کہیں جسم دکھانے کیلئے فیشن ڈیزائننگ، عجب گھڑی ہے، عجیب تماشہ ہے، میڈیا آزاد ہے اور ہر خبر پر نظر رکھے ہوئے، اور خبر کیا ہے، کوئی بتاتا نہیں ہے۔

ہم ایک سجدہ کو گراں سمجھ بیٹھے اور اب ہر جگہ ذلت و رسوائی کے ساتھ سربسجود ہیں۔ ایک کو چھوڑا تو جہاں کے محتاج ہو گئے، ایک کی نہیں سنی، اب ہر ایک کی جلی کٹی بھی سننی پڑ رہی ہیں، ایک کی نہیں مانی اور اب زمانے بھر کی ماننی پڑ رہی ہیں، اسی ایک در سے نہیں مانگا اور اب کبھی ڈونر انٹرنیشنل کانفرنسوں میں جھولی پھیلائے کھڑے ہیں اور کبھی وعدوں کے باوجود خیرات نہ ملنے کی شکائت کر رہے ہیں۔۔ اس ایک شعائر کی توہین کی، اب ہر جگہ مردود ہیں۔ یہ سب کچھ کیا دھرا ہمارا اپنا ہے، اب تو یہ فصل کاٹنی ہی پڑے گی، وہ ایک تو ہم پر ہمیشہ مہربان رہا تو قدر نہ کی لیکن ہم نے یاری لگائی عیاروں سے مکاروں سے۔ بہت سنا ہو گا آپ نے، بے قدروں سے یاری لگانا ایک نازک چوڑی کی طرح ہوتا ہے جس کا مقدر بالآخر ان گنت ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں، لیکن نہیں مانے ہم۔

اپنی تگڑم لڑائی، جی ہم تو فلاں یونیورسٹی کے فاضل ہیں۔ اب پتہ چلا وہ تو جہالت کا پروانہ تھا جسے ہم ڈگری سمجھ کر نہال ہو گئے تھے۔ بس ایک در ہے، وہی تھا، وہی رہے گا! بندہ کے دینے سے کبھی پیٹ نہیں بھرتا اور پھر اس کے سامنے نگاہیں بھی نیچی رہتی ہیں، لیکن وہ تو بے حساب دیتا ہے اور پھر طعنہ بھی کوئی نہیں۔ لیکن اب کون سمجھائے ان کو! یہ تو پاکستان کے اعلیٰ مناصب پر بیٹھ کر بھی اپنے آقا کو نہیں پہچان سکے، پاکستان کے دورے پر کچھ دن کیلئے آتے ہیں اور پھر..... وہی چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ دعاؤں کیلئے غربت کی لکیر سے نیچے کی آبادی جو موجود ہے! نہ غربت ختم ہو رہی ہے اور نہ ہی غریب۔۔۔!

چلتے چلتے ایک واقعہ سن لیں۔ ایک بادشاہ نے ایک عظیم الشان محل تعمیر کروایا جس میں ہزاروں آئینے لگائے گئے تھے۔ ایک مرتبہ ایک کتا کسی نہ کسی

طرح اس محل میں جا گھسا۔ رات کے وقت محل کا رکھوالا محل کا دروازہ بند کر کے چلا گیا لیکن وہ کتا محل میں ہی رہ گیا۔ کتے نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی تو اسے چاروں طرف ہزاروں کی تعداد میں کتے نظر آئے۔ اسے ہر آئینے میں ایک کتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کتے نے کبھی اپنے آپ کو اتنے دشمنوں کے درمیان پھنسا ہوا نہیں پایا تھا۔ اگر ایک آدھ کتا ہوتا تو شائد وہ اس سے لڑ کر جیت جاتا لیکن اب کی بار اسے اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی۔ کتا جس طرف آنکھ اٹھاتا، اسے کتے ہی کتے نظر آتے۔ اوپر اور نیچے چاروں طرف کتے ہی کتے تھے۔ کتے نے بھونک کر ان کتوں کو ڈرانا چاہا، دھیان رہے کہ دوسروں کو ڈرانے والا دراصل خود ڈرا ہوا ہوتا ہے ورنہ کسی کو ڈرانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب کتے نے بھونک کر ان کتوں کو ڈرانے کی کوشش کی تو وہ سینکڑوں کتے بھی بھونکنے لگے۔ اس کی نس نس کانپ اٹھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے بچنے کا کوئی راستہ نہیں کیونکہ وہ چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔

صبح چوکیدار نے دروازہ کھولا تو محل میں کتے کی لاش پڑی تھی۔ اس محل میں کوئی بھی موجود نہ تھا، جو اسے مارتا۔ محل خالی تھا لیکن کتے کے پورے جسم میں زخموں کے نشان تھے۔ وہ خون میں لت پت تھا۔ اس کتے کے ساتھ کیا ہوا؟ خوف کے عالم میں وہ کتا بھونکتا، جھپٹا دیواروں سے ٹکرایا اور مر گیا۔

ہمارے سبھی تعلقات، سبھی حوالے آئینوں کی مانند ہیں۔ ان سب میں ہم اپنی ہی تصویر دیکھتے ہیں۔ نفرت سے بھرا آدمی یہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ سب لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ لالچی آدمی کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب اس کو لوٹنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے لالچ کی تصویر دنیا کے آئینہ خانے میں دیکھتا ہے۔ شہوانیت کا مریض سوچتا ہے کہ ساری دنیا اسے جسم پرستی کی دعوت دے رہی ہے۔ فقیر کہتا ہے کہ ساری دنیا ایک ہی اشارہ کر رہی ہے کہ چھوڑ دو سب کچھ بھاگ جاؤ دنیا سے۔ ہم جو کچھ بھی ہیں وہی کچھ ہمیں اپنے چاروں طرف دکھائی پڑتا ہے۔ سارا جگ آئینہ ہے جس میں ہمیں اپنا آپ ہی دکھائی پڑ رہا ہوتا ہے۔

اپنے ارد گرد کے آئینوں کو اپنے عمل، کردار اور اخلاق کے ساتھ صاف رکھنے کی کوشش کریں کیونکہ ہمارا آئینہ ہمارے لئے راہِ نجات بھی ہے اور باعث پکڑ بھی۔ میرے خیال میں کہانی کا مقصد اپنے ارد گرد کے آئینے کو اپنے عمل، کردار اور اخلاق سے صاف رکھنے کی کوشش کرنا ہے کیونکہ ہمارا آئینہ بھی ہماری نجات اور ہماری گرفت کا سبب ہے۔ پھر آج کیوں نہ اس پر عمل کریں۔ نجانے ایسے عنوان کیوں میری قلم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس میں ان کا بھی قصور ہے، جو ہر روز صبح و شام جو کچھ مجھے پڑھنے کیلئے روانہ کرتے ہیں، اس کا کچھ تو ردِ عمل ہو گا۔ مجھے آج دو نظمیں آپ کی خدمت میں پیش کرنی ہیں جو آپ ہی کی طرف لوٹا رہا ہوں! ذرا دل تھام کر پڑھئے!

تیری دنیا کے باسی
کہا یہ اس نے
"تم اپنی اپنی پسند کے موسموں کو چن لو"
زمیں کو دیکھو، کہیں پہاڑوں کی وادیاں ہیں
کہیں پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں

کہیں یہ میداں کے سبزہ زاروں پر
موسم گل کی داستان ہے
کہیں پہ نیلے سمندروں کے شفاف سینے کھلے ہوئے ہیں
کہیں پہ صحرا کا ذرہ ذرہ دمک رہا ہے
جو چاہو تاروں کی کھیتیوں کو تو آسمان کی زمین لے لو
کہا یہ ہم نے
خدائے برتر، بزرگ و بینا
یہ ساری چیزیں انہیں عطا کر
جو اپنے خاراشگاف ہاتھوں سے دشت و صحرا کو چیرتے ہیں
سمندروں کو بلو کر ان سے شفاف موتی نکالتے ہیں
ہمیں تو تیرا کرم بہت ہے
ہمیں مشقت کی چیرہ دستی سے اپنے حفظ واماں میں رکھنا
ہمیں تو راس آ گیا ہے یارب
غریب رہنا، اسیر رہنا
ہمیں اسیر دوام کر دے
ہمیں کسی کا غلام کر دے
کیسی لگی ہے یہ نظم آپ کو! ایک مرتبہ دوبارہ پڑھ لیں۔ اب دوسری نظم بھی پڑھ لیں!
مرے بدن سے گریز کرتی ہوا سے کہنا
وجود کے ہر مسام میں جو غلاظتیں ہیں
یہ ذلتیں ہیں کئی برس کی
ہوا سے کہنا
کہ نوحہ پڑھتی تمام صبحیں، سلگتی شامیں
مری کہانی سنا رہی ہیں
حیات کا اب جواز کیا ہے
کہ سر سے آکاش اڑ گیا ہے
قدم زمیں پر لرز رہے ہیں
تو کیوں نہ لکنت زباں میں آئے

اسیر سوچیں علیل ذہنوں میں سڑ رہی ہیں
یہ خالی برتن کھنک رہے ہیں
فصیل پر بھی لہو کے دھبے پڑے ہوئے ہیں
ہوا سے کہنا
غلام گردش کے تن بدن سے
گریز کرتی ہوئی ہوا سے کہنا
اجازت دیں۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا، کچھ بھی نہیں۔ سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے، بس نام رہے گا میرے رب کا!

بروز سوموار 13 جمادی الثانی 1445ھ 25 دسمبر 2023ء

سرشاری ہی سرشاری

زندگی کی متاعِ عزیز کیا ہے؟ روپیہ پیسہ زر و جواہر زمینیں اور جائداد منصب جاہ و جلال ناموری واہ واہ داد و تحسین صلہ و ستائش بیوی بچے عزیز و اقرباء یار دوست.... کیا یہی ہے زندگی کی متاعِ عزیز! تو پھر نظریہ کیا ہے، اصول کیا ہے، حق و صداقت کیا ہے، دار و رسن کیا ہے، شہادت کیا ہے، عشق کیا ہے، محبت کیا ہے، بے غرضی کیا ہے، جاں نثاری کیا ہے، مر مٹنا کیا ہے؟؟؟ بتایئے پھر یہ سب کیا ہیں؟ کسے کہتے ہیں متاعِ عزیز؟ کیا انکار متاعِ عزیز نہیں ہے؟؟ جبر کے سامنے انکار، فرعونیت کا انکار، صلہ کا انکار، سودے بازی سے انکار، دولتِ بے بہا کا انکار، باطل کا انکار، سر جھکانے سے انکار، ظلم و جبر کا انکار، رب کی حاکمیت کے سوا سب کا انکار....

انکار متاعِ عزیز نہیں ہے تو پھر کیا ہے انکار؟ انکار اور یکسر انکار، پورے شعور کے ساتھ انکار۔ کوئی مصالحت نہیں بالکل بھی نہیں... مجسم انکار... باطل کے سامنے، طاغوت کے سامنے، رب کے باغیوں کے سامنے، نفس پرستوں کے سامنے، دنیائے حرص و تحریص کے سامنے، دھوکے کے سامنے، بے وفائی کے سامنے، خدائی لہجے میں بات کرنے والوں کے سامنے..... انکار اور یکسر انکار... پورے شعور اور پورے وجود کے ساتھ انکار، بس انکار۔ جتنا ظلم بڑھتا ہے، انکار کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں، تاریخ تو آج بھی اس کی گواہ ہے کہ جلتے انگاروں پر لٹایا گیا، جسم کی چربی نے جب دہکتے انگاروں کو شکست دی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ چہرے کی مسکراہٹ بھی توحید کے نعرے کی گواہی دے رہی تھی کیونکہ آخرت کی کامیابی لپک لپک کر ان کے بوسے لے رہی تھی۔ انکار کی یہ مومنانہ جرات نے زمین و آسمان کو ششدر کر کے رکھ دیا کہ ایک عورت جس کے عزم و یقین کو کفر و جہالت کے پہاڑ شکست نہ دے سکے، اس کے نازک آبگینوں کو تیز دھار تلوار کے وار سے کاٹ کر رکھ دیا لیکن اس کی زبان سے آخری انکار نے جہالت کے منہ پر مالک مل دی جو قیامت تک کے آنے والوں کیلئے انکارِ خداوندی لطف کا راستہ متعین کر گئی۔

دلیل چاہے کتنی بھی مضبوط ہو، رب کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہے! بس انکار۔ لیکن انکار اپنے نفس کو خوش کرنے کیلئے نہیں، نفس کو خوش کرنے کیلئے انکار تو انکارِ ابلیس ہے۔ اپنے رب کیلئے انکار..... یہی ہے اصل اور کچھ نہیں۔ نہیں مانیں گے کسی کی بھی۔ کسی طاقت کی، کسی بھی نظام باطل کی نہیں مانیں گے چاہے لاکھ مادی دلیلیں دو۔ بس مانیں گے تو صرف رب اعلیٰ کی، بس اسی کی اور کسی کی بھی نہیں۔ یہی توحید ہے اور ہے کیا توحید؟ میرا دین تو شروع ہی انکار سے ہوتا ہے یعنی "لا" سے۔ پہلے انکار کی منزل ہے پھر تسلیم کی۔ میں انکار کیے بغیر تسلیم کیسے کر سکتا ہوں! اگر میں انکار نہ کروں اور تسلیم بھی کروں تو یہ منافقت ہے جو قابلِ قبول نہیں ہے۔ ملاوٹ نہیں خالص درکار ہے بالکل خالص..... چاہے ذرہ ہی ہو۔ ملاوٹ شدہ پہاڑ درکار نہیں ہے۔ یہی ہے اخلاص اور کیا ہے؟

انکار روحِ اسلام ہے۔ انکار روحِ حسینیت ہے۔ انکار..... جا، نہیں مانیں گے۔ تمہارے دھوکے تمہیں مبارک، ہمارا سچ ہمیں۔ انکار لکھنے میں بہت آسان ہے۔ پنج حرفی لفظ بہت آسان ہے لکھنا، کرنا بہت مشکل ہے۔ جان لیوا ہے، بہت نقصان دہ، بہت قربانی چاہتا ہے۔ خود سے بھی لڑنا پڑتا ہے۔ اپنا انکار بھی، نہیں اپنی بھی نہیں مانوں گا۔ بہت مشکل ہے یہ بہت کٹھن منزل۔ معرکہ خیر و شر کیا ہے؟ معرکہ حق و باطل کیا ہے؟ یہی تو ہے حق کا ساتھ دینا خیر، باطل کا ساتھ دینا شر۔ رب کے سامنے تسلیم خیر اور ابلیس کا پیروکار بننا شر۔ معرکہ خیر و شر یہی ہے، بس یہی ہے۔ پورے عالم میں یہی کچھ ہوتا ہے، ہوتا رہے گا۔ نہیں رکے گا یہ معرکہ۔ جنگِ بدر کیا ہے؟ کربلا کا درس کیا ہے؟ جہاد کیا ہے؟ یہی ہے بس۔ سب کا درس ایک ہے: "بس انکار"۔ انکار کرو تو جان

سے گزرنا پڑتا ہے۔ خاندان نثار کرنا پڑتا ہے۔ سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آگ وخون میں نہانا پڑتا ہے۔ خاک آلود ہونا پڑتا ہے۔ اپنی خواہشات کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ تیز دھار پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ لاشے اٹھانے پڑتے ہیں۔ جب شعور کے ساتھ انکار ہو تو ہر لاشہ اٹھاتے ہوئے یقین بڑھتا ہے۔ پختگی آتی ہے۔ رب اعلیٰ کیلئے سب کچھ قربان کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کی اس دھرتی پر تم سے پہلے کئی فرعون، نمرود، شداد انکار کرنے والوں کو خوب آزما چکے، اگر اس کے عبرتناک انجام سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا لیکن ان دیکھے جرثومے "کرونا" نے اوسان خطا کر دیئے۔ اب بھی کوئی ان دیکھا جرثومہ تو بہر حال تعاقب میں ہے۔

میں غزہ کی منجمد کرنے والی سردی اور بارش میں ایک ریڑھی پر لدی لاش کو گھسیٹتے ہوئے اس بچے کو کیسے بھول جاؤں، انکار کا یہ دکھ بھرا منظر میری روح تک کو چھلنی کر گیا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ اپنی ماں کی زندگی بچانے کیلئے جس ہسپتال کی طرف جا رہا ہے، اس ہسپتال کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور وہاں کے مسیحا ڈاکٹر اسماعیل جو اپنے خاندان کے افراد کی خیریت تک نہ پوچھ سکا کہ اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ سارا علاقہ اپنے تمام مکینوں کے ساتھ رب اعلیٰ کے ہاں حاضر ہو گئے ہیں جہاں اس کی تمام پونجی مقیم تھی، آج وہ بھی ہسپتال کے ملبے میں اپنے ان تمام شہداء کے پاس پہنچ گیا ہے، تو اس بچے کی دم توڑتی ماں بھی ان کے پاس پہنچا دی گئی۔ یہ وہی ڈاکٹر اسماعیل تھا جس کے ہاتھ برسوں لندن کے ہسپتالوں میں لوگوں کی زندگیاں بچانے کیلئے آپریشن میں مصروف رہے، وہ چند برس قبل اپنی آرام وستائش والی زندگی چھوڑ کر غزہ میں دکھی انسانیت کی خدمت کیلئے پہنچ گیا اور اپنی خواہش کے مطابق زندگی کا سارا سرمایہ اس دنیا میں ہار کر جنت کا خریدار بن گیا۔

کیا یہ وہی فلسطین نہیں جہاں تین اہل کتاب کی مشترکہ زیارت پر 24 گھنٹے محبت کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا، اچانک وہاں ہیبرون کی ساری آبادی کو دیس نکالا دیکر اس مسجد ابراہیمی کو تالا لگا کر بندوق بردار جلادوں کو کھڑا کر دیا گیا کہ اب کوئی بھی سیدنا حضرت ابراہیم کو اپنا "دادا" سمجھنے والا اس کے اندر قدم رکھنا تو کجا، اس کے آگے سے بھی گزر نہیں سکتا۔ معاملہ صرف یہی ختم نہیں ہوا کہ اپنے خون سے اس گلشن کی آبیاری کرنے والوں کو اس چمن کے مہکتے پھولوں سے محروم کر دیا گیا بلکہ ان پھولوں کے خاروں پر بھی ان کا حق ختم کر دیا گیا۔ قصر سفید میں بیٹھے فرعون نے ہماری ہی امت کے امیر ملکوں سے اسے "معاہدہ ابراہیم "کا نام دیکر تسلیم کرواتے ہوئے جائز حقداروں کو بھی یہ پیغام دے دیا کہ بھول جاؤ اب قبلہ اول کو، اب یہاں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کو بھی کوئی روک نہ سکے گا۔

آج یہی انسانی حقوق کے سب سے بڑے چیمپئن اور مہذب دنیا کے دعویدار اپنے "لے پالک" کو اسلحے سے بھرے ہوئے جہاز دیکر غزہ کے باسیوں کو دہشتگرد قرار دیتے ہوئے ان کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا کام کر رہے ہیں بلکہ اپنے ملکوں میں ان کے حق میں مظاہرے کرنے والوں کو کوفیہ پہننے سے یا جنگ بندی یا آزادی کے نعرے لگانے سے اپنے کرائے کے سپاہی کے جذبات مجروح ہونے سے خبردار کر رہے ہیں۔

ادھر کشمیر کی صورتحال تباہ کن ہے اور بین الاقوامی برادری نے یہاں موجود لوگوں کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔ سفاک ہندو فوجی دوکانوں، مکانوں، ہسپتالوں، اسکولوں اور مساجد یہاں تک کہ ہر چیز کو نشانہ بناتے ہیں اور ہر روز شہیدوں وزخمیوں کی دل دہلا دینے اور سینہ چھلنی کرنے والی خبروں پر بھی مکمل پابندی لگائی جا چکی ہے۔ اب شائد آزادی کا استعارہ علی گیلانی بھی اپنی قبر میں اپنے وکیل کی بے وفائی پر اپنے رب کے حضور فریاد کناں ہو گا۔ اس ضعیف سید نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کشمیر میں جاری قیامت صغریٰ پر ہمارے بد طینت اور بد دیانت قیادت کے رویے کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا تھا

کہ اپنی اولاد کے معصوم بچوں کے چیتھڑے اڑانے کا مقدمہ خود نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ اپنے رب کے ہاں پیش کرے گا۔یقیناً اپنی درخواست میں جہاں ایک لاکھ سے زائد اپنے جوان بیٹوں، بیٹیوں اور معصوم شہدا کے ٹکڑے اپنے پاکیزہ خون کے سامنے پیش کرے گا وہاں یہ فریاد بھی شامل ہو گی کہ جب یہ ظلم و ستم جاری تھا ہمارے وکیل کی دھوکہ دہی کے ساتھ ساتھ خادمین حرمین اور دیگر عرب رہنما سفاک مودی کو اپنے ہاں بلا کر ملک کے اعلیٰ اعزازات سے نواز رہے تھے۔وہاں منکر نکیر تمام معاملات کو کھول کھول کر جب سامنے رکھیں گے تو یہ یقیناً اپنے سر اور سینے کو پیٹ کر دوبارہ دنیا میں جانے کی آرزو کریں گے۔

یہ الگ بات ہے کہ متعصب مودی حکومت 5 / اگست جیسے غیر آئینی اور غیر قانونی فیصلوں کے باوجود ایک مرتبہ پھر وحشت ناک ظلم و ستم و بربریت کے باوجود مقبوضہ کشمیر میں جدوجہد آزادی کو دبانے میں نہ صرف بری طرح بے بس بلکہ ناکام دکھائی دے رہی ہے بلکہ ایک مرتبہ پھر اپنی مکاری و عیاری سے کام لیتے ہوئے جیلوں میں بند ان کشمیریوں نوجوانوں پر ٹارچر شروع کر دیا ہے کہ ان سے ایک مرتبہ پھر جعلی "فالس فلیگ آپریشن" سازش کا اعتراف کروا کے اپنے آئندہ انتخابات میں جیتنے کی راہ ہموار کی جائے جس کو خود اس کے اپنے سیاستدانوں نے قبل از وقت طشت از بام کر دیا ہے۔یاد رہے کہ مودی سرکار نے اسرائیل کی طرز پر جس طرح کینیڈا کے بعد امریکا میں بھی بدنام زمانہ "را" کے ایجنٹوں کے ذریعے اپنے مخالفین کا قتل شروع کروانا شروع کیا اور اس کے فوری بعد کینیڈا کا ساتھ دیتے ہوئے امریکا سمیت دیگر یورپی ممالک نے مودی سرکار کو انتباہ کیا ہے، اس سے توجہ ہٹانے کیلئے جلد ہی ایسی خبروں کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔

مودی حکومت کیلئے یہ امر بھی بڑی پریشانی کا باعث بن چکا ہے کہ بھارت کی اب بہت سبکی ہو رہی ہے اور کشمیری عوام کی بھارتی ظلم و ستم کے خلاف شدید نفرت کا پیغام بھی پوری دنیا کو ملنا شروع ہو گیا ہے، اسی لئے کشمیر کی موجودہ صورتحال اور بھارتی فوج کی بدنامی سے اقوام عالم کی توجہ ہٹانے کیلئے بھارت جہاں سرحدوں پر کشیدگی پیدا کر کے جنگی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرے گا وہاں پاکستان میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے دہشتگردی کا ماحول پیدا کر کے چینی فوج کے ہاتھوں لداخ میں ہونے والی چھترول سے اپنی قوم کی توجہ ہٹانے کی ناکام کوشش بھی کرے گا۔

جبکہ ہمارے حکمرانوں کی بے حسی اور غیر سنجیدگی کا عالم اور ماتم یہ ہے کہ ہمارا نگران وزیر اعظم قوم کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ قائد اعظم کا اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے کا فیصلہ کوئی الہامی تو نہیں کہ جس کی تعمیل کی جائے جبکہ لیکن کہنے والا کبھی یہ تو سوچ لے کہ قوم کو یہ بھی پتہ نہیں کہ ہمارا آخری نگران وزیر اعظم کون تھا جس کو جھنڈے والی گاڑی، پرائیویٹ جہاز اور محل نما گھر میں انتہائی آرام دہ ریشمی بستر پر آرام کرنے باوجود ایسے بیان دینے کی ہمت نہ ہوئی جبکہ وہ سب نگران تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیئے گئے اور آپ کے ساتھ بھی یہی ہو گا لیکن پتا نہیں کیوں موجودہ نگرانوں کو دیکھ کر رشک کی بجائے رحم آتا ہے کیونکہ وہ روز اپنے آپ کو اور پھر ہمیں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی محنت اور لگن سے اس مقام تک پہنچے ہیں یا کچھ زیادہ عقلمند اُن کے کریئر کے گراف پر نظر دوڑا کر مسکرا کر خاموش ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اندر کی سب باتیں سمجھتے ہیں کہ اِس منزل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود میڈیا کو یہ بیان بھی جاری کیا جاتا ہے کہ میں نے اپنی خواب گاہ سے اپنے بلوچ بہن بھائیوں کے خلاف کسی بھی قسم کی طاقت کو استعمال نہ کرنے اوران کو عزت واحترام کے ساتھ ان کے گھروں میں حفاظت کے ساتھ پہنچانے کا حکم دیا تھا۔ لیکن بلوچستان سے لایا گیا نگران محوِ خواب جب ریشمی رضائی اوڑھے دنیاومافیہا سے بے خبر ایسی شاہانہ اور بے فکری کی نیند کے مزے لے رہا تھا، عین اس وقت اسلام آباد کی سڑکوں پر سخت سردی میں ان بلوچ بہن بھائیوں سے پانی والی توپ سے یخ اور گندے بدبودار پانی کی بوچھاڑ اوران پر وحشیانہ لاٹھی چارج بھی کیا جارہا تھا۔ نگران وزیراعظم کے اس شفیقانہ اور محبت بھرے حکم کے بعد یہ سارا عمل دہرایا گیا اور آخر میں سڑکوں پر کھڑی بسوں میں بٹھا کر حکم دیا گیا کہ جہاں سے یہ آئے ہیں، وہاں ان کو چھوڑ آؤ اور خبردار! راستے میں کسی کو اتارنے کی اجازت نہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ ملک میں نگران وزیراعظم کے ساتھ سینیٹ کا چیئرمین اور ملک کی اعلیٰ عدلیہ کا سربراہ بھی اس مظلوم صوبے سے ہے تو پھر بھی ایسا سلوک کیوں؟ ان حالات میں جناب سید علی گیلانی ہم آپ سے شرمندہ ہیں کہ آپ کو زندگی کے آخری دنوں اور پیرانہ سالی میں کشمیر کے مقدمے میں وکیل کی دھوکہ دہی سے یہ دن دیکھنا پڑے کہ پاکستانی جھنڈے میں سجائی میت کو ہندو درندوں نے بزورِ طاقت چھین کر نہ صرف اس پاک جھنڈے کی بے حرمتی کی بلکہ وصیت کے مطابق شہدا کے قرستان میں دفن کرنے کی بجائے عجلت میں حیدرآباد کے قبرستان میں دفن کر دیا اور آپ کے لواحقین کو پکڑ کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔

تاہم سرشاری اسے ہی کہتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے لاشے اٹھانا اور پھر آوازِ بلند سے رب کی کبریائی بیان کرنا۔ یہی ہے دین اور ہے ہی کیا! اسے کہتے ہیں اپنی نذر پوری کرنا۔ اپنے دعوے کی صداقت کو مجسم کر دینا لیکن یہ ہے بہت مشکل، توفیق پر ہے یہ۔ جانوں کا نذرانہ پیش کرنا اور رب سے التجا کرنا کہ قبول کر لیجیے ہماری قربانی..... اور پھر یقین کی منزل پر پہنچ کر پکارنا: قُلْ اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن، کہہ دو بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کیلئے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے" (سورۃ الانعام:162)

رب کیلئے خالص۔ باطل ہمیشہ سے گھمنڈی ہوتا ہے، دھوکے کا شکار۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلم حکمرانوں سے میرے رب نے تعزیت کی توفیق بھی سلب کر لی ہے۔ نیا معرکہ کربلا غزہ اور مقبوضہ کشمیر میں برپا ہے۔ آج ملائکہ بھی انسان کی تخلیق پر نازاں ہیں، جب وہ دیکھتے ہیں کہ لاشہ اٹھتا ہے تو تکبیر بلند ہوتی ہے۔ ساری دنیا دنگ، یہ کیا ہیں، کیسے لوگ ہیں؟ پتھر سے ٹینک، بندوق کا مقابلہ کرنے والے۔ کوئی تخصیص نہیں، نوجوان، معصوم بچے اور عورت مرد، سب کے سب انکارِ مجسم، نہیں مانتے۔ سنو، غور سے سنو، یہ غزوۂ ہند کی نوید ہے جس نے باطل پر لرزہ طاری کر دیا ہے۔ فاسق برہمن طاقت کے بل بوتے پر ایک بزرگ، ضعیف العمر مگر مستقل مزاج سید علی گیلانی کے انکار کو اقرار میں تبدیل نہیں کروا سکا، سیدہ آسیہ اندرابی اب بھی اپنے انکار پر ڈٹی ہوئی ہیں کیونکہ یہ سمجھ چکے ہیں کہ یہی انکار عقبیٰ و آخرت اور کشمیری قوم کی نجات کا وسیلہ ہے۔

سننے میں آیا ہے کہ کشمیر کے بارے میں مودی اور ٹرمپ میں 5/ اگست کو ہونے والی کاروائی پہلے سے طے پا چکی تھی جسے بعد ازاں ہمارے مقتدر حلقوں کو اس سے نہ صرف آگاہ کیا گیا بلکہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کو بھی اس ڈرامے میں باقاعدہ ایک کردار ادا کرنے کیلئے آمادہ کیا گیا۔ ٹرمپ کی پاک بھارت مصالحت کی آفر اچانک سامنے نہیں آئی بلکہ عمران کے امریکی دورے کے فوری بعد مودی نے آرٹیکل 370 کو ختم کر کے کشمیر کو ضم کرنے کا اعلان کیا۔ ہمارے ہاں وزیراعظم کے متضاد بیانات خود اس بات کی چغلی کھاتے رہے کہ اس مرتبہ دال میں کچھ کالا نہیں بلکہ ساری دال ہی کالی ہو گئی ہے۔ ہر جمعہ کی دوپہر ایک گھنٹے کے احتجاج کی کال اور خود کو کشمیر کا سب سے بڑا وکیل قرار دیکر پاکستانی قوم کو کشمیر میں جہاد کو کشمیریوں سے دشمنی قرار دے دیا گیا۔ قوم کی کشمیر سے توجہ ہٹانے کیلئے ملائشیا کے مہاتیر محمد کا دورہ پاکستان اور بعد ازاں خود ملائشیا اور عرب ریاستوں کے دوروں کو گویا مسئلہ کشمیر

سے منسوب کر کے پاکستانی اور کشمیری قوم کو جھوٹے دلاسے دیئے گئے اوراب مودی نے اپنے انتخابات سے قبل سپریم کورٹ کو اپنے ساتھ ملاتے ہوئے ان سے بھی اپنے فیصلے پر مہر لگوالی۔

پاکستان کے ایماء پر ملائشیا، ایران اور ترکی کے ساتھ مل کر ملائشیا میں کشمیر کیلئے مشترکہ کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا لیکن عین وقت پر سعودی عرب کا دورہ کر کے سعودی ولی عہد کی طرف سے کانفرنس پر تحفظات کے نام پر کانفرنس میں شرکت سے معذوری کا اظہار کر دیا جس کی بناء پر انتہائی مخلص دوست ترکی کے اربکان نے شدید صدمے کا اظہار کرتے ہوئے عمران کے اس رویہ کو انتہائی غیر سنجیدہ قرار دے دیا اور آج تک ترکی سے ہماری دوستی میں وہ گرمجوشی کا سلسلہ رک گیا ہے اور وہ ملائشیا جس نے پاکستان سے کشمیر کے معاملے پر دوستی نبھاتے ہوئے انڈیا سے پندرہ ارب ڈالر کے پام آئل کی تجارت کو خطرہ میں ڈال دیا، وہ بھی ہمارے اس منافقانہ کردار سے دور ہو گیا۔

یادرہے کہ مودی نے پاکستان کے انتہائی کمزور اور بزدل رویہ کی بنیاد پر ہی اپنے آقاؤں کی شہ پر سی پیک پراجیکٹ کو ناکام بنانے کیلئے ایک اور نئی چال چلتے ہوئے گلگت وبلتستان کے علاقوں پر بھی اپنا حق جتانا شروع کر دیا ہے جس کیلئے اس نے آزاد کشمیر کے علاوہ گلگت وبلتستان کے موسم کا حال اپنے قومی خبرنامے میں شامل کر کے یہ تاثر دینا شروع کر دیا کہ نہ صرف مستقبل میں ان علاقوں پر اس کا دعویٰ غیر قانونی نہیں بلکہ مقبوضہ کشمیر اب انڈیا کا اٹوٹ انگ بن چکا ہے۔

یادرہے کہ 5/اگست کو آرٹیکل 370 کو منسوخ کرنے کے بعد اس نے لداخ کی اکائی کو بھی بھارتی اٹوٹ انگ قرار دینے کا اعلان بھی اسی سازش کا حصہ تھا کہ یہاں سے گلگت وبلتستان پر حملہ کر کے سی پیک منصوبے کو سبوتاژ کیا جائے لیکن چین اس قدر بے خبر نہیں کہ وہ انڈیا کو ایسی جارحیت کی اجازت دیتے ہوئے اپنی بھاری سرمایہ کاری کو غرق ہونے کے ساتھ اس منصوبے سے منسلک "ون روڈ ون بیلٹ" کے مستقبل کو تاریک کرنے کی اجازت دیتا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ڈوکلام اور لداخ پر ہونے والی جھڑپوں نے بھارت کو ایسا سبق سکھایا ہے کہ اس کا مہابھارت بننے کا خواب کچل کر رکھ دیا ہے۔ اس وقت پاکستان کو دہشتگرد ملک قرار دینے کی سازش کے پیچھے ٹرائیکا کی یہی سازش کارفرما ہے کہ کسی طریقے سے پاکستان بھارت کو "موسٹ فیورٹ ملک" کا درجہ دینے کیلئے تیار ہو جائے لیکن کیا موجودہ امریکی سرکاری دورہ میں اچانک امریکی دوستی کی وجوہات میں پنہاں کیا وجوہات ہیں، اس کو بھی قوم کے سامنے رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔

یار کھیں! انکار جتنی شدت اختیار کرتا چلا جائے انقلاب اسی شدت سے نمودار ہوتا ہے، فرعونی اور نمرودی طاقتوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ عنائت کرتا ہے، خودداری کے نشے میں مبتلا کرتا ہے۔ ہمارا مسئلہ نتائج نہیں کارزارِ خیر وشر میں اپنا کام سرانجام دینا ہے۔ ایسے ویسے چونکہ چنانچہ لیکن ویکن کچھ نہیں، یکسر انکار۔ رب پر کامل یقین کے ساتھ باطل کا انکار... طاغوت کا انکار، جب خون رنگ لاتا ہے، تب انقلاب آتا ہے۔ کب رکا تھا معرکہ حق وباطل؟ نہیں رکے گا یہ معرکہ خیر وشر، بس غالب وہی رہیں گے جو اپنے رب کے ساتھ جڑے رہیں گے۔ پورے یقین کے ساتھ پوری سرشاری کے ساتھ۔ انکار روحِ دین ہے، روحِ بدر، احد اور کربلا کا درس ہے اور کچھ نہیں۔ طاغوت کی ہر شکل کا انکار..... یکسر انکار، کوئی مصالحت نہیں، بالکل بھی نہیں۔ قربانی ہی قربانی، سرشاری ہی سرشاری۔

بروز منگل 14 جمادی الثانی 1445ھ 26 دسمبر 2023ء

بحیرہ روم.....مفادات کا نیا میدانِ جنگ!

بحیرۂ روم کا محلِ وقوع بھی خوب ہے۔ یہ ایشیا، یورپ اور افریقا کا سنگم ہے۔ ان میں سے ہر براعظم بحیرۂ روم سے اس طور جڑا ہوا ہے کہ اُس سے ہٹ کر اہمیت گھٹ سی جاتی ہے۔ قدیم زمانوں ہی سے یہ سمندر دنیا کی بڑی طاقتوں کے درمیان زور آزمائی کا مرکز رہا ہے۔ طاقت میں اضافے کیلئے بڑی ریاستیں اس خطے کو اپنے حق میں بروئے کار لاتی رہی ہیں۔ غیر معمولی اہمیت کے حامل محلِ وقوع نے بحیرۂ روم کو ایشیا اور یورپ کے متعدد ممالک کیلئے سیاسی اور جغرافیائی اعتبار سے انتہائی اہم بنادیا ہے اور اس حوالے سے خانہ جنگی اور اغیار کی بپا کی ہوئی تباہی کے باوجود لیبیا اب بھی ایک اہم ریاست ہے۔ سرد جنگ کے شروع ہوتے ہی امریکا نے ٹرومین ڈاکٹرائن کے تحت یونان اور ترکی کو غیر معمولیت تناسب سے امداد دینا شروع کی۔ اس کا بنیادی مقصد بحیرۂ روم کے خطے میں امریکی مفادات کو زیادہ سے زیادہ تقویت بہم پہنچانا تھا، ساتھ ہی ساتھ امریکا یہ بھی چاہتا تھا کہ سرد جنگ میں کمیونسٹ بلاک کے مقابل یونان اور ترکی ہر اعتبار سے امریکی اتحادی کی حیثیت سے ابھریں۔

سرد جنگ کے دور میں بحیرۂ روم سیاسی اور سفارتی سطح پر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ امریکا و سابق سوویت یونین کے پہلو بہ پہلو یونان اور ترکی کیلئے بھی غیر معمولی اسٹریٹجک اہمیت کا حامل تھا۔ یونان اور ترکی معاہدہ نیٹو کے اہم ارکان کی حیثیت بھی ایسے نہ تھے کہ نظر انداز کر دیے جاتے ۔ دوسری طرف اسی دور میں شام اور مصر کا سابق سوویت یونین کے اتحادیوں کی حیثیت سے ابھرنا اور شام کی بندرگاہ طرطوس کے علاوہ مصر کے علاقے سیدی برانی میں فوجی اڈوں کا قیام بھی اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

سابق سوویت یونین نے 1972ء تک سیدی برانی کے فوجی اڈے کو نیٹو کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے کیلئے استعمال کیا۔ سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کے تحلیل ہو جانے کے بعد یہ خطہ امریکا اور یورپ کیلئے زیادہ اہم نہ رہا۔ وہ ان اتحادیوں پر مزید کچھ خرچ کرنے کیلئے تیار نہ تھے، سرد جنگ کے دور میں مخصوص سیاسی حالات نے امریکا کو مشرقِ وسطیٰ اور افغانستان پر توجہ مرکوز کرنے پر مجبور کیا۔ امریکا کیلئے ایک بڑا مسئلہ چین بھی تھا جو تیزی سے ابھر رہا تھا۔ بحیرۂ روم کو نظر انداز کرنے کی پالیسی نے معاملات کی نوعیت بدل دی۔ خاص طور پر چین کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ پھر یوں ہوا کہ تیل اور گیس کے نئے ذخائر دریافت ہوئے اور خطے نے دوبارہ اہمیت حاصل کرلی۔ اب قدرتی وسائل پر زیادہ سے زیادہ کنٹرول کیلئے امریکا، یورپ، روس اور علاقائی طاقتیں میدان میں ہیں۔

یہ بات تو اب بالکل واضح ہے کہ گیس کے ذخائر کی دریافت نے خطے کے ممالک کو زیادہ سرمایہ کاری کی تحریک دی ہے تاکہ سیاسی طور پر بھی پوزیشن غیر معمولی حد تک مستحکم رکھنا ناممکن نہ ہو۔ یہ سرمایہ کاری اس لیے بھی ناگزیر تھی کہ ایسا کرنے ہی سے ایک طرف تو خطے کے ممالک کو اپنی اندرونی ضرورت پوری کرنے میں مدد ملتی تھی اور دوسری طرف وہ عالمی منڈی میں مسابقت کے قابل نہ ہو سکیں۔ کسی بھی ملک میں گیس کی بڑھتی ہوئی ضرورت ہی اس امر کا تعین کرتی ہے کہ سب سے زیادہ گیس کون فراہم کرے گا۔ آج بہت سے ممالک توانائی کیلئے صرف گیس پر انحصار کرتے ہیں۔ ایسے میں طاقت بڑھانے والے عوامل میں تیل سے کہیں بڑھ کر گیس ہے۔ اس کے نتیجے میں اب سیاسی حقائق بھی تبدیل ہو چکے ہیں۔ توانائی کے معاملے میں کسی ایک ذریعے پر انحصار متعلقہ ممالک کیلئے اسٹریٹجک حقائق بھی تبدیل کر دیتے ہیں۔ لیبیا اس کی ایک واضح مثال ہے جہاں معاملات اب نظم و نسق قائم کرنے والے نظام کے ہاتھ سے باہر نکل چکے ہیں۔

تکنیکی ماہرین بتا چکے ہیں کہ بحیرۂ کے خطے میں گیس کے غیر معمولی ذخائر موجود ہیں۔ گیس کے ذخائر پر زیادہ سے زیادہ کنٹرول پانے کی خواہش نے ایک بار پھر بحیرۂ روم کو اکھاڑے کی سی شکل دے دی ہے۔ تمام بڑی طاقتیں بحیرۂ روم پر زیادہ سے زیادہ متوجہ رہنے کی پالیسی پر کاربند ہیں۔ مسابقت بڑھتی ہی جارہی ہے۔ "دی یو ایس جیولوجیکل" کے ایک سروے کے مطابق لبنان سے قبرص اور مصر تک کے چند ایک علاقوں میں گیس کے 340 کھرب مکعب فٹ کے ذخائر کی موجودگی نے اختلافات اور تنازعات کو ہوا دی ہے۔ کئی ممالک گیس کے ذخائر سے مالامال علاقوں پر اپنا حق جتانے کھڑے ہو گئے ہیں۔ تنازعات شدت اختیار کرتے جارہے ہیں، ایسے معاملات کو بڑے پیمانے کے مسلح تصادم تک پہنچنے سے روکنا تمام معاملات میں ممکن نہیں ہوتا۔

یونان نے بڑے پیمانے پر تیل اور گیس محض تلاش ہی نہیں کیا بلکہ نکالنے کا عمل بھی شروع کر دیا ہے۔ ترکی اور قبرص کے ترک نظم و نسق والے علاقے کی سمندری حدود بھی بحیرۂ روم کے خاصے وسیع علاقے تک ہیں مگر جب وہ تیل اور گیس نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تو یونان اور اُس کے زیر انتظام قبرص کا علاقہ معترض ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں تنازع شدت اختیار کرتا جارہا ہے۔ قبرص مشترکہ طور پر ترکی اور یونان کے زیر انتظام ہے اور دونوں کی مشترکہ ملکیت کا درجہ رکھتا ہے۔ بحیرۂ روم میں قبرص کی سمندری حدود میں جتنے بھی قدرتی وسائل ہیں اُن پر ترکی اور یونان کا برابری کا دعویٰ ہے۔ ترکی چاہتا ہے کہ قبرص کے زیر انتظام حصے میں تیل اور گیس تلاش کرے اور نکالے مگر یونان معترض ہے کہ وہ ایک چھوٹے جزیرے کی ملکیت کے تنازع کے باعث اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس کے نتیجے میں دونوں ممالک کے درمیان اختلافات ایک بار پھر غیر معمولی سطح پر شدت اختیار کر گئے ہیں۔ مشرقی بحیرۂ روم میں ماحول گرم تر ہوتا جارہا ہے۔ ترکی اور یونان کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی علاقے کے دیگر ممالک کیلئے بھی خطرے کی گھنٹی ہے۔ یہ تنازع اگر شدت اختیار کر گیا تو اس کے شدید منفی اثرات پورے خطے پر مرتب ہوں گے۔

ٹرکش نیشنل آئل کمپنی کا کہنا ہے کہ جدید ترکی کے قیام کی سوویں سالگرہ (2023ء) تک وہ تیل اور گیس کی طلب ملکی وسائل ہی سے پوری کرنے کی منزل تک پہنچنے کی تیاری کر رہی ہے۔ ترک وزارتِ توانائی نے بھی کہہ دیا ہے کہ تیل اور گیس کی طلب اندرونی ذرائع سے پوری کرنے کے معاملے میں پورے خطے میں اولین مقام تک پہنچنا چاہتی ہے۔ اب بنیادی سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہو گا اور اس کے نتیجے میں خطے میں سلامتی کی صورتِ حال کیا رخ اختیار کرے گی۔ مشرقی بحیرۂ روم میں بڑھتی ہوئی کشیدگی اس امر کی متقاضی ہے کہ معاملات کو خوش اسلوبی سے نمٹانے کی کوششوں کا آغاز کیا جائے مگر اب تک ایسی کوئی بھی کوشش دکھائی نہیں دی ہے۔

خطے میں تیل اور گیس کی تلاش کے کام کا نئے سرے سے جائزہ لینا ہو گا۔ لیبیا ایک اہم ملک ہے کیونکہ اس کے تیل اور گیس کے ذخائر سب سے بڑھ کر ہیں۔ اس کی سیاسی اور معاشی حالت نے خطے کے بہت سے ممالک کو پریشان کر رکھا ہے۔ لیبیا اب تک افریقا کیلئے سب سے بڑے گیٹ وے کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ بحیرہ روم کے ایسے حصے میں واقع ہے جہاں سمندر میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر اس کی دسترس میں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود لیبیائی سرزمین پر بھی تیل اور گیس کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ جسے بھی لیبیا پر تصرف حاصل ہے وہ پورے خطے پر نظر رکھ سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تیل اور گیس کے وسیع ذخائر اس کی دسترس میں ہیں۔ خطے کی اور خطے سے باہر کی تمام طاقتیں اچھی طرح جانتی ہیں کہ وہ پورے بحیرۂ روم پر اپنا تصرف قائم سکتیں مگر وہ اس خطے میں موجود اور متحرک رہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو

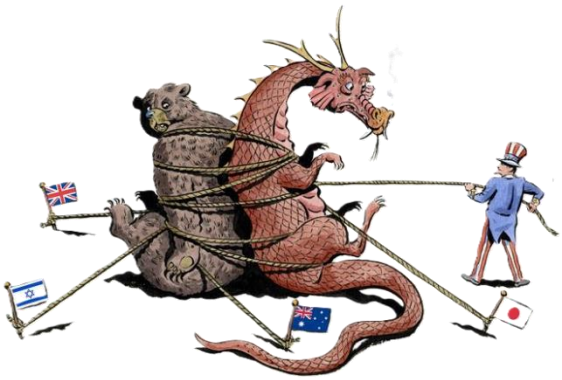

کر اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش ضرور کر رہی ہیں کہ خطے کا کوئی بھی ملک تمام وسائل پر تنہا قابض و متصرف ہو کر اجارہ داری قائم نہ کر لے۔ لیبیا کس قدر اہم ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی داخلی صورتِ حال اور قضیے میں امریکا، روس، یورپ، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مصر، قطر، یونان، الجزائر اور یونان کے زیر انتظام قبرص بھی ملوث رہے ہیں۔ روس، سعودی عرب، یونان، متحدہ عرب امارات اور مغربی ممالک لیبیا کے قضیے میں جنرل خلیفہ ہفتار کے حامی ہیں۔

ترکی اور قطر نے اقوام متحدہ کے متعین کیے ہوئے وزیر اعظم فیض سراج کی بھرپور حمایت کی ہے۔ لیبیا کی صورتحال سے واضح ہے کہ خطے میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کی موجودگی نے کل کے دشمنوں کو ایک کر دیا ہے اور جو ابھی کل تک اتحادی تھے وہ اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ وسائل کی بندر بانٹ کیلئے ہے۔ ہر فریق چاہتا ہے کہ قدرتی وسائل سے مالا مال علاقے کے سب سے بڑے حصے پر اس کا تصرف قائم ہو جائے۔ جنرل خلیفہ ہفتار کی سربراہی میں کئی ملیشیاز باضابطہ اور جائز حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ کئی طاقتیں اس کام میں خلیفہ ہفتار کی مدد کر رہی ہیں۔ یہ سب کچھ بالکل غلط ہے مگر ہو رہا ہے۔ ایک طرف تو کئی علاقائی اور یورپی مملک لیبیا میں خلیفہ ہفتار کی مالی اور عسکری امداد کر رہی ہیں اور دوسری طرف ترکی نے لیبیا کی باضابطہ حکومت سے دو بڑے معاہدے کیے ہیں۔

ایک طرف تو لیبیا میں طاقت کا خلا موجود ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خطے میں طاقت کا توازن بھی بگڑ چکا ہے۔ رہی سہی کسر تیل اور گیس کے وسیع ذخائر کی موجودگی نے پوری کر دی ہے۔ دستر خوان تیار ہے تو سب کی رال ٹپک رہی ہے۔ ایک عشرے سے بھی زائد مدت سے مشرقی بحیرۂ روم کا خطہ بیرونی قوتوں کی توجہ اور کشمکش کا مرکز رہا ہے۔ یہ صورتِ حال اب شدید تر نوعیت کی ہو گئی ہے۔ بڑی طاقتوں کی موجودگی سے خطے کے کسی ایک ملک کو تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لینے سے گریز پا رہنے کی تحریک ملے گی مگر دوسری طرف یہ خدشہ بھی تو ہے کہ یہ خطہ بڑی طاقتوں کے درمیان زور آزمائی کا میدان بنا رہے گا۔

اب ان حالات کے بعد اس خطے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لیبیا سے شام تک جنگ کا گورکھ دھندا ایک سازش ثابت ہو چکا ہے اور یہ صریحاً مفادات کیلئے رچایا جانے والا ڈرامہ ہے جس کیلئے ان قوتوں نے لاکھوں جانوں کو تہہ تیغ کر دیا اور ابھی تک اپنے خون آلود ہاتھوں پر دستانے پہن کر امن کی جھوٹا راگ بھی الاپ رہے ہیں۔ 1930ء کے عشرے میں مشہور امریکی میرین میجر جنرل اسمیڈلے بٹلر نے اس جنگ کو "گورکھ دھندے" سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس امر کی تحقیق کر رہے تھے کہ دنیا بھر میں وہ کون سے گروہ ہیں جو اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے امریکی عسکری قوت کو استعمال کرتے ہیں۔ ہیٹی میں نیشنل سٹی بینک کے مفادات سے ہونڈراس کے یونائیٹڈ فروٹ پلانٹیشنز تک، چین کے اسٹینڈرڈ آئل ایکسیس سے نکارا گوا کے براؤن برادرز تک بیشتر امور کا جائزہ لے کر میجر جنرل اسمیڈلے بٹلر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ امریکی فوج چند بڑے کاروباری اداروں کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی غرض سے کام کرتی ہے اور جس قدر بھی نقصان ہوتا ہے اس کا ازالہ امریکی عوام کی جیب سے کیا جاتا ہے۔ ان کی محنت کی کمائی پر بڑے کاروباری ادارے سیاسی سیٹ اپ کے ساتھ مل کر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ وقت اور حالات بدل چکے ہیں مگر پرانی کہاوت اب بھی مؤثر ہے کہ چیزیں جتنی زیادہ بدلتی ہیں اسی قدر وہ یکساں رہتی ہیں۔

یاد رہے کہ معمر قذافی کے آخری برسوں میں چین اور لیبیا کے تعلقات غیر معمولی حد تک پروان چڑھ گئے تھے۔ 2010ء میں دونوں ممالک کے

درمیان تجارت کا حجم 6/16 ارب ڈالر سے زائد رہا تھا۔ 2007ء میں جب امریکا نے افریقا پر توجہ دینا شروع کی تب معمر قذافی نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ چین سے تعلقات بہتر رکھنا بہت سود مند ثابت ہوا ہے۔ انہوں نے افریقا میں چین کی سرمایہ کاری کو کھل کر سراہا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ علاقائی سیاست سے دور رہ کر چینیوں نے افریقا میں کروڑوں افراد کے دل جیت لیے ہیں۔ اب صورت حال بدل چکی ہے۔ عبوری سیٹ اپ نے اپنے ابتدائی دور میں چین سے تعلقات کو سرد خانے میں رکھ دیا تھا جس کی وجہ قومی عبوری کونسل کے عہدیداروں نے یہ بتائی تھی کہ لیبیا میں تعمیر نو کے ٹھیکوں کی تقسیم میں چین کو اس بات کی سزا دی گئی تھی کہ اس نے انقلابی قوتوں کو تسلیم کرنے میں دیر لگائی۔ بعد میں اس بیان کی تردید بھی کی گئی مگر ساتھ ہی یہ بات بھی سامنے آئی کہ بہت سی چینی کمپنیاں لیبیا میں منجمد اور پھنسے ہوئے 8/18 ارب ڈالر سے زائد کے اثاثوں کی بحالی اور وصولی کا انتظار کر رہی تھیں مگر خیر ایسا نہیں ہے، اب عبوری قومی کونسل نے چینی کمپنیوں سے بات چیت کے کئی کامیاب دور مکمل کرنے کے بعد کافی حد تک معاملات کو درست سمت کی طرف موڑ دیا ہے جس سے یہ بات پایہ یقین تک پہنچ گئی ہے کہ بحیرہ روم کے ممکنہ میدان جنگ میں چین خاموش نہیں بیٹھے گا۔

ادھر بحیرہ روم میں اپنے اپنے مفادات کی جنگ لڑنے والوں کیلئے ایک اور نئی مصیبت آن کھڑی ہوئی ہے۔ یمن کے حوثی باغیوں کی جانب سے بحیرہ احمر سے گزرنے والے مال بردار تجارتی بحری جہازوں پر حملوں نے مفادات کی جنگ میں شامل ملکوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ حوثی باغی ڈرون اور راکٹوں کا استعمال کرتے ہوئے اسرائیل جانے والے تجارتی بحری جہازوں پر حملے کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ حوثی باغی یمن کے زیادہ تر حصے پر قابض ہیں اور اسرائیل کی جانب سے غزہ پر بمباری کے بعد حوثی باغیوں نے اسرائیل سے آنے اور وہاں جانے والے تجارتی جہازوں پر حملوں کا نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس صورتحال کے پیش نظر بہت سے بڑی کارگو تجارتی کمپنیاں اپنے جہازوں کا رُخ موڑنے یا انہیں روکنے پر مجبور ہو گئیں ہیں اور شنید بھی ہے کہ کارگو جہاز کے عملے نے بھی اس روٹ کو استعمال کرنے سے معذرت کر لی ہے۔

ماہرین کے مطابق اگر بحیرہ احمر میں ہونے والے حملوں سے بچانے کیلئے متبادل راستوں سے گزرنے پر مجبور کیا گیا تو پیٹرولیم مصنوعات سمیت، الیکٹرانک آلات اور ٹریینرز (جوتے) جیسی روزمرہ اشیا کی قیمتوں میں تیزی سے شدید اضافہ ہو سکتا ہے۔ بحیرہ احمر کے جنوبی سرے پر واقع آبنائے "باب المندب" میں تجارتی بحری جہازوں پر حوثیوں کی جانب سے حملوں میں اضافے کے بعد جہاز رانی کی بڑی بڑی کمپنیوں نے اپنے بہت سے جہازوں کو اس راستے سے لے جانے سے گریز کرنا شروع کر دیا ہے۔ بحیرہ احمر کا یہ راستہ عالمی معیشت کیلئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ایک اندازے کے مطابق فی الحال دنیا کی تجارت کا 12 فیصد حصہ بحیرہ احمر کے شمالی سرے پر موجود نہر سویز سے گزرتا ہے۔ اس کے ساتھ وہاں سے گزرنے والے سامان تجارت میں دنیا کے 30 فیصد کنٹینرز بھی شامل ہیں۔

حوثی باغیوں کی جانب سے حملوں میں اضافے کے بعد بحیرہ احمر کے راستے شپنگ معطل کرنے کا اعلان کرنے والی کمپنیوں میں اب تیل کی بڑی کمپنی "برٹش پٹرولیم" بھی شامل ہو گئی ہے۔ اس سے قبل "میئرسک" جیسی دنیا کی بڑی شپنگ کمپنیوں نے اس اہم تجارتی راستے سے اپنے بحری جہازوں کے سفر کو معطل کر دیا ہے اور اب برٹش پیٹرولیم، ہانگ کانگ کی "اواوسی ایل"، "ہاپک لائیڈ"، "ایم ایس سی" اور "سی ایم اے سی جی ایم" جیسی بہت سی بڑی کمپنیوں نے اب بحیرہ احمر کے ذریعے سویز نہر کے راستے اپنی سرگرمیاں بھی معطل کر دی ہیں اور اب وہ اپنے بحری جہازوں کو جنوبی افریقہ کے "کیپ آف گڈ ہوپ" کا متبادل طویل راستہ استعمال کر رہے ہیں۔

حملوں کے نتیجے میں پہلے ہی شپنگ (تجارتی مال کی ترسیل) کے اخراجات بڑھ رہے ہیں۔ اب راستے کی تبدیلی سے اخراجات میں مزید اصافہ ہو گا کیونکہ اس میں کمپنیوں کی اضافی لاگت آئے گی۔ ایک میری ٹائم سکیورٹی کمپنی کے مطابق اس علاقے میں اب بحری جہازوں پر تعینات مسلح سکیورٹی اہلکاروں کی مانگ میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے لیکن حوثیوں کی جانب سے جدید ترین اسلحے، ڈرون اور راکٹ حملوں کا مؤثر جواب دینا تو شائد ان سکیورٹی اہلکاروں کے پاس بھی ممکن نہیں تاوقتیکہ امریکا یا اس کے اتحادی اس خطے میں نئی جنگ کا آغاز کریں جو اس وقت ان کیلئے ممکن نہیں۔

گلوبل میری ٹائم رسک مینجمنٹ ایمبری نے کہا ہے کہ سفر کیلئے بیمہ (انشورنس) کی لاگت میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور اب یہ 0.015 فیصد سے بڑھ کر 0.5 فیصد ہو گیا ہے۔ بظاہر یہ تھوڑا سا فرق ہے مگر اتنا سا فرق بھی ایک تجارتی جہاز کے بحری سفر پر لاکھوں ڈالر کے اضافی اخراجات کا سبب بن رہا ہے۔ ماہرین کے مطابق بحیرہ احمر کے راستے کو ترک کرنے سے جہاز رانی، انشورنس اور دیگر بحری لاجسٹک خدمات کی لاگت میں 30 فیصد تک اضافہ ہو جائے گا اور اس اضافی اخراجات کا بار بھی امریکی اور مغربی اتحادی ملکوں کے صارفین پر ہی آئے گا۔ یاد رہے کہ اسرائیلی بمباری کے نتیجے میں اب تک 19 ہزار سے زیادہ فلسطینی ہلاک ہو چکے ہیں جن میں بچوں کی کثیر تعداد ہے۔ حوثی باغیوں کے جانب سے یہ حملے اکتوبر کے اوائل میں غزہ میں اسرائیلی وحشیانہ بمباری اور انسانیت سوز حملوں کا نتیجہ ہیں کیونکہ حوثیوں نے حماس کیلئے اپنی حمایت کا اعلان کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسرائیلی صدر کی جانب سے غیر ملکی سفیروں کے خطاب میں ایک اور جنگ بندی کا جو اشارہ کیا گیا ہے، کیا اس کے پیچھے صرف اپنے یرغمالی رہا کرانا مقصود ہے یا پھر اپنے مفادات کیلئے اپنے "کرائے کے سپاہی" نسل پرست اسرائیل کو جنگ بندی کیلئے کہا جا رہا ہے۔

بروز جمعۃ المبارک 17 جمادی الثانی 1445ھ 29 دسمبر 2023ء

"حادثہ یا اتفاق"

اسلام کو علامہ اقبال نے دورِ حاضر میں ایک ایسے ضابطہ حیات کی حیثیت سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے جس میں فکری، علمی اور عملی ہر حیثیت سے ہر دور میں انسان کی ہدائت کی صلاحیت اور توانائی موجود ہے۔ انہوں نے اسلام کو ایک زندہ نظامِ حیات کی حیثیت سے پہلے خود از روئے ایمان و علم سمجھا اور پھر اسی فکر کو اپنے فن کے وسیلے سے عام کرنے کی جہدِ مسلسل میں مصروف ہو گئے۔ شعرا کے افکار کے بارے میں عام طور پر ایک تاثر یہ ہوتا ہے کہ ان میں کشش تو ہوتی ہے لیکن زندگی کے حقائق کا مقابلہ کرنے کی تاب و توانائی عطا کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ علامہ اقبال نے اس کلئے کو غلط ثابت کر دیا۔ وہ نہ صرف بہت بڑے شاعر تھے بلکہ بہت بلند سطح کے مفکر بھی تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی عطا کہ انہوں نے اپنے فکر و فن کو کلیتاً اپنے ایمان کی توانائی کے تابع کر لیا تھا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں پاکستان کے قیام کا واقعہ غیر معمولی اہمیت کا واقعہ ہے اور قیامِ پاکستان میں فکرِ اقبال کی توانائی اور قائداعظم کی قیادت کی صداقت اور دیانت نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن وہ آزمائشیں ان کیلئے پست ہمتی کا نہیں بلکہ عزمِ تازہ پیدا کرنے کا وسیلہ بنتی چلی گئیں۔ مسلمانوں میں دینی شعور بیدار رکھنے میں علماء، اہل علم و دانش اور سیاسی رہنماؤں سمیت مؤثر اور مثبت کردار سب نے ادا کیا ہے لیکن منزل کا تعین کرنے اور پھر جذبہ ایمان کے تحت وحدت فکر و عمل کے وسیلے سے اسے حاصل کر لینے میں فکرِ اقبال کا بڑا کلیدی کردار ہے۔ اقبال جہاں بہت بڑے شاعر اور اسی سطح کے مفکر تھے وہاں ان کے خطبات نے خصوصاً خطباتِ مدارس نے ہماری فکری بیداری کی تاریخ میں بہت مؤثر کردار ادا کیا ہے، اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"۔ اقبال کی قلبی بے قراری کا ان کے فکر و فن میں بھرپور اظہار موجود ہے!

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

ان کی بے چینی محدود نوعیت کی نہیں تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بھرپور مادی ارتقاء کے مراحل طے کرنے والا انسان اس حقیقی روشنی سے محروم ہے جو اسے رازِ حیات سے آشنا کرتی ہے۔

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
انہی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

دورِ حاضر کے انسان کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ:

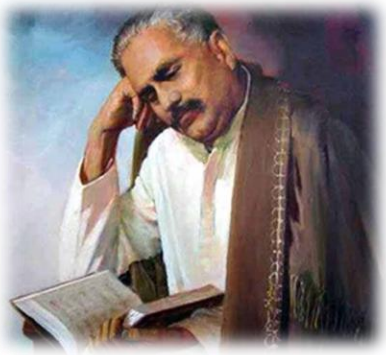

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار

انساں کو حیران بنانے کا طریقہ

ایمانی توانائی نے اقبال کو ساری انسانیت کیلئے فوز و فلاح کا اندازِ فکر عطا کیا تھا لیکن اس کیلئے ایک عملی مثال کی بھی ضرورت تھی اور وہ از روئے ایمان یہ سمجھتے تھے کہ انسانیت کو اسلام کے سوا کہیں اور امن و سلامتی نہیں مل سکتی، اسی لئے دورِ حاضر میں ایک ایسے نظامِ اجتماعی کے قیام کے آرزومند تھے جو بلا مذہب و ملت ساری انسانیت کیلئے امن مقصد بنی کیونکہ انہیں اس اس مقصد کیلئے برصغیر میں مسلمانوں کی ایک آزاد و خود مختار حکومت کے قیام کی آرزو ان کا وسلامتی کا وسیلہ بن جائے اور حقیقت ادراک تھا لیکن اسلام کی وحدت خیر قوت کا بہترین اظہار برصغیر میں ہوا ہے۔ اقبال کی فکر و فن کی بنیاد کیونکہ ایمانی توانائی پر تھی اس لئے اس میں بڑا گہرا داخلی ربط پایا جاتا ہے۔ وہ احترامِ آدمیت کے علمبردار ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امکانی طور پر ہر انسان کو محض آزاد ہی "قابلِ تکریم" پیدا کیا ۔ اس اصول کے تحت وحدتِ نسلِ انسانی پر ایمان ضروری ہو جاتا ہے اور مردہ فکر و عمل جو اس وحدت کے برعکس ہیں وہ باطل طاقتوں کے مقاصد کی تکمیل کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

علامہ اقبال محض جذباتی بنیاد پر اسلام سے وابستہ نہیں، وہ وابستگی گہرے علم اور تاریخی شعور کی بنیادوں پر ہے۔ علامہ اقبال نے بالکل درست کہا ہے کہ اسلام مذہب نہیں ہے بلکہ ایک ریاست ہے اور غور کیا جائے تو یہ بنیادی اہمیت کی بات ہے۔ دنیا کے دیگر مذاہب کے ماننے والے زندگی کے سارے معاملات کو اپنے مذہبی عقائد سے الگ رکھتے ہیں، یہ ان کی مجبوری ہے۔ ان افکار و اعمال سے جن کو وہ مذہب کی بنیاد سمجھتے ہیں، ان لوگوں کو زندگی کے معاملات اور مسائل میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی، اس لئے انہوں نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے، مذہب الگ اور ریاست الگ.....! یہ روش غیر مسلمانوں کیلئے درست ہو سکتی ہے لیکن مسلمانوں کیلئے ہرگز درست نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہادیٔ برحق رسول کرم ﷺ نے اسلام کو ایک مکمل ریاستی نظام کی صورت میں عطا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں پیشوائیت نہیں ہے کیونکہ جہاں پیشوائیت ہو گی وہاں سیکولرازم لازمی طور پر آئے گا۔

معاشرتی زندگی نظامِ حکومت کے بغیر بسر نہیں ہو سکتی۔ قائداعظم نے جب یہ کہا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اسلام میں مذہبی پیشوائیت کا الگ کوئی تصور نہیں ہے بلکہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہونے کی حیثیت سے ایک نظامِ ریاست بھی ہے۔ یہ حقیقت اسلام کے نظام کی تفہیم پر مبنی ہے اور اقبال کے خطبات اور ان کی شاعری دونوں میں اس کی بھرپور جھلک موجود ہے۔ قائداعظم نے علامہ اقبال کیلئے "مائی گائیڈ اینڈ فلاسفر" کے جو الفاظ استعمال کئے تھے وہ حقیقی مفہوم رکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہم سب پر چند خصوصی ذمہ داریاں عائد ہو گئیں ہیں۔ قیامِ پاکستان کوئی تاریخ کا +6 "حادثہ یا اتفاق" نہیں ہے۔ اس ملک کا قیام دورِ حاضر میں حقیقی معنوں میں عالمگیر سطح اسلام کے احیاء کی علامت ہے۔

یہی ہماری توانائی بھی ہے اور یہی ہمارے مسائل کا سبب بھی۔ ہمیں اس حقیقت کو اور اس کے پس منظر میں اپنی ذمہ داریوں کو نہ صرف سمجھنا بلکہ ہمہ وقت ہر سطح پر اپنے پیشِ نظر بھی رکھنا چاہئے۔ ہمارے فکری، علمی اور تاریخی اثاثے بہت ہیں۔ ایسی دولت دنیا میں کسی دوسری قوم کو میسر نہیں اور اس دولت کی خصوصیت میں ہے کہ وہ تاریخ کا حصہ نہیں، ہر دور میں ہمارے فکر و عمل کیلئے مہمیز کا کام کر سکتی ہے۔ خود پاکستان کا قیام، اس کا استحکام اور اس کی علاقائی اور جغرافیائی اہمیت اس حقیقت کا سب سے بڑا واضح ثبوت ہے۔

علامہ اقبال کا یومِ پیدائش یا یومِ وفات ہمارے لئے ایک محض رسم کی ادائیگی کی صورت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ رسم بھی اہم ہوتی ہے کیونکہ وہ حقیقت تک پہنچنے میں وسیلہ بنتی ہے لیکن یہ بات ہمارے لئے توجہ کا سبب بننی چاہئے کہ قائد اعظم، علامہ اقبال اور دیگر زعماء کی یادیں رسم کیوں بن رہی ہیں۔ جس طرح ہم اپنی جسمانی صحت کا خیال رکھتے ہیں ہمہ وقت اسی طرح ہمیں اپنی "ایمانی صحت" کا خیال بھی رکھنا چاہئے، کیونکہ ایمان کے بغیر انسان اور حیوان کے جسدِ خاکی ایک جیسے ہوتے ہیں۔

رہے نام میرے رب کا جس نے عزت کا معیار تقویٰ میں رکھا ہے!

یہ افسردہ اور پریشان بابا اقبال کہاں یاد آگئے!

آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک

بروز اتوار 19 جمادی الثانی 1445ھ 31 دسمبر 2023ء

مجرم کون؟

جنگوں میں اب تک کتنے انسان ہلاک ہوئے ہیں، سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں اور نہ معلوم ہو سکتا ہے لیکن ماہرین کے محتاط اندازوں کے مطابق تقریباً پندرہ ارب انسان جنگوں کی نذر ہو چکے ہیں جن میں 81 کروڑ مذہب کے نام پر لڑی جانے والی جنگوں میں مارے گئے۔ کسی ایک جنگ میں مارے جانے والوں کی تعداد 7 کروڑ 31 لاکھ 80 ہزار (کچھ ذرائع کے مطابق 5 کروڑ) ہے جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران ہلاک ہوئے جن میں 4 کروڑ 90 لاکھ سویلین لوگ بھی شامل تھے۔ یہ تھے دنیا کی بدترین جنگ کے اعداد و شمار! اس جنگ کے بعد ہی یورپ نے لڑنے سے توبہ کی اور اپنے تمام مسائل مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کا عہد کیا۔ ہٹلر کی شروع کی ہوئی جنگ جو دو اتحادیوں کے درمیان لڑی گئی تھی نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایک فریق "ایکسز الائنس" کہلاتا تھا جس میں نمایاں ممالک اٹلی، جرمنی اور جاپان تھے، ان کو ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ، یوگوسلاویہ اور فن لینڈ وغیرہ کی حمائت حاصل تھی جبکہ ان کے مدمقابل "الائنس" تھے جن میں اہم ممالک برطانیہ، سوویت یونین اور امریکا تھے جبکہ انہیں چین، پولینڈ اور فرانس کی حمائت حاصل تھی۔ اس جنگ میں شائد ہی دنیا کا کوئی خطہ کوئی قوم کوئی خاندان متاثر ہونے سے بچا ہو! اس میں مسلمان، یہودی، عیسائی، بڈھسٹ، ہندو، سکھ اور کیمونسٹ بھی مارے گئے لیکن نازی افواج کے ہاتھوں یہودیوں کے قتلِ عام کو "ہولوکاسٹ" کا نام دیا گیا۔

ہولوکاسٹ قدیم یونانی زبان سے لیا گیا جس کا مفہوم تھا "اللہ کی راہ میں کی جانے والی قربانی" ایسی قربانی جسے مکمل طور جلا دیا جائے، لیکن بعد میں وسیع پیمانے ہونے والی انسانی قتل و غارت کو بھی ہولوکاسٹ کہا جانے لگا۔ انسانی تباہی کیلئے یہ اصطلاح پہلی بار 1190ء میں استعمال ہوئی جب عیسائیوں کے ہاتھوں یہودیوں کا قتلِ عام ہوا تھا۔ بعد کے چار سو سال تک یہ اصطلاح کسی بھی مذہب، رنگ و نسل کے انسانوں کی وسیع پیمانے پر قتل و غارت کیلئے استعمال ہوتی رہی حتیٰ کہ جنگ عظیم دوم میں کسی بھی مذہب، رنگ و نسل کے ہلاک ہونے والوں کیلئے استعمال کی گئی لیکن 1960ء سے یہ صرف اور صرف یہودیوں کے قتلِ عام کیلئے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ اب ہولوکاسٹ کا مطلب "جنگِ عظیم دوم میں نازی افواج کے ہاتھوں 60 لاکھ یہودیوں کا قتلِ عام" اور اس کو ماننا ہر آدمی کیلئے فرض قرار دیا گیا۔ مغرب میں اس کے خلاف بات کرنا قابلِ تعزیر جرم ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مغرب میں انبیاء جیسی مقدس ترین ہستیوں کے خلاف بولنا، ان کو نہ ماننا اور ان کی توہین کیلئے کارٹون بنانا قابلِ تعزیر جرم نہیں ہے بلکہ انبیاء کے گستاخوں کو سرکاری تحفظ دیا جاتا ہے جبکہ ہولوکاسٹ کے گستاخوں کو جیل بھیج دیا جاتا ہے۔

یہودی کہتے ہیں کہ نازی افواج نے یورپ میں 59 لاکھ 33 ہزار 990 یہودیوں کا قتلِ عام کیا۔ جنگِ عظیم دوم سے پہلے ان کی تعداد 88 لاکھ 61 ہزار 800 تھی اور جنگ کے اختتام پر صرف 29 لاکھ 27 ہزار 900 رہ گئی تھی یعنی ان کی 67 فیصد نسل کو قتل کر دیا گیا تھا۔ پولینڈ میں 30 لاکھ، یوکرائن میں 9 لاکھ، ہنگری میں 4 لاکھ 50 ہزار، رومانیہ میں 3 لاکھ، بیلارس میں 2 لاکھ 45 ہزار، بالٹک ریاستوں میں 2 لاکھ 28 ہزار، جرمنی اور آسٹریا میں 2 لاکھ دس ہزار، ہالینڈ میں ایک لاکھ پانچ ہزار، روس میں ایک لاکھ 7 ہزار، فرانس میں 90 ہزار، بوہمیا اور موراویہ میں 80 ہزار، سلواکیہ میں 75 ہزار، یونان میں 54 ہزار، بلجیم میں 40 ہزار، یوگوسلاویہ میں 26 ہزار، بلغاریہ میں 14 ہزار، اٹلی میں 8 ہزار، لکسمبرگ میں ایک ہزار، ناروے میں 890، ڈنمارک میں 52 اور فن لینڈ میں 22 یہودی مارے گئے۔ وسیع پیمانے پر ہلاکت کیلئے گیس چیمبرز کا استعمال کیا گیا۔ نازی افواج انہیں یورپ بھر سے ٹرینوں کے ذریعے خصوصی طور پر بنائے گئے گیس چیمبرز میں لاتے تھے جہاں کام کرنے کے قابل لوگوں کو کیمپوں میں بھیج دیا جاتا تھا اور بقیہ کو گیس چیمبرز کے

حوالے کر دیا جاتا تھا، جب چیمبر ان افراد سے بھر جاتا تو گیس چھوڑ دی جاتی تھی جہاں بیس منٹ کے اندر اندر ہزار بارہ سو یہودی مر جاتے تھے۔ مرنے کے بعد اگر کسی کے دانت سونے کے ہوتے تو نکال لئے جاتے تھے، کانوں میں زیور ہوتا تو کاٹ دیئے جاتے اس طرح آٹھ مختلف گیس چیمبروں میں 44 لاکھ 65 ہزار افراد کو زہریلی گیس سے مارا گیا۔ ان اعداد و شمار کے حقائق کے بارے پوچھنا بھی اب جرم بن کر رہ گیا ہے، بس اس پر من و عن یقین کرنا قانون بنا دیا گیا ہے۔

قتل چاہے ایک آدمی کا ہو یا چھ ملین یہودیوں کا، قابلِ مذمت اور بدترین جرم ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہٹلر مسلمان تھا، کیا نازی افواج مسلمان تھیں؟؟ کیا یہودیوں کا قتل عام کسی مسلمان ملک میں ہوا یا کسی اسلامی دورِ حکومت میں ہوا؟ کیا دوسری جنگِ عظیم مسلمانوں نے شروع کی تھی یا ان کی وجہ سے شروع ہوئی تھی یا ایک طرف مسلمان فوجیں تھیں اور دوسری طرف غیر مسلم؟ جب نہ ہٹلر مسلمان تھا، نہ ہی نازی افواج مسلمان تھیں، نہ ہی یہودیوں کا قتلِ عام کسی مسلمان ملک میں ہوا، نہ ہی کسی اسلامی دورِ حکومت میں ہوا، نہ ہی دوسری جنگِ عظیم مسلمانوں نے شروع کی اور نہ ہی مسلمانوں کی وجہ سے دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی اور نہ مسلمان فوجیں فریق تھیں تو پھر مسلمانوں کو 60 لاکھ یہودیوں کے قتل کی سزا کیوں دی جا رہی ہے؟؟؟ جنہوں نے دوسری جنگِ عظیم شروع کی تھی، جنہوں نے 60 لاکھ یہودیوں کو قتل کیا، سزا بھی انہیں کو ملنی چاہئے نہ کہ مسلمانوں کو!

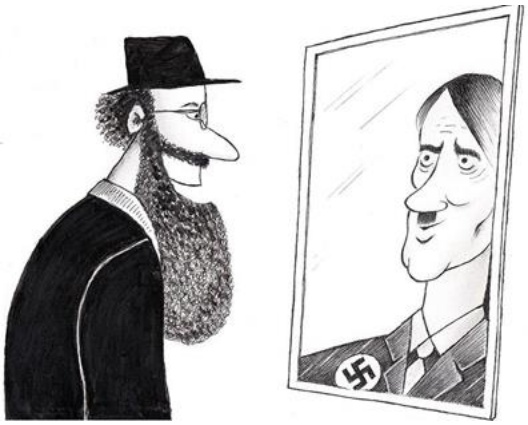

اگر یاد ہو تو عالمِ اسلام سے کی جانے والی تقریر میں باراک اوباما نے ہولوکاسٹ پر اپنے ایمان کی تجدید کرتے ہوئے کہا "ہولوکاسٹ حقیقت ہے 60 لاکھ یہودی قتل کئے گئے "ضرور ہوئے ہوں گے (اس تعداد کو دنیا کی اکثریت درست نہیں مانتی) لیکن قتل تو مسلمانوں نے نہیں کیا۔ میں نے اس وقت بھی یاد کرایا تھا کہ اگر امریکا اور مغرب کو یہودیوں کے قتلِ عام کا دکھ ہے اور اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کریں، ہزار بار کریں لیکن مسلمانوں کی قیمت پر کیوں؟ اگر ان کیلئے الگ وطن نا گزیر تھا یا انہیں ایک الگ دینا ہی گناہوں کا کفارہ ہے تو پھر جہاں جس قوم نے ان کو قتل کیا وہی اس کا ازالہ بھی کرے جہاں ان پر ظلم ہوا، جس سرزمین پر انہیں قتل کیا گیا وہیں پر ان کو ایک الگ وطن دیا جائے نہ کہ انبیاء کی مقدس سرزمین فلسطین میں۔ اس وقت 104 ملکوں میں یہودیوں کی کل تعداد ایک کروڑ 46 لاکھ ہے جس میں 56 لاکھ یہودی اسرائیل میں رہتے ہیں۔ اگر امریکا اور مغرب کو یہودیوں سے اتنی ہمدردی ہے تو قصر سفید کے فراعین نے انہیں امریکا میں کیوں نہیں بسایا، کینیڈا میں آباد کیوں نہیں کیا جاتا، آسٹریلیا میں کیوں نہیں بھیجا جاتا؟ ان ملکوں اور یورپ میں تو ویسے ہیں افرادی قوت کی قلت ہے اور یہودیوں کی کل تعداد سے سینکڑوں گنا زیادہ لوگ ان ملکوں میں بآسانی کھپ سکتے ہیں، فلسطین کو تو چھوڑے ہوئے انہیں دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔

عیسائیوں کے ہاتھوں یہودیوں کا یہ کوئی پہلا قتلِ عام نہیں تھا جس پر اتنا واویلا مچایا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے ہی ان دو الہامی مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان مذہب کے نام پر لڑائیاں شروع ہو گئیں تھیں۔ پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قریبی ساتھی اور پیروکار یہودیوں کے ہاتھوں مارے گئے اور بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر لٹکانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں نے قتل کیا جب کہ یہ تو اسلام ہے جس نے یہ گواہی دی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا اور

یہودی اپنے ناپاک عزائم میں ناکام رہے، نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے یہودیوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھا بلکہ یہودیوں کی طرف سے حضرت مریم علیہ السلام پر لگائے گئے بہتان کی بھی نفی کی اور ان کی پاکیزگی اور پاک دامنی کی گواہی دی۔

اسلام کے اتنے بڑے احسان کے بدلے عیسائیوں نے مسلمانوں پر پہلے دو صلیبی جنگیں مسلط کیں اور پھر ان سے ان کا قبلۂ اوّل بیت المقدس یروشلم چھیننے میں یہودیوں کی پشت پناہی کی گئی۔ آج جس سفاکانہ انداز میں اسرائیل کی حمائت کی جارہی ہے تو کل گریٹر اسرائیل بھی ناگزیر ہو جائے گا۔ یہ تو خلیفہ ثانی حضرت عمر ہی تھے جنہوں نے یہودیوں کو پانچ سو سال کے بعد یروشلم میں آزادانہ عبادت کرنے اور رہنے کی اجازت دی تھی۔ عیسائیوں نے جب یہودیوں پر یورپ کی زمین تنگ کر دی تھی تو یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے انہیں اسپین میں پناہ دی تھی۔ اگر مسلمان انہیں پناہ نہ دیتے تو یہ آج اپنے لئے ایک الگ وطن بنانے کی بجائے دنیا سے ہی ناپید ہو چکے ہوتے۔ مجرم کون اور سزا کس کو مل رہی ہے!!! مسلم دشمنی اور کیا کیا کرشمے دکھائے گی؟؟؟

بروز سوموار 20 جمادی الثانی 1445ھ یکم جنوری 2024ء

اقبال اور پاکستان

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ:

"میں روزانہ صبح تلاوت قرآن کیا کرتا تھا..... میرے والد صاحب شیخ نور محمد اکثر میرے پاس سے گزرتے تھے۔ ایک دن رک کر مجھے فرمانے لگے؟ اقبال کسی دن تمہیں بتاؤں گا کہ قرآن کیسے پڑھتے ہیں؟ اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے اور میں حیران بیٹھا سوچنے لگا کہ میں بھی تو قرآن پڑھ رہا ہوں۔ کچھ دن بعد میں اسی طرح تلاوت کر رہا تھا کہ والد صاحب میرے پاس رکے، جب میں خاموش ہوا تو مجھے کہنے لگے: جب قرآن پڑھو تو یوں سمجھو جیسے یہ اللہ نے صرف تمہارے لئے بھیجا ہے، اللہ پاک براہِ راست تمہیں خطاب کر رہا ہے اور تمہیں اپنی زبان سے احکامات دے رہا ہے۔ جب اس کیفیت کے ساتھ قرآن پڑھو گے کہ قرآن کا مخاطب اللہ ہے تو پھر تمہیں اس کی لذت ملے گی اور فہم بھی حاصل ہو گا۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس دن کے بعد قرآن کی جو لذت اور سرور مجھے ملا وہ اس سے پہلے نہیں ملا تھا۔ تب اقبال نے کہا:

سجدہ عشق ہو تو عبادت میں مزا آتا ہے
خالی سجدوں میں دنیا ہی بسا کرتی ہے
لوگ سمجھتے ہیں بس اک فرض ہی ادا کرنا ہے
ایسا لگتا ہے جیسے کوئی قرض لیا ہو رب سے
تیرے سجدے تجھے کہیں کافر ہی نہ کر دیں اقبال
تو سوچتا کہیں اور ہے اور جھکتا کہیں اور ہے

علامہ محمد اقبال (1877ء1938) برصغیر کی ملتِ اسلامیہ کے سب سے عظیم مفکر اور شاعرِ اسلام ہیں۔ انہوں نے انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر کے جس ماحول میں آنکھ کھولی، اسلامی ممالک بہت حد تک استعماری قوتوں کے نخچیر بن چکے تھے۔ ترکان عثمانی اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروفِ کار تھے مگر بالآخر وہ بھی جنگِ عظیم اوّل کے بعد اپنی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکے اور یوں مسلم اتحاد کی سیاسی زنجیر کی آخری کڑی بھی اپنے ضعف کے باعث ٹوٹ گئی۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا

عالمِ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی اس صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اقبال نے جس مخصوص اسلوب اور تجزیے کے بعد راہِ عمل تجویز کی، اس کی تفصیلات "اسرارِ خودی" (1915ء) اور "رموزِ بیخودی" (1918ء) میں نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ انہوں نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے مسلمانوں میں حریت، بیداری اور جہاد کی فکر پیدا کرنے کیلئے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں خودی اور بیخودی کے تصور کو پیش کیا۔ احساسِ

خودی کے ذریعہ وہ فرد کو مخاطب کرتے ہیں اور اس میں ایمان و عمل کی سرشاری پیدا کرتے ہیں۔ تصورِ بیخودی میں وہ فرد سے آگے بڑھ کر کتاب ملت بیضا کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔ اسرارِ خودی کی ابتدا ہی میں اقبال یوں گویا ہیں:

ساقیا برخیز و مے در جام کن
محو از دل کاوشِ ایام کن
می کند اندیشہ را ہشیار تر
دیدۂ بیدار را بیدار تر
اعتبار کوہ بخشد کاہ را
قوت شیر اں دہد روباہ را
خاک او اوجِ ثریا میدہد
قطرہ را پہنائے دریا میدہد
خامشی را شورشِ محشر کنند
پائے کبک از خونِ باز احمر کند

"اے ساقی! اٹھ اور میرے پیالے میں وہ شراب انڈیل دے جو دل سے زمانے کی تکالیف کو دور کر دے۔
ایسی شراب فکر میں اور تیزی پیدا کر دیتی ہے اور جو آنکھ پہلے ہی بیدار ہو، اُس میں مزید بیداری پیدا کر دیتی ہے۔
یہ تنکوں کو پہاڑ کا وقار عطا کرتی ہے اور لومڑی کو شیروں کی طاقت بخشتی ہے۔
اس کی خاک کو ثریا کی بلندی بخشتی ہے اور قطرے کو سمندر کی وسعت دیتی ہے۔
یہ خاموشی کو قیامت کے شور میں بدل دیتی ہے اور چکور کے پنجے کو باز سے لڑا دیتی ہے"۔

یوں "اسرارِ رموز" کا مطالعہ کریں تو اس کا مجموعی تاثر فرد کو غلامانہ ذہنیت سے چھٹکارا دلا کر اس میں ایک نشۂ جہاد پیدا کرنا ہے اور اسے عزم و یقین کی دولت سے مالا مال کرنا ہے۔ فکرِ اقبال کی اس عسکریت اور جہادی روح کا یہ نتیجہ نکلا کہ جنگِ عظیم دوم کے بعد مسلمانوں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا اور پھر مراکش سے ملائیشیا تک آزادی کی ایک لہر پیدا ہو گئی جس کیلئے اقبال نے بجا طور پر یہ پیغام دیا تھا:

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زبان تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پڑھ پھر صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

علامہ اقبال کی شعری اور نثری تخلیقات کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے عروقِ مردہ میں تازہ خون کی گردش دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے قرآنِ مجید کا جس گہرائی سے مطالعہ کیا اور پیغمبرِ اسلام ﷺ سے جس محبت و عقیدت کا والہانہ اظہار کیا ہے، اس کے باعث وہ اس رمز سے آشنا ہو چکے تھے کہ مسلمان کی زندگی اعلاے کلمۃ الحق اور غلبۂ دین کیلئے ہے جس کیلئے جِہاد فی سبیل اللہ کا شعور ناگزیر ہے۔ یہ جِہاد اپنے اوّل قدم پر دعوتی، علمی، لسانی، مالی اور قلمی نوعیت کا ہے مگر اس کا ایک پہلو جانی بھی ہے جس کا منتہیٰ شہادت ہے۔ آپؐ کی بعثت و نبوت کے ابتدائی تیرہ برس مکہ مکرمہ میں گزرے، ان برسوں میں جہاد کی نوعیت دعوتی اور تبلیغی ہے اور جہاد باللسان، جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کی صورتیں سامنے آتی ہیں مگر جب ہجرت کے بعد آپؐ مدینہ تشریف لے جاتے ہیں تو پھر فتنے کی سرکوبی اور نوزائیدہ اسلامی ریاست کے دفاع کیلئے مختلف قسم کے دفاعی، انتظامی، جنگی اور عسکری انتظامات بھی کیے۔ اسلامی ریاست کے استحکام اور اعلاے کلمۃ الحق کیلئے کی جانے والی جدوجہد خواہ اس کا تعلق کسی بھی پہلو سے ہو، جہاد کہلائے گی۔ کیا تاریخِ عالم میں مسلمانوں کے علاوہ کوئی ایسی تہذیب موجود ہے جس کے ہاں تعلیم و تدریس، تزکیۂ نفس اور زیر دستوں، غلاموں اور محروموں کی مدد کو بھی جہاد قرار دیا گیا ہو۔ اسلام میں تلوار اور تیر و تفنگ کا استعمال محض جوع الارض اور مالِ غنیمت حاصل کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ ریاستی استحکام، دعوتی نظام اور امنِ عام کے برقرار رکھنے کیلئے ہے۔ اقبال کتاب و سنت کے گہرے اِدراک کے باعث جہاد و قتال کی تمام ضرورتوں کو بخوبی سمجھتے تھے اور جس کیلئے وہ مسلمانوں کی الگ ایسی ریاست کا وجود ضروری سمجھتے تھے جو "مدینہ ثانی" کا پرتو ہو۔

علامہ اقبال نے ملّتِ اسلامیہ کیلئے جو سب سے بڑا کارنامہ سرانجام دیا وہ اس کے ملی تشخص کی حفاظت اور احساس کو بیدار کرنا ہے۔ وہ ہندوؤں کی چال کو، جو متحدہ قومیت کی صورت میں پروان چڑھ رہی تھی، بھانپ گئے تھے، چنانچہ 1908ء میں وطنیت کے عنوان سے مشہور نظم میں وہ فرماتے ہیں:

اس عہد میں مے اور ہے جام اور ہے
ساقی نے بناء کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
نظم وطنیت (وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے (صفحہ 160 بانگ درا)

وہ اپنے مشہور خطبہ الہ آباد میں فرماتے ہیں:

اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزوِ ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف

سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کرتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شائد ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے، اس لئے کہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کار فرما ہے"۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں: لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کیلئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے، اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا..... یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز اور متمیز تہذیب کے حامل ہو سکیں" ۔"کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی نصب العین کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کریں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا؟"

"میں نہیں کہتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کیلئے بھی کسی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کیلئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطن یا قومی اصول پر ہو جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرنے پر مبنی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانانِ ہند کے سامنے ہے"..... مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیہ کے ماتحت اس ملک میں مسلمانوں کو آزادانہ نشو و نما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کیلئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی نہیں دریغ کریں گے"۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم ریاست قائم کرنا پڑے گی"۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے"۔ "اسلامی قانون کے طویل اور گہرے مطالعے کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر اس نظامِ قانون کو عملی جامہ پہنایا جائے تو کم از کم ہر فرد کے معاشی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے لیکن اس ملک میں شریعت اسلامی نظام کا نفاذ اور اس کی توسیع ایک آزاد مسلم مملکت یا چند مملکتوں کے بغیر ناممکن نہیں تو دوسری طرف صرف خانہ جنگی ہے"۔

"میری رائے میں اسلام کا مستقبل بہت کچھ پنجاب کے کسانوں کی آزادی پر انحصار کرتا ہے تو پھر نوجوانوں کی حرارت کو مذہب کی حرارت کے ساتھ مل جانا چاہئے تاکہ زندگی کی دمک بڑھے اور ہماری آئندہ نسلوں کیلئے عمل کی ایک نئی دنیا پیدا ہو"۔ "ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب موجود ہیں، اس کے ساتھ ہی اگر مسلمانوں کی معاشی پستی اور ان کی بے حد مقروضیت (بالخصوص پنجاب میں) اور بعض صوبوں میں ان کی اکثریتوں کا خیال کر لیا جائے تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ مسلمان جداگانہ انتخابات کیلئے کیوں مظطرب ہیں"۔ وہ خطبہ ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
"ایک سبق جو میں نے تاریخِ اسلام کے مطالعے سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ صرف اسلام ہی تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان، اگر آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع

ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا"۔ "میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں"۔ "مسلم ہندوستان کیلئے ان مسائل کے حل کو ممکن بنانے کی خاطر ملک کی تقسیم کے ذریعے سے بڑی مسلم اکثریت کے واسطے ایک یا زیادہ مسلم مملکتوں کی فراہمی ضروری ہے۔ کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے مطالبے کا وقت آگیا ہے، جواہر لال نہرو کی ملحد اشتراکیت کا شائد یہی بہتر جواب ہے جو آپ دے سکتے ہیں"۔ "پس یہ امر کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں"۔

اجلاس منعقد لاہور 21 مارچ 1931ء میں نیشلزم پر ان کا تبصرہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے!
"میں نیشلزم کے خلاف ہوں جیسا کہ یورپ میں اس سے مفہوم لیا جاتا ہے، اس لئے نہیں کہ اس تخیل کو ہندوستان میں نشو و نما پانے کی اجازت دے دی گئی تو اس سے مسلمانوں کو کم مادی فائدہ پہنچے گا۔ میں اس لئے اس کے خلاف ہوں کہ میں اس کے اندر ملحدانہ مادیت کے جراثیم دیکھتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ جدید دور کی انسانیت کیلئے سب سے بڑا خطرہ ہے، حب الوطنی صحیح طور پر ایک قدرتی نیکی ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں وہ خاص درجہ رکھتی ہے تاہم جو چیز دراصل اہمیت رکھتی ہے وہ انسان کا عقیدہ ہے، اس کی تہذیب ہے، اس کی تاریخی روایات ہیں، یہی وہ چیزیں ہیں کہ جن کیلئے انسان کو زندہ رہنا چاہئے اور جس کیلئے انسان کو اپنی جان تک قربان کر دینی چاہئے"۔

"ہمارا مطمع نظر بالکل صاف ہے اور وہ یہ ہے کہ آنے والے دستور میں اسلام کیلئے ایسی پوزیشن حاصل کریں جو اسے ملک میں اس کی قسمت کی تکمیل کے مواقع بہم پہنچائے۔ اس مطمح نظر کی روشنی میں قوم کی ترقی کرنے والی قوتوں کا جگانے اور ان قوتوں کو جو اب تک خوابیدہ پڑی ہیں منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ زندگی کی روشنی دوسروں سے قرض نہیں لی جاسکتی، اسے خود اپنی روح کے اندر روشن کرنے کی ضرورت ہے"۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "ملت فیضان پر اک نظر" میں حضرت علامہ اقبال نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت اس طرح کی:
"مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے، ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان، نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی ہے بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جنابِ رسالت مآب ﷺ نے قائم فرمائی تھی، اس لئے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی سب کیلئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے..... اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائص مخصوصہ و شمائل پر منحصر نہیں ہے، غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے۔"

"اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں، بالفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے، اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسی جوں ہی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔

حضرت علامہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نئی نسل کیلئے تعلیمی سہولتوں کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہم کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آبِ حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو بوجہ کسی اکتنازی یا اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا اور گردوپیش کی ان قوموں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائے گا جس میں اس کی بہ نسبت زیادہ قوت و جان ہو گی۔"

آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے فروری 1931ء کے اجلاس میں خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"جس دین کے تم علمبردار ہو وہ فرد کی قدر و قیمت تسلیم کرتا ہے اور اس کی تربیت کرتا ہے تاکہ وہ دنیا میں کچھ خدا اور انسان کی خدمت میں دے ڈالے، اس کے امکانات ابھی تک ختم نہیں ہوئے ہیں، وہ اب بھی ایسی نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جہاں انسان کا معاشرتی درجہ اس کی ذات، رنگ، اس کے کمائے ہوئے "ڈویڈنڈ" کی مقدار سے متعین نہ ہوتا ہو بلکہ اس زندگی کے مطابق قائم کیا جاتا ہو جسے وہ بسر کرتا ہے، جہاں غرباء مال داروں پر ٹیکس عائد کرتے ہوں، جہاں انسانی سوسائٹی شکموں کی مساوات پر قائم نہ ہو بلکہ روحوں کی مساوات پر جہاں ایک اچھوت بادشاہ کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہو۔ ان تمام اقتباسات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ حضرت علامہ مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر ایک علیحدہ قوم تصور کرتے تھے اور اسی بنیاد پر وہ ایک علیحدہ خطہ چاہتے تھے جسے وہ اسلامی ریاست کا نام دیتے تھے۔ کوئی ذی ہوش انسان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ساری جدوجہد اسلام ہی کے نام پر تھی۔ وہ ملتِ اسلامیہ کو ان محدود حصوں میں قوم سمجھنے کیلئے تیار نہ تھے اور یہی چیز انہوں نے مسلمانوں کو سکھائی، وہ فرماتے ہیں:

اپنی ملت پر قیاس، اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری (مذہب ص248 بانگ درا)

اقبال جہاں جہاد کا درس دیتا ہے وہاں اس نے اجتہاد کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور اس خطے میں اقبال واحد شاعر ہے جس نے صرف مسلمانوں کیلئے نہیں بلکہ نیچی ذات کے ہندوؤں کیلئے بھی آواز اٹھائی ہے:

آہ شودر کیلئے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے (نانک ص239 بانگ درا)

اس لئے آج چوراہے میں بیٹھا ٹی وی کا بونا دانشور جب یہ کہتا ہے کہ اقبال رجعت پسند شاعر تھا در اصل اقبال کا نام استعمال کر کے اپنے چھوٹے قد کو نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پاکستان اور قائداعظم دونوں اقبال کی دریافت ہیں اس لئے جو اقبال کو نہیں مانتا وہ شوق سے پاکستان میں تو رہے لیکن اسے پاکستانی کہلوانے کا کوئی حق نہیں۔

بروز بدھ 22 جمادی الثانی 1445ھ 3 جنوری 2024ء

علامہ اقبال کا یقینِ کامل

برصغیر کی تقسیم جیسی زمینی حقیقت کے بعد اب تاریخ کو جھٹلانے یا ان حقیقی خاکوں میں جھوٹ و بدنیتی کا رنگ بھر کر تاریخی واقعات کی شکل بگاڑ کر نئی نسل کو گمراہ کر کے اقبال سے بدظن کرنے کی کوشش ایسے ہی ہے جیسے چاند پر تھوکا واپس اپنے منہ پر گرتا ہے۔ 76 سال گزرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اقبال پر نہرو کے اس بے جا الزام کو کیوں دہرایا جارہا ہے کہ،، اقبال اپنی زندگی کے آخری گئے تھے۔ کیا ان الزامات سے زمینی حقائق بدل سکتے ہیں کہ دوبارہ ایسا اکھنڈ بھارت قائم جائے دور میں سوشلزم کے زیرِ اثر تصورِ پاکستان سے دستبردار ہو جہاں ہر روز کشمیر اور گجرات جیسی قیامتیں مسلمانوں پر ڈھائی جائیں! اقبال جنہوں نے پاکستان جیسی ریاست کا خواب دیکھا، ان کو اس الزام میں آخر کیوں ملوث کیا جارہا ہے؟ اور ایک ہی وقت میں بھارت اور پاکستان میں ایسا بے ڈھنگا راگ کیوں سنائی دے رہا ہے؟ پھر دونوں ملکوں کے انتخابات سے قبل تواتر سے اس جھوٹ کو پھیلانے کی کیا وجہ ہے کہ سرحد پار کی زبان یہاں کے ٹی وی پر بیٹھے دانشوروں کی سڑاند بھی بھڑک اٹھتی ہے۔ آیئے تاریخ کے جھروکوں سے حقائق کی دنیا میں جھانکتے ہیں:

پنڈت جی اپنی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" جو انہوں نے 1944ء میں قلعہ احمد نگر کے زنداں میں بیٹھ کر لکھی تھی، اس میں انہوں نے بطور شاعر اور مفکر اقبال کے فیضان کی تحسین فرمائی ہے مگر اقبال کو خراجِ تحسین کرتے وقت وہ یہ بھی کہہ گزرے ہیں کہ اقبال ایک شاعر، عالم اور فلسفی تھے اور پرانے جاگیرداری نظام سے وابستہ تھے"۔ پنڈت جی مزید لکھتے ہیں کہ "اقبال پاکستان کے اوّلین حامیوں میں سے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس تجویز کی لغویت اور ان خطرات کو محسوس کر لیا تھا جو اس تجویز میں مضمر ہیں۔ ایڈورڈ تھامسن نے لکھا ہے کہ ایک ملاقات کے دوران اقبال نے ان سے یہ کہا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں صدر کی حیثیت سے پاکستان کی حمائت کی تھی مگر ان کو یقین تھا کہ یہ تجویز مجموعی طور پر ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کیلئے مضر ہے۔ شائد انہوں نے اپنا خیال بدل دیا تھا یا پہلے اس مسئلے پر زیادہ غور نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت تک اس نے کوئی اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ ان کا عام نظریہ زندگی پاکستان یا تقسیمِ ہند کے اس تصور کے ساتھ جو بعد میں پیدا ہوا، ہم آہنگ نہیں تھا۔ آخری عمر میں اقبال کا رجحان اشتراکیت کی طرف بڑھتا گیا۔ سوویت یونین کی زبردست کامیابی نے ان کو بہت متاثر کیا اور ان کی شاعری کا رخ بدل گیا۔"

پنڈت نہرو کا یہ الزام سراسر غلط، لاعلمی بلکہ بدنیتی پر مبنی ہے۔ جن لوگوں نے اقبال کی شاعری، فلسفہ اور سیاست کا سرسری سے بھی کم مطالعہ کیا ہے، وہ بھی اس صداقت کی گواہی دیں گے کہ جاگیرداری نظام کا اقبال سے بڑا دشمن ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ نہرو سے سب سے بڑا تاریخی سہو یہ ہوا کہ وہ بھول گئے کہ ان کی کتاب سے تین برس پہلے قائداعظم کے دیباچہ کے ساتھ قائداعظم کے نام اقبال کے خطوط شائع ہو چکے تھے، یہ انگریزی کتاب یقیناً نہرو کی نظر سے گزر چکی ہوگی۔ اس کتاب میں شامل 28 مئی 1937ء کا وہ طویل خط بھی شامل ہے جس میں نہرو کی "بے خدا سوشلزم" کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان تو رہے ایک طرف، خود ہندو معاشرہ بھی "بے خدا سوشلزم" کو ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ پنڈت جی کی سوشلزم کو رد کرتے وقت اقبال نے قائداعظم کو بتایا ہے کہ اگر اسلامی شریعت کی دورِ حاضر کے معاشی نظریات کی روشنی میں از سرِ نو تفسیر کی جائے تو مسلمان عوام کی روٹی روزگار کا مسئلہ بہتر طور پر حل ہو سکتا ہے۔ مسلمان کو غربت کے عذاب سے نجات دلانے کیلئے بھی یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی

الگ قانون ساز اسمبلی ہو اور یہ اسمبلی متحدہ ہندوستان کی بجائے ایک الگ خود مختار مملکت میں ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ اس خط کے مندرجات زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ:

اوّل: اقبال، نہرو کی "بے خدا سوشلزم" پر اسلام کے اقتصادی نظام کو ترجیح دیتے ہیں۔

دوم: اسلام کے اقتصادی نظام کو عہدِ جدید کے سیاق وسباق میں نافذ کرنے کیلئے جداگانہ مسلمان مملکت کا قیام ضروری ہے۔

سوم: اپنی وفات سے فقط چند ماہ قبل وہ قائداعظم کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ وہ قیامِ پاکستان کو کل ہند مسلم لیگ کا سیاسی پروگرام بنالیں۔

چہارم: اس خط کے آخر میں وہ قائداعظم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا وہ وقت نہیں آپہنچا جب ہمیں کھل کر قیامِ پاکستان کو اپنی منزل قرار دے دینا چاہئے؟

پنڈت جی دانستہ طور پر اقبال کی وفات سے تین ماہ پیشتر میاں افتخارالدین کے ہمراہ جاوید منزل میں علامہ اقبال سے جو ملاقات کی تھی، اس ملاقات کی خوشگوار یادوں کا یہ واقعہ بیان کرنا کیوں مناسب نہیں سمجھا، لیکن اسے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" میں بیان کر دیا ہے۔ محترم بٹالوی صاحب لکھتے ہیں:

"پنڈت نہرو اس زمانے میں زور شور سے سوشلزم کا پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے، انڈین نیشنل کانگرس کے دو اجلاسوں کے وہ صدر رہ چکے تھے اور دونوں مرتبہ اپنے خطباتِ صدارت میں انہوں نے کہا تھا کہ ہندوستان کے تمام مصائب کا علاج سوشلزم ہے لیکن کانگرس کے بڑے بڑے لیڈروں میں کوئی شخص بھی اس بارے میں پنڈت نہرو کا معاون یا ہم خیال نہیں تھا بلکہ سردار پٹیل، راج گوپال اچاریہ اور ستیہ مورتی نے تو علی الاعلان پنڈت نہرو کے اس عقیدے سے اختلاف کا اظہار کیا تھا۔ دورانِ ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے پنڈت نہرو سے پوچھا کہ سوشلزم کے بارے میں کانگرس کے کتنے آدمی آپ کے ہم خیال ہیں؟ پنڈت جی نے جواب دیا کہ، نصف درجن کے قریب۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "تعجب ہے، خود آپ کی جماعت میں آپ کے ہم خیالوں کی تعداد صرف نصف درجن ہے، ادھر آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونے کا مشورہ دوں، تو کیا میں دس کروڑ مسلمانوں کو چھ آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں؟"۔ اس پر پنڈت جی خاموش ہو گئے"۔

پنڈت جی نے اسی ملاقات میں پیش آنے والے ایک اہم ناگوار واقعہ کو اپنی قوم سے چھپایا، ہاں البتہ بٹالوی صاحب نے بیان کر دیا ہے۔

"ابھی ان دو عظیم المرتبت انسانوں کے ساتھ گفتگو جاری تھی کہ یکایک میاں افتخارالدین بیچ میں بول اٹھے کہ ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے؟ مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں، اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگرس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔ ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی غصے میں آگئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں فرمایا: تو اچھا، یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلے میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں، میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا معمولی سپاہی ہوں"۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور کمرے میں تکدر آمیز سکوت طاری ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا کہ میاں افتخار کے دخل در معقولات نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کر دیا ہے اور اب مزید گفتگو جاری رکھنا بے سود ہے، چنانچہ وہ اجازت لیکر رخصت ہو گئے۔

حیرت یہ ہے کہ انہوں نے ان ناقابلِ فراموش یادوں کو تو آسانی سے فراموش کر دیا مگر ایڈورڈ تھامسن کی گپ شپ کو ناقابلِ تردید تاریخی صداقت کا درجہ دے دیا جنہیں خود ان کے ساتھی متعصب قرار دے چکے ہیں۔ ایڈورڈ تھامسن آکسفورڈ یونیورسٹی میں بنگالی زبان کے استاد تھے اور تاریخ ہند سے

بھی علمی شغف رکھتے تھے۔ وہ دو مرتبہ برطانیہ کے اخبار مانچسٹر گارڈین کے نامہ نگار کے روپ میں بھی برٹش انڈیا آئے تھے۔ گاندھی، رابندر ناتھ ٹیگور، راج گوپال اچاری، سردار پٹیل اور نہرو کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے جہاں وہ ہمیشہ مسلم لیگ کی مخالفت میں سرگرم رہتے تھے، وہاں کانگرس کی پرجوش وکالت کا کوئی موقعہ بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

جس روایت کا سہارا لیکر پنڈت جی نے اقبال پر الزام تراشی کی ہے وہ ایڈورڈ تھامسن اور علامہ اقبال کی زبانی گفتگو پر مبنی ہے۔ ایڈورڈ تھامسن کا یہ بیان قائداعظم کے نام اقبال کے متذکرہ بالا خطوط کی دستاویزی شہادت کے ساتھ ساتھ اقبال نہرو ملاقات کے مندرجہ بالا احوال و مقامات کی بنیاد پر صریحاً جھوٹ ثابت ہوتا ہے۔ اقبال آخر دم تک اپنے تصورِ پاکستان کو قیامِ پاکستان کی صورت میں جلوہ گر دیکھنے کی تمنا میں سرشار رہے۔ قائداعظم کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت میں سرگرمِ عمل رہے اور اسلامیانِ ہند کو یہ مشورہ دیتے رہے کہ میری زندگی کی دعائیں مانگنے کی بجائے محمد علی جناح کی طویل زندگی کی دعائیں مانگو، صرف جناح ہی قوم کی کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نہ معلوم یہ باتیں پنڈت جی کے ذہن سے کیوں محو ہو گئی تھیں یا انہوں نے ان ناخوشگوار باتوں کو اپنی سیاسی آئیڈیالوجی کی تردید سمجھ کر اپنی کتاب میں درج کرنا کیوں مناسب نہیں سمجھا؟

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کیلئے

اس کی وجہ صرف اور صرف یہی تھی کہ علامہ اقبال ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ میرے نبی ﷺ کا مبارک فرمان ہے کہ تم میں بہتر وہ شخص ہے جس کے اخلاق بہترین ہیں۔ اسی لیے نظریاتی اختلاف کے باوجود علامہ اقبال اور نہرو کے درمیان ہمیشہ باہمی احترام کے تعلقات قائم رہے۔ نہرو نے 1933ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں مسلمان مندوبین کے طرزِ فکر و عمل کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ گاندھی جی کے اس رویہ کی حمائت میں نہرو کی لب کشائی پر اقبال حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ اقبال اس کانفرنس میں شریک تھے مگر نہرو شریک نہیں تھے۔ کانگرس کی نمائندگی گاندھی جی نے واپسی پر کہا کہ انہوں نے ذاتی طور پر مسلمانوں کے تمام مطالبات کو قبول کر لیا تھا مگر سیاسی رجعت پسندی کی گاندھی جی نے کی تھی۔ بناء پر مسلمانوں نے کانفرنس کو ناکام بنا دیا۔ نہرو نے گاندھی جی کی باتوں میں آکر مسلمان مندوبین کے خلاف ایک انتہائی سخت سیاسی بیان داغ دیا چنانچہ علامہ اقبال نے گاندھی جی کے اس الزام کی تردید میں نہرو کو جو خط تحریر کیا اس میں علامہ کا اخلاق ملاحظہ فرمائیں:

"میں پنڈت جواہر لال نہرو کے خلوص اور صاف گوئی کی ہمیشہ سے قدر کرتا رہا ہوں۔ مہاسبھائی معترضین کے جواب میں جو تازہ ترین بیان انہوں نے دیا ہے اس سے خلوص ٹپکتا ہے اور یہ چیز آج کل کے ہندوستانیوں میں کمیاب ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے تین سالوں میں جو گول میز کانفرنسیں لندن میں منعقد ہوئی ہیں، ان میں شریک ہونے والے مندوبین کے رویہ کے متعلق پنڈت جی کی تحقیق کی بنیاد کسی تعصب پر مبنی ہے"۔ اس خوش گمانی کے اظہار کے بعد علامہ اقبال نے اصل حالات کو بے نقاب کرتے ہوئے بتایا کہ "گاندھی جی نے مسلمانوں کے مطالبات کو ذاتی طور پر ماننے کا عندیہ تو دیا تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ اس بات کی حتمی ضمانت نہیں دے سکتے کہ کانگرس کی مجلسِ انتظامیہ بھی ان مطالبات کو تسلیم کر لے گی، ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کانگرس انہیں ان مطالبات کے سلسلے میں مکمل اختیار دینے کیلئے کبھی بھی رضامند نہیں ہو گی، گویا عملاً

گاندھی جی نے مسلمانوں کے تمام مطالبات کو رد کر دیا تھا۔ گاندھی جی کی دوسری غیر منصفانہ شرط یہ تھی کہ مسلمان اچھوتوں کے مخصوص مطالبات کی حمائت ترک کر دیں مگر مسلمانوں نے اچھوتوں کی حمائت سے دستبرداری سے انکار کر کے نسل پرست گاندھی جی کو ناراض کر دیا تھا"۔ چنانچہ اپنے اس خط میں انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ:

"اپنے زبانِ زدِ عام سوشلسٹ خیالات کے پیشِ نظر پنڈت جواہر لال نہرو اس انسانیت کش شرط کی کیسے حمائت کریں گے؟ کم از کم انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں رجعت پسندی کا الزام دیں۔ اس صورت میں میں وہ لوگ جو ہندوؤں کے فرقہ پرستانہ مقاصد کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ پنڈت جی فرقہ وارانہ فیصلے کے خلاف ہندو مہاسبھا کی جاری کردہ مہم میں ایک سرگرم رکن ہیں"
مسلمانوں کے خلاف نہرو کا دوسرا الزام یہ تھا کہ مسلمان ہندوستانی قومیت کے مخالف ہیں۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے فرمایا:
"اگر قومیت سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذہبی جماعتوں کو حیاتاتی معنوں میں ملا جلا کر ایک کر دیا جائے تو پھر میں ہی اس نظریہ قومیت سے انکار کا مجرم ہوں۔ میں پنڈت نہرو سے ایک سیدھا سا سوال کرنا چاہتا ہوں، جب تک اکثریت والی قوم دس کروڑ کی اقلیت کے کم سے کم تحفظات کو جنہیں وہ اپنی بقاء کیلئے ضروری سمجھتی ہے، نہ مان لے اور نہ ہی ثالث کا فیصلہ تسلیم کرے بلکہ واحد قومیت کی ایسے رٹ لگاتی رہے جس میں صرف اس کا اپنا ہی فائدہ ہے، ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟ اس سے صرف دو صورتیں نکلتی ہیں، یا تو اکثریت والی ہندوستانی قوم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مشرق میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے برطانوی سامراج کی ایجنٹ بنی رہے گی یا پھر ملک کو مذہبی، تاریخی اور تمدنی حالات کے پیشِ نظر اس طرح تقسیم کرنا ہو گا کہ موجودہ شکل میں انتخابات اور فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال ہی نہ رہے"۔

جواب میں دیا گیا علامہ اقبال کا یہ بیان یقینی طور پر نہرو کی نظروں سے گزرا ہو گا، اس بیان میں روزِ اوّل تا آخر اقبال کا ترقی پسند، وسیع النظر اور انسان دوست مسلک نمایاں ہے۔ یہ بیان تصورِ پاکستان کی نفی سے نہیں بلکہ اثبات سے عبارت ہے۔ ایسے میں نہرو کا یہ کہنا کہ 1930ء کے بعد اقبال اپنے تصورِ پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے، دیانت داری پر مبنی نظر نہیں آتا بلکہ تاریخی حقیقت پر تعصب کی چادر ڈالنے کے مترادف ہے۔ آیئے مستند تاریخی حوالوں سے کچھ اور پوچھتے ہیں:

جب نہرو نے "ماڈرن ریویو" (کلکتہ) میں دنیائے اسلام کی صورتحال پر تین مضامین میں وطنیت اور لادینیت کے فروغ کا خیر مقدم کیا تھا تو اس کے جواب میں اقبال نے بھی "ماڈرن ریویو" (کلکتہ) ہی میں پنڈت جی کی فکری گمراہی کو راست فکری میں بدلنے کا سامان کیا۔ اپنے طویل مضمون کے آغاز میں اقبال نے برملا کہا: "میں اس بات کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ جس انداز میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایک ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ وہ اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام پسند نہیں کرتے۔ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خود مختاری پیدا ہو"۔

قارئین! ذرا غور فرمائیں کہ اقبال کا یہ تجزیہ کہ "پنڈت جی کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے" وقت نے بہت جلد سچ ثابت کر دکھایا، جب پنڈت جی کے دل میں برصغیر کی زندگی کے ٹھوس حقائق کا احساس جاگ اٹھا تو مولانا ابوالکلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں بھی ٹھوس حقائق یعنی قیامِ پاکستان کی حقیقت کو قبول کرنے کا مشورہ دینے لگے۔ مولانا آزاد اپنی تصنیف "انڈیا ونز فریڈم" میں رقمطراز ہیں:

"After a few days Jawaharlal came to see me again. He began with a long preamble in which he emphasized that we should not indulge into wishful thinking, but face reality. Ultimately he came to the point and asked me to give up opposition to partition."

"کچھ دنوں کے بعد جواہر لال مجھ سے دوبارہ ملنے آئے۔ انہوں نے ایک طویل تمہید کے ساتھ شروعات کی جس میں انہوں نے زور دیا کہ ہمیں خواہش مندانہ سوچ میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے بلکہ حقیقت کا سامنا کرنا چاہئے۔ بالآخر وہ اس بات پر آئے اور مجھ سے تقسیم کی مخالفت ترک کرنے کو کہا"۔

اسلامیانِ ہند نے 1946ء کے انتخابات میں اپنے ووٹ کے ذریعے نہرو اور گاندھی کے سیاسی خواب پرستوں کو زندگی کے جن حقائق کا احساس دلایا تھا، اقبال نے برسوں پہلے نہرو کو ان حقائق کی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "سیاسی تدبر کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی کے حقائق سے فرار کرنے کی بجائے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے پنجہ آزما ہوا جائے"۔ اپنے زیرِ نظر مضمون میں بھی علامہ اقبال نے جداگانہ مسلمان قومیت کے سوال پر دوٹوک انداز میں اظہارِ خیال کیا تھا۔ اقبال نے اسلامیانِ ہند کے سیاسی مسلک پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی تھی:

"اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموس وطن کیلئے جان تک قربان کر دینے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحاد انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے، جداگانہ مسلمان قومیت کا سوال صرف ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے۔ میں یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامیانِ ہند کسی ایسی سیاسی تصوریت کا شکار نہیں بنیں گے جو ان کی تہذیبی وحدت کا خاتمہ کر دے گی، اگر ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب اور حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کر لیں گے"۔

علامہ اقبال کا یقینِ کامل بالکل درست نکلا، اسلامیانِ ہند نے بالآخر متحدہ ہندوستانی قومیت کے سیاسی تصور کو غلط ثابت کرتے ہوئے جمہوری عمل کے ذریعے پاکستان قائم کر لیا۔ ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو گئی اور یوں پاکستان میں اسلام سے عشق اور وطن سے محبت میں کوئی تضاد باقی نہ رہا۔ اب ہمارا دین اسلام ہے اور ہمارا وطن دار لسلام ہے اور دوسری طرف آپ نہرو کی صداقت کا اس بات سے اندازہ لگالیں کہ ساری دنیا کے سامنے انہوں نے تحریری طور پر اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت دیں گے لیکن خود ہی اپنی تحریر سے منحرف ہو گئے اور اس وعدہ خلافی نے ان کی ساری شخصیت کا بھرم طشت از بام کر دیا ہے! علامہ کا یہ شعر کتنا حسبِ حال ہے:

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

رہے نام میرے رب کا جو حق سچ ہے۔

بروز جمعتہ المبارک 24 جمادی الثانی 1445ھ 5 جنوری 2024ء

ستم کی آندھیاں، ظلم کی بجلیاں

روایات وحکایات میں آیا ہے کہ چنگیز خان سے کسی نے سوال کیا کہ تم نے آدھی دنیا کو تاخت و تاراج کیا، تمہارے سپاہی جب کسی شہر پر حملہ کرتے تو ظلم و ستم کی انتہا کر دیتے، جیتنے کی سرشاری میں بوڑھوں پر تشدد کرتے، بچوں کو ذبح کرتے اور عورتوں سے زیادتی کے بعد گھروں سے تمام اشیالوٹ کر انہیں آگ لگا دیتے۔ تم تو اس قدر ظالم وجابر تھے کہ ایک دفعہ کسی شہر میں فتح کے بعد تمہیں علم ہوا کہ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو لاشوں کے ڈھیر میں چھپ کر زندہ بچ جانے کی کوشش کی تھی تو تم نے انہیں ڈھونڈ نکالنے کا حکم دیا اور ان کے سر قلم کروا دیئے لیکن اس کے بعد تمام منگولوں کو یہ حکم دے دیا گیا کہ ہر مارے جانے والے کا سر قلم کر دیا جائے تا کہ زندہ اور مردہ کی شناخت ہو سکے۔ خود تمہارا قول ہے کہ مجھے اپنے دشمنوں کو نیست ونابود کرنا، ان کو اپنے قدموں میں گرتے دیکھنا، ان کے گھوڑے اور ساز وسامان چھین لینا اور ان کی عورتوں کے نوحے اور بین سننا میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔

سوال کرنے والے نے چنگیز سے پوچھا کہ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی ایسا موقع بھی آیا کہ تمہیں کسی پر ترس آیا ہو، تم نے رحم کھایا ہو؟ چنگیز خان نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا: ہاں ایک دفعہ ایک شہر کو لوٹنے کے بعد جب میں وہاں سے نکل رہا تھا تو میرے خوف سے عورتیں اپنے بچوں کو گود میں لئے بھاگ رہیں تھیں کہ اچانک ایک عورت کا شیر خوار بچہ اس کے ہاتھوں سے دریا میں گر گیا اور اس نے دردمندانہ طریقے سے رونا پیٹنا شروع کیا کہ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے اس بچے کو دریا میں سے اپنے نیزے پر اچھالا، نیزہ اس کے جسم کے آر پار ہو گیا اور پھر میں نے وہ نیزہ میں پرویا ہوا بچہ اس روتی ہوئی ماں کے حوالے کر دیا۔

آج بھی ظالموں اور قاہروں کا جذبہ رحم ایک اور لمحے میں بھی ابھر کر سامنے آتا ہے جب لاشوں کے انبار میں انہیں اپنے سب سے پیارے شخص کی لاش نظر آ جائے۔ تیمور جو شہروں کو فتح کرتا تو اپنے ظلم کی نشانی کے طور پر مرنے والوں کی کھوپڑیوں کو اکٹھا کرواتا اور ان کے مینار بنواتا، پھر ان پر انہی انسانوں کی چربی کا لیپ کرواتا اور رات کو ان کھوپڑیوں کو آگ دکھا کر روشن کیا جاتا کہ دور دور تک لوگوں کو علم ہو سکے کہ تیمور نے یہ شہر فتح کر لیا لیکن اس کی آپ بیتی پڑھی جائے تو ایک مقام ایسا آتا ہے جب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، دیواروں سے سر ٹکراتا رہا، لاشوں کے انبار کو دیکھ کر بین کرتا رہا۔ اس سے کچھ بن نہیں پا رہا تھا، بس سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور کوچ کا حکم دے دیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب دلی میں کشت وخون جاری تھا کہ اس کے سامنے اس کے چہیتے اور لاڈلے بیٹے کی لاش لائی گئی۔ تاریخ عالم بتاتی ہے کہ ظالموں اور ان کی فوج کے سپاہیوں کے دل پتھر کے نہیں ہوتے لیکن ان کے مفادات اور حکم نامے انہیں پتھر کا بنا دیتے ہیں۔ ان تک چونکہ کوئی تلوار، کوئی گولی، کوئی بم نہیں پہنچ رہا ہوتا، اس لئے انہیں یقین سا ہونے لگتا ہے کہ موت ان کے دروازے پر دستک نہیں دے گی۔ وہ اور ان کے پیارے اسی طرح بربریت اور ظلم کے مقابلے میں اٹھنے والی نفرت سے بچتے رہیں گے مگر پھر بھی اگر چنگیز خان کے سپاہیوں سے لے کر آج تک کے میدان کارزار کے کہنہ مشق ظالم انسانوں کو دیکھیں تو ان کے اندر جیتا جاگتا انسان انہیں ظلم پر سرزنش ضرور کرتا رہتا ہے، انہیں چین کی نیند نہیں سونے دیتا، انہیں مدتوں ضمیر کی ملامت کا شکار ضرور کرتا ہے۔

دنیا کے سامنے اس وقت موجودہ دور کے چنگیز، تیمور اور ہلاکو کی نعم البدل امریکی فوج کے ادارے پینٹاگون کی ایک رپورٹ ہے جس میں ان دونوں ہائی پروفائل اداروں نے عراق اور افغانستان میں کام کرنے والے فوجیوں کیلئے اینٹی ڈیپریشن یعنی سکون بخش ادویات لازم قرار دے دی ہیں۔ یہ ادویات

مستقل طور پر 23 فیصد امریکی فوجی استعمال کر رہے ہیں جبکہ 70 فیصد فوجی اپنی ذہنی بیماری اور نفسیاتی عدم سکونی کیلئے دماغی امراض کے ماہرین سے اپنا علاج و معالجہ کروا رہے ہیں۔ ان سپاہیوں کی کہانیاں اور مرض کی وجوہات بہت ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً انہیں حکم ملا کہ فلاں گھر میں بقول ان کے دہشتگرد چھپے ہوئے ہیں، انہوں نے بمباری کر کے گھر کو نیست و نابود کر دیا، اندر گھسے تو چاروں جانب بچوں کے کھلونے، گڑیاں، گھر کا ساز و سامان اور ننھے ننھے جسموں کے پرخچے ملے۔ ان میں کوئی تو کئی راتوں تک سو نہ سکا اور کسی کا فوری طور پر ذہنی بریک ڈاون ہو گیا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ 2008 میں 242 / امریکی سپاہیوں نے اس ذہنی کرب اور ضمیر کی اذیت سے چھٹکارا پانے کیلئے خودکشی کر کے اپنا قصہ تمام کیا اور یہ سلسلہ ابھی تک رکا نہیں۔ ان میں سے آدھے ایسے تھے جو اس ذہنی اذیت کے علاج کیلئے مستقل طمانیت آور "زولوفٹ" اور "پروزیک" دوائیاں لے رہے تھے۔ یہ دوایسی مسکن دوائیاں ہیں جو یہ سپاہی مستقلاً کھاتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی آنکھوں کے سامنے سے لٹے پٹے اجڑے اور تباہ شدہ ملبوں میں معصوم بچوں اور عورتوں کی لاشیں کی تصویریں دھندلی نہیں ہو پاتیں بلکہ یہ ہمہ وقت چشم تصور کے سامنے رقصاں رہتی ہیں اور پینٹا گون کے مطابق عراق اور افغانستان جنگ میں شریک فوجیوں کے علاج معالجہ پر اب بھی سالانہ 8 ارب ڈالر سے زائد کے اخراجات اٹھ رہے ہیں اور ان مریضوں پر تاعمر یہ اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے۔ دل تھام کر سنئے کہ مشہور برطانوی جریدے ڈیلی میل نے 2 مارچ 2014 میں انکشاف کیا تھا کہ عراق اور افغانستان میں ہر 80 منٹ کے بعد ایک امریکی فوجی خودکشی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسی رپورٹ میں یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ صرف 2009 میں 1868 / فوجیوں نے خودکشی کی کوشش کی۔

مشہور امریکی ادارے "یو ایس او" نے 6 ستمبر 2023 کی اپنی رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ نائن الیون کے بعد سے ریکارڈ کیپنگ شروع ہونے کے بعد سے فعال ڈیوٹی والے فوجی ارکان میں خودکشی کی شرح اس وقت بلند ترین سطح پر ہے اور پچھلے پانچ سالوں میں خطرناک حد تک مستحکم رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ تحقیق سے پتا چلا کہ 30,177 فعال ڈیوٹی اہلکار اور سابق فوجی جنہوں نے نائن الیون کے بعد فوج میں خدمات انجام دیں، خودکشی کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ انہی 20 سالوں میں لڑائی میں مارے گئے 7,057 سروس ممبران کے مقابلے میں فوجی خودکشی کی شرح ان اموات سے چار گنا زیادہ ہے جو فوجی آپریشنز کے دوران ہوئیں۔ فوجی خاندانوں اور والدین کیلئے یہ رجحان انتہائی پریشان کن ہے۔ متعدد وجوہات ایک شخص کو خودکشی کے ذریعے مرنے کا باعث بن سکتی ہیں، لیکن ایکٹیو ڈیوٹی کرنے والے لوگوں کیلئے، زندگی کے معمول کے اتار چڑھاؤ کے اوپر ممکنہ تناؤ کی ایک اضافی تہہ ہے جو انہیں خطرے میں ڈال دیتی ہے"۔

میں یہ رپورٹ پڑھ رہا تھا کہ پرانے ریکارڈ سے 21 ستمبر 2012 کو شائع ہونے والی ایسی ہی دو خبریں سرینگر مقبوضہ کشمیر کے ایک بڑے اخبار کے صفحہ اول پر شائع ہوئی تھیں، نے مجھے چونکا دیا۔ اخبار کی پہلی خبر کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر اور بھارتی پارلیمنٹ کے رکن گرداس گپتا نے کشمیر میں ہونے والی انسانی حقوق کی پامالیوں پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کشمیر میں بے نام قبروں کے بارے میں پارلیمنٹ میں سوالات اٹھاتے ہوئے انسانی حقوق کی پامالیوں کے مرتکب کو سخت سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ گرداس گپتا جو 2011 میں کشمیر میں عوامی ایجی ٹیشن کے دوران کل جماعتی پارلیمانی کمیٹی کے رکن بھی تھے، نے وزیر داخلہ کے قول و فعل میں تضاد پر بھی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تک ان کے اعلانات کا زمینی حقائق سے دور تک کوئی تعلق

نہیں، بے نام قبروں کی دریافت کو انسانیت کے خلاف جرم قرار دیتے ہوئے اس کی منصفانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا تا کہ یہ پتہ چل سکے کہ ان قبروں میں کون لوگ مدفون ہیں اور ان کے ماورائے قتل میں ملوثین افراد کے خلاف سخت کاروائی کا مطالبہ بھی کیا لیکن کیا ابھی تک گرداس گپتا کے مطالبے پر کوئی کاروائی ہوئی؟

اسی اخبار میں دوسری اہم خبر وامق فاروق قتل کیس کی عدالتی کاروائی کے بارے میں ہے اس کو پڑھ کر تو مجھے اپنے ایک قاری کا کشمیر سے موصول ہونے والا خط بھی یاد آگیا جس میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ مقتول وامق فاروق بھی ایک ایک ایسا ادھ کھلا گلاب تھا جسے بڑی سنگ دلی کے ساتھ گولیوں کی بوچھاڑ سے مسل دیا گیا اور اس معصوم بچے کو بھی ان تاریک راہوں کے حوالے کر دیا گیا جہاں پہلے ہی ہزاروں کشمیری پہنچے تھے۔ بشری حقوق کی شدید پامالیوں کی اس تاریک رات کی صبح کب طلوع ہو گی؟ بے یارومددگار کشمیری اسی تشنہ تعبیر خواب میں مرمٹ رہے ہیں۔

وادی کشمیر میں چونکہ ایک عرصہ دراز یہ اندوہناک صورتحال قائم ہے۔ اس دوران اب بھی ان گھروں کے چراغ گل ہو رہے ہیں، بزرگ والدین کے بڑھاپے کی لاٹھیاں ان کی آنکھوں کے سامنے ٹوٹ رہی ہیں، چادر اور چاردیواری کا تقدس پامال ہو رہا ہے۔ وہاں عام لوگوں کیلئے زندگی کس طرح سوہانِ روح اور مسلسل عذاب بنتی جارہی ہے، اس کا اب تو ہم شاید اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ ہم نے ان کے وکیل ہونے کا دعوی کر کے ان کو برہمن ظالم بھیڑیوں کے حوالے کر دیا کہ ہمیں تو اپنا عارضی اقتدار عزیز تھا لیکن مکافات عمل دیکھیں کہ دھوکہ دینے والے اب کس حال میں ہیں۔

وادی کشمیر کا شاید ہی کوئی علاقہ، کوئی قصبہ، کوئی قریہ، کوئی نکڑ یا کوئی چوک چوراہا ہو جہاں معصوم کشمیریوں کا خون نہ بہا ہو اور ہزاروں کشمیری اب بھی زیر حراست ہیں اور ان گنت گم شدہ ہیں۔ ان کی گھر واپسی کے نہ ختم ہونے والے انتظار میں مغموم و مضطرب والدین، نیم بیوائیں، بچے اور بچیاں سوائے مایوسی و قنوطیت کچھ بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ متعدد بے نام قبروں کی یکے بعد دیگرے دریافت سے حالات کی سنگینی کا تو پتہ چل گیا ہے، ان مرقدوں میں کن کشمیریوں کو دفن کر دیا گیا؟ اس کا ابھی تک انسانی حقوق آرگنائزیشن کے شور شرابہ کے باوجود کوئی مبنی بر صداقت ان بے نامی قبروں میں مدفون مظلومین کی فہرست سامنے نہیں آسکی کہ ان کے لواحقین کی آنکھوں کو جلا دینے والا اور سولی پر لٹکانے والا انتظار ہی ختم ہو سکے۔ لوگ انگشت بدنداں ہیں کہ گمشدہ کشمیریوں کو زمین نے اب اس پیرائے میں اپنے پیٹ سے اگل دیا ہے، ہر ذی شعور انسان دوست شخص ان بے نام اجتماعی قبروں کی دریافت پر تڑپ اٹھا ہے اور ان کے بارے میں منصفانہ تحقیقات کا مطالبہ کرنے والے انسانیت نوازوں میں اب بھارتی پارلیمنٹ کے انتہائی سنیئر رکن گرداس گپتا بھی شامل ہو چکے ہیں۔ ان اجتماعی قبروں میں ماورائے عدالت بیدردی سے ہلاک کئے جانے کے بعد دفن کئے جانے والوں کا قصور اور جرم کیا تھا، کوئی نہیں جانتا؟ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا نعرہ لگانے والوں کے کے منہ پر لگی ہوئی کالک انسانی حقوق کے چیمپئن ہونے کا دعوی کرنے والوں کی خاموشی اور تائید آخر کب تک؟

میں جب یہ دلخراش تحریر مکمل کر رہا تھا تو نجانے کیوں وہ ہزاروں نوجوان یکایک یاد آگئے جو اس وقت سیاسی اختلاف کے سبب زینت زنداں بنے ہوئے ہیں کہ جن کے گھروں کو سیاسی وجوہ سے ماتم کدوں میں بدل دیا گیا ہے، وہ بطور قیدی طویل مدتوں سے ایک کربناک حالات سے دوچار ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جنت نظیر کی دوعفت مآب بیٹیوں آسیہ اور نیلوفر کی دلدوز چیخیں اور فریادیں اب بھی ان کے اہل خانہ سمیت ہیومن رائٹس کے قائدین اور عام کشمیریوں کو غم واندوہ کا شکار بنا رہی ہیں۔ انہیں ان ہزاروں ماؤں کی یاس بھری آنکھیں اور غمگین چہرے بھی بہت رلاتے ہیں جو آج بھی گھر کے

دریچوں سے باہر ٹکٹکی لگائے اپنے گمشدہ جگر گوشوں کے منتظر ہیں اوراب توسری نگر کے پرتاپ پارک میں منہ پر پٹی باندھ کر حکام کی سرد مہری پر خاموش احتجاج کو بھی سختی سے کچل دیا گیا ہے۔

وادی کشمیر کے ٹوٹے درودیوار، ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں اور تباہ شدہ املاک کے ساتھ ساتھ آج بھی دل کی دولت اور ضمیر کا سرمایہ رکھنے والے بٹہ مالو کے اس نوسالہ معصوم بچہ بھی یاد کر کے سرد آہیں بھرتے ہیں جس کو آخری غسل دیتے وقت اس کے والد کو یہ دیکھ کر غشی طاری ہوگئی کہ اس کے منہ میں ادھ چبی چیونگم موجود تھی اور طفیل متو کی بند مٹھی کا وہ پانچ روپے کا سکہ بھی ان کے پژمردہ لواحقین اور دوستوں کی دلی حرکت کو بے ترتیب کر کے چھوڑ دیتا ہے جو زندگی کے آخری لمحوں میں کرایہ کیلئے پانچ روپے کا سکہ ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا تاکہ ٹیوشن سے گھر لوٹ آئے کہ دفعتاً پولیس کی طرف سے فائر کیا گیا ایک سنسناتا ہوا گرینیڈ اس کے سر میں آر پار ہوا، اوراس کے معصوم جسم کے چیتھڑے اڑا دیئے گئے۔

میں جب یہ خبریں پڑھ رہا تھا تو چشمِ تصور میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ کس طرح گولیوں کی بوچھاڑ سے یہ چھلنی لاشے جب اپنے گھروں میں پہنچے تو پیاروں نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر نالہ وفریاد کا کہرام بپا کیا ہوگا۔ کرفیو کی پابندیوں کی وجہ سے ان کے ورثا اپنے شہدا کو دفنانے کیلئے سڑکوں پر فاتح برہمن فورسز کے افراد سے قبرستان تک جانے کی بھیک مانگ رہے ہوں گے۔ مجھے ماں سے لپٹی ہوئی کسی معصوم بچی کی لاش، کسی کمرے میں خوف میں دبکے آپس میں چمٹے ہوئے ننھے منے بچے، کسی باورچی خانے میں اوندھے برتن اور ٹوٹے گلاس، کسی کے باپ کا جلا ہوا خط، کسی کی پھٹی ہوئی ڈائری، کسی کا اپنے ہاتھوں سے کروشیئے کی کڑھائی والا حجاب یا چادر، اور تلاشی کے بہانے ان سب کو روندتے ہوئے وردی والے بھی دکھائی دیئے۔

کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا اس ڈیوٹی پر مامور افراد کو ضبط کے اس عالم میں اجتماعی قبروں میں ان لاشوں کو دفناتے ہوئے، اس سارے ملبے کو صاف کرنے اور کوڑے کے ڈھیر کی طرح سب کچھ ایک جانب اکٹھا کرنے کی یہ ڈیوٹی سرانجام دیتے ہوئے، وہ سب ثبوت تلف کرتے ہوئے اپنے گھروں میں ہنستی کھیلتی، مسکراتی، باپ کو فرمائشوں کے خط لکھتی اپنی بچیاں بھی یاد آئی ہوں گی؟ لیکن آج یہ سب منظر ان کے ذہنوں پر تو نقش ہوں گے۔ کاش کوئی جا کر ان سے پوچھے کہ کون کیسے جی رہا ہے، کس سے علاج کروا رہا ہے، کون سی دوا استعمال کر رہا ہے؟؟؟ لیکن اس سب سے دور قمقموں کی روشنی میں حکم دینے والے بھی تھے جو آج بھی سمجھتے ہیں کہ کوئی بندوق کی گولی یا کوئی بم ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیا غزہ میں ہونے والے نیتین یاہو اور کشمیر میں ظلم کرنے والے مودی کا کوئی حساب نہیں ہوگا؟

جب میں دل وکو پارہ پارہ کرنے والی ان روداوں کو سپرد قلم کر رہا تھا اوران غم انگیز خبروں کا شمار کر رہا تھا تو چشمِ تصور میں چنگیز اور ہلاکو کی تصویریں صاف صاف ابھر رہی تھیں اور دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ آخر وہ دن کب آئے گا جب مظلوم لوگوں کے واسطے کشمیر اور غزہ میں امن وآشتی اور حبِ انسانیت کی بہاریں لوٹ آئیں گی، جب وہاں زیر حراست گمشدگیوں، ظلم وستم کی سرگزشتیں ختم ہوں گی؟ جب لوگ آزادانہ طور اپنے معمولات زندگی میں مصروف عمل ہوں گے، جب سیاسی گھٹن اور سیاسی وابستگیوں کی بنا پر لوگوں کی تنگ طلبی قصہ پارینہ بنیں گی..... امید، دعا اور توقع یہی ہے کہ ایک دن ضرور آئے گا کہ امن کی موسلا دھار بارشیں ہوں گی جن سے کوہ وبیاباں میں امیدیں لہلا اٹھیں گی، ندی نالے، جھیلیں جھرنے بھر جائیں گے اور ہم پھر سے دنیا میں شہرہ آفاق انفرادیت وشناخت کے ساتھ سر اٹھا کر جئیں گے۔ ان شاء اللہ

بروز اتوار 26 جمادی الثانی 1445ھ 7 جنوری 2024ء

ظلم کب تک؟

کچھ بھی آنے والے ایک ہونی ہو کر رہتی ہے۔ جو پیشانی میں ہے، اسے پیش آنا ہے۔ جو کاتب تقدیر نے لکھا ہے اسے پورا ہونا ہے۔ خیر یا شر، برا یا بھلا، جو پل کے پردے میں چھپا ہے۔ پل گزرتے ہی سامنے آجاتا ہے۔ اگلے پل کے پیچھے کیا چھپا ہے، کیا سامنے آئے گا۔ پچھلے پل کا تسلسل یا اس کے بالکل برعکس۔ کون جانے، کس کو معلوم؟ انسان کے بس میں کب کچھ ہے؟ جو کچھ ہے سلطان کے بس میں ہے جو رحمان ورحیم بھی ہے، قہار وجبار بھی لیکن کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا کوئی کاٹھی نہیں، جو وقت کی بے لگام گھوڑے پر ڈالی جاسکے۔ کوئی لگام نہیں جو اس گھوڑے کا منہ موڑ دے؟ کیا کوئی چابک نہیں جو اس اڑیل کو صحیح سمت میں رواں رکھ سکے؟ کیا کوئی رکاب نہیں جو سوار کو سواری کی پیٹھ سے چپکا سکے، اسے اوندھے منہ گرنے سے بچا سکے؟

نہیں ایسا نہیں ہے، رب رحمان نے انسان کو سمجھایا کہ ہونی ہو کر رہتی ہے جو پیشانی میں ہے اسے پیش آنا ہے۔ کاتب تقدیر نے لکھا ہے، اسے پورا ہونا ہے لیکن ہونی کیا ہے، پیش کیا آنا ہے، کاتب تقدیر نے کیا لکھا ہے، سوائے اس کے کہ "بِمَاکَسَبَتْ اید ھم" جو کچھ تم نے اپنے ہاتھوں سے کمایا ہے۔ اس نے راستے دکھائے ہیں۔" ۔ بھلائی اور برائی کے راستے۔ اس نے تو سمجھایا ہے "ہم نے الہام کیا ہے، برائی کا بھی، بھلائی کا بھی"۔ اس نے تو بار بار یاد دلایا ہے۔ "اس نے تو وعدہ کیا ہے۔ "وہ کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا"۔ اور پھر اس نے کہا ہے تول لیا جائے گا تمہارا ہر عمل اچھا یا برا، چھوٹا یا بڑا، اور فیصلہ کر دیا جائے گا تمہارے فلاح یا خسارے کا۔ اس نے انسان کو متنبہ کیا ہے۔

وقت کی قسم تمام انسان خسارے میں ہیں۔ "اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس خسارے سے کیسے بچا جائے۔ اس نے وقت کا منہ زور گھوڑا ہی تخلیق نہیں کیا، اس نے کاٹھی بھی دی ہے، لگام بھی، چابک بھی دی ہے، رکاب بھی۔ ایمان کی کاٹھی، عمل صالح کی لگام۔ تواصی حق کی چابک اور تواصی صبر کی رکاب ۔ تاریخ سے پوچھ کر دیکھئے۔ کون ہے جس نے وقت کے بے لگام گھوڑے کو قابو کرنے کیلئے ان اجزاء کو استعمال کیا ہو، اور ناکام رہا ہو۔ کون ہے جس نے ان اجزاء سے دامن چھڑایا ہو اور کامیاب ہوا ہو۔

لیکن ہمارا معاملہ عجیب ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ "تمنا برق کی رکھتا ہوں اور افسوس حاصل کا"۔ سمجھانے والے سمجھاتے رہ جائیں۔ راہ دکھانے والے راہ دکھاتے رہ جائیں۔ ہم کسی کی کب سنتے ہیں۔ ہم کہ عقل کل ٹھہرے، کب کسی کی مانتے ہیں۔ ہم اللہ کو مانتے ہیں لیکن نہ اس کے دین کو مانتے ہیں نہ یوم الدین سے ڈرتے ہیں۔ ہم قرآن کی تلاوت کرتے ہیں لیکن اس سے ہدایت نہیں لیتے۔ ہم نبی کریم ﷺ سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کی اطاعت نہیں کرتے۔ زندگی ہم فرعونوں کی طرح گزارتے ہیں لیکن عاقبت موسیٰ کی مانگتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اعتدال پسند، روشن خیال اور جمہوریت کے شیدائی کہتے نہیں تھکتے لیکن اپنے رویوں میں انتہا پسندی، تاریک خیالی، اور آمریت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ کہیں اقتدار کا سنگھاسن نہ ڈول جائے۔ اقتدار قائم رکھنے کا خاندانی راز بزرگوں سے سیکھا کہ باپ دادا نے بھی اطاعت میں زندگی گزاری، جس کسی نے حق کی طرف توجہ دلائی اس کو زنداں کی تاریکی میں پھینک دو کہ اس کا علاج یہی ہے!

کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تو دین حق کی مرہونِ منت ہے، اس کو اقلیت میں تبدیل کرنے کی سازش تو ان حق کی قوتوں سے جنگ کے مترادف ہے ۔ اس کے سامنے بھلا پہلے کون ٹھہرا ہے۔ وہ تو اپنے بندوں کو یاد دلاتا ہے..... "اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطرہ، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور

آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے، ان حالات میں جو صبر کریں اور جب کوئی مصیبت آن پڑے، تو کہیں کہ، ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے، انہیں خوشخبری دے دو، ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔ اس کھلی خوشخبری کے بعد بھلا کوئی حق پرست کیسے ان زندانوں سے ڈر سکتا ہے۔

کیا ایک لاکھ سے زائد جانوں کی قربانی اس بات کی روشن دلیل نہیں کہ جس رب نے ہر انسان کو آزاد پیدا کیا ہے، وہ ہر حال میں حریت کیلئے اپنی جاں تک قربان کر دینے کا عزم رکھتا ہے۔ اس مردم شماری سے اگر سروں کی گنتی مقصود ہے تو پھر ان مجبور و مقہور بے گناہ سر فروشوں کی تعداد بھی سامنے آنی چاہئے جو کشمیر کی آزادی کیلئے قلم کر دیئے گئے۔ ان اجتماعی قبروں میں دفن گمنام شہداء کا بھی حساب ہونا چاہئے جن کی مائیں ابھی تک نوحہ کناں ہیں ، جن کے معصوم بچے اپنے والدین کی صورت دیکھنے کو ترس رہے ہیں۔ ان معصوم جوان بچیوں کا بھی حساب ترتیب دینا ہو گا جن کی عصمتیں لوٹ لی گئیں۔

سات دہائیاں پہلے اسی ملک کے پہلے وزیر اعظم نہرو نے خود پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی کو ٹیلیگرام میں کشمیریوں کو حقِ خود ارادیت دینے کا وعدہ کیا تھا اور بعد میں بھارتی وفد نے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر کشمیریوں کو حق خود ارادیت دینے کا وعدہ کیا تھا اور آج تک وہ قراردادیں عمل درآمد کی منتظر ہیں اور اس تمام عرصے میں کشمیریوں کو حق خود ارادیت سے محروم رکھ کے بھارت نے خود اپنی شکست تسلیم کر لی ہے اور ایک لاکھ سے زائد شہداء اور ہزاروں بیٹیوں کی عصمت و عفت کی قربانی اور وقت نے کشمیر کا فیصلہ سنا دیا ہے کہ ریاست کشمیر کے باسی بھارت کے ساتھ رہنے کیلئے قطعاً تیار نہیں۔ اگر بھارت کو اپنی کامیابی کا ایک فیصد بھی یقین ہوتا تو اب تک وہ اس عمل سے گزر چکا ہوتا۔ کشمیریوں کی ثابت قدمی اور بے پناہ قربانیوں کے سامنے اس نے ہتھیار پھینک دیئے ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایسے حیلے بہانے ڈھونڈ رہا ہے کہ کس طرح کشمیریوں کی تعداد کو کم دکھا کر عالمی فورم کے دباؤ کو کم کیا جا سکے۔

کیا دنیا کو اتنا بڑا دھوکہ دینے میں وہ کامیاب ہو سکیں گے کہ ہندوستان میں تو پچھلے 76 سالوں میں مسلمانوں کی آبادی 26٪ سے زائد بڑھ جائے اور کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد مسلسل کم ہوتی جائے۔ جموں، کٹھوعہ اور اس کے گرد و نواح میں غیر ریاستی باشندوں کو غیر قانونی طور پر آباد کرنے کی مکروہ سازش اسی بنیاد پر کی گئی ہے کہ تناسب میں تبدیلی لائی جا سکے جو کہ عالمی قوانین کی بھی کھلی خلاف ورزی ہے۔ کشمیر کے مرد حر سید علی گیلانی نے بروقت کشمیری قوم اور ساری دنیا کو اس سازش سے خبر دار کیا تھا: "حکومت مردم شماری کی مہم کے تحت نہ صرف یہاں تعینات فوج اور فورسز کی گنتی کر رہی ہے بلکہ ان بھکاریوں کی بھی گنتی کی جا رہی ہے جو پچھلے چھ مہینوں سے مقیم ہیں۔" مزید اس حکومتی خطرناک چال سے آگاہ کرتے ہوئے جناب سید علی گیلانی نے بالکل صحیح فرمایا تھا "دراصل ایک منظم سازش کے تحت بھارت کی ہندو شدت پسند تنظیموں کے ان عزائم کو پورا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جن کا مقصد جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کرنا ہے"۔

تاریخ کا یہ عبرتناک عمل ہے کہ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ کشمیریوں نے اپنے ایک لاکھ شہداء سے زائد کی قربانیوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر روس اور امریکا اپنی بے پناہ طاقت کے بل بوتے پر عراقیوں اور افغانیوں کو نہ دبا سکے تو بھارت تو ان سے زیادہ طاقتور نہیں ہے۔ مجھ سے ایک امریکی صحافی نے سوال کیا کہ "آخر نہتے کشمیری اور کتنی دیر لڑتے رہیں گے؟" "بہتر ہوتا اگر تم یہ سوال بھارتی حکومت سے کرتے کہ وہ کتنی دیر اور کشمیریوں سے لڑنے کی ہمت رکھتے ہیں"! میرے دل سے اٹھنے والی یہ آواز شائد کشمیریوں کے ترجمانی کر سکی یا نہیں لیکن اس امریکی صحافی نے فوری اس بات کا اعتراف کیا کہ مظلوم کی طاقت کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکا، یہی تاریخ کا عبرتناک سبق ہے جو بالآخر ان ظالموں کا مقدر بنے گا"۔

مجھے چند دن پہلے ایک کشمیری نوجوان کی ایک طویل ای میل موصول ہوئی، اس نے یہ تین سوال بھی پوچھے ہیں:

1۔ بھارت دنیا کے کئی پلیٹ فارم پر سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن اس نے آج تک کسی آزاد پریس میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کو کشمیر کی حالتِ زار دیکھنے اور ان کی آزادانہ رائے کو دنیا کے سامنے لانے کی اجازت کیوں نہیں دیتا؟

2۔ اگر چند لمحوں کیلئے (صرف سمجھانے کیلئے) فرض کر لیا جائے کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے تو بھارت کے آئین کی کون سی شق اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے ہی ملک کے ایک لاکھ سے زائد کشمیریوں کو بے رحمی سے قتل کر دے؟

3۔ اگر بھارتی فورسز کے افرادرات کی تاریکی میں حکومتی اندھی طاقت اور اسلحے کے زور پر ایک گھر میں داخل ہو کر ایک بوڑھی عورت سے لیکر ایک دس سالہ بچی کی عصمت دری کر دے اور گھر کے تمام افراد کو گولیوں سے بھون کر اپنے جرم کو چھپانے کیلئے اس گھر کو نذرِ آتش کر دے، بعد ازاں اس بدنصیب گھر کا ایک زخمی بچ جائے اور انصاف نہ ملنے کی صورت میں وہ خود انتقام لینے کیلئے کوئی کوشش کرے تو اسے آپ دہشتگرد کہیں گے؟

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ: کہہ دو کہ ملک میں چلو پھرو پھر دیکھو کہ گنہگاروں کا انجام کیا ہوا ہے۔ (نمل:69)

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ۔

اور تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو خیال کرتے ہو کہ (اپنی جگہ پر) کھڑے ہیں مگر وہ (اس روز) اس طرح اُڑے پھریں گے جیسے بادل۔ (یہ) خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔ بے شک وہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے (نمل:88)

بروز منگل 28 جمادی الثانی 1445ھ 9 جنوری 2024ء

سرخ گلاب کی دبیز چادر

انسان کی تخلیق بے شک خداوند قدوس کا ایک بہت عظیم کارنامہ ہے پھر اس تخلیق کو خالق نے اشرف المخلوقات کہہ کر اس کی عظمت کا معیار بھی مقرر کر دیا، ساتھ ہی زمین آسمان، سورج، پانی ہوا بلکہ ساری کائنات کی تخلیق کر کے انسانی زندگی کے تسلسل کا سامان بھی پیدا فرماتے ہوئے یہ حکم بھی صادر فرما دیا کہ کسی ایک انسان کا قتل ساری انسانیت کا قتل ہے۔ ان واضح احکامات کے باوجود بہت سے فراعین، ظالم بادشاہوں، جمہوریت کا نعرہ لگانے والی حکومتوں، فوجی اور سیاسی آمروں نے انسانیت کا بے دریغ قتل کر کے اپنے ہاتھ انسانی خون سے رنگے۔ پہلی جنگ عظیم میں انسانوں کا قتل، دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کے ہاتھوں انسانی جانوں کا ضیاع، جاپانی شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکا کا ایٹمی حملہ جس میں نہتے لوگوں کی ہڈیاں بھی راکھ بن گئیں، ویت نام، کوریا، بوسنیا، ایران عراق، فلسطین، عرب اسرائیل اور گلف کی لڑائیوں میں بے پناہ لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ اب ایک مرتبہ پھر غزہ میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے، عراق اور افغانستان میں جو ہوا، وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے لیکن کشمیر کی صورتحال سب سے زیادہ ابتر اور ناروا ہے اور دن بدن ساری دنیا کے امن کیلئے ایک خطرناک دھماکہ خیز ہوتی جا رہی ہے کہ اس مسئلے کے تین فریقوں میں سے دو ایٹمی صلاحیت کے حامل ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ میڈیا کی آزادی اب زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہونا شروع ہو گئی ہے۔ چند سال پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قدر سرعت کے ساتھ کسی ملک میں ہونے والے کسی ظلم و جبر یا ہونیوالی برائی یا کوئی ایسا خفیہ گوشہ آن کی آن میں ساری دنیا کے سامنے آجائے گا اور مہذب معاشروں میں اس کا خاطر خواہ ردعمل بھی ہو گا لیکن حیرت ہے ان افراد کی سوچ پر جو آج بھی بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کوئی پرواہ کئے بغیر اپنی اسی پرانی روش کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ کہتے ہوئے اپنے ظلم و ستم میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔

سرینگر اور دہلی کے درمیان صرف پچھلے 25 برسوں میں ایک لاکھ سے زائد کشمیری شہداء کی قبروں کے سات سو قبرستانوں کا سمندر حائل ہو چکا ہے اور بالخصوص گزرے ہوئے چند برس میں ایسا کون سا زخم اور دکھ ہے جو مجبور و مظلوم کشمیری عوام نے دہلی میں براجمان حکومتی جنتا کے ہاتھوں نہیں سہا ہے۔ کشمیریوں اور بھارتی حکومت کے درمیان بے یقینی اور نفرتوں کا سمندر اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ اس کو پاٹنے کی ہر کوشش کا الٹا نتیجہ نکل رہا ہے۔

صرف سرینگر کے شہر خموشاں کی آبادی میں حالیہ برسوں میں اس تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے کہ اب بھارتی استبداد کا شکار ہونے والے نوجوانوں کی تدفین کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ وہ شہداء کے قبرستان ہیں جن کے دروازے پر لگے ہوئے بینر کے الفاظ پر شہر خموشاں کی طرف سے وہ پہلی سلامی موصول ہوتی ہے کہ "ہمیں فراموش نہ کرنا، ہم نے آپ کے "کل" پر اپنا آج" قربان کر دیا ہے ہر گزرنے والی کی آنکھوں کو اشکبار کر دیتے ہیں اور تیز چلنے والے قدم کچھ دیر کیلئے اپنی تمام مصروفیات کو بھول کر اپنے آنسوؤں کی سلامی کے ساتھ تجدید عہد کے ساتھ حاضر ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے سینکڑوں قبرستانوں میں سے ایک قبرستان کا نحیف و نزار، ادھیڑ عمر عبدالحمید گورکن جو برسوں سے اپنے دل میں ڈھیروں داستانیں چھپائے اس شہر خموشاں کی دیکھ بھال کو اپنے لئے ایک اعزاز اور بخشش و نجات کا وسیلہ سمجھ کر دن رات خدمت میں مصروف ہے۔

عبدالحمید کبھی کبھی اپنی نمناک آنکھوں کو بند کر کے 1990ء سے لیکر آج تک ہونے والے بھارتی مظالم کو یاد کرتا ہے تو بے اختیار اس کے منہ سے ایک

ہوک سی نکل جاتی ہے کہ مسلسل کئی دن تک پندرہ سے زیادہ شہیدوں کو ہر روز لحد میں اتارنے کا فریضہ سر انجام دیتا رہا ہے اور بالخصوص معصوم بچوں کی تدفین کا سلسلے کو بتاتے ہوئے اس کی زبان سے کہیں زیادہ اس کے نہ رکنے والے اشک ساری کہانی بتا دیتے ہیں اور دیکھنے والے کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔

عبدالحمید کا کہنا ہے شہر خموشاں کے نگراں جلسے جلوسوں اور مظاہروں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے تھے کہ شہداء کی کتنی تعداد گھر واپس جانے کی بجائے اس شہر خموشاں کا رخ کریں گے اور اسی حساب سے ہم نوجوان شہداء کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیتے تھے۔ بیتے دنوں کے واقعات کریدتے ہوئے اس کی سانس پھول رہی تھی اور صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر دباؤ میں ہے۔ سامنے معصوم شہدا بچوں کی قبروں کی طرف اشارہ کر کے اپنی یادیں سنا رہا تھا کہ جب فوج اور پولیس کے خلاف پتھر پھینکنے والے کم عمر لڑکے یا معصوم طلبا میدان میں اترے تو دوسری طرف سے بھارتی فوجیوں نے اندھا دھند پیلٹ گن سے بھون دینے کا انسانیت سوز سلسلہ شروع کر دیا تو گورکنوں نے شہداء کی لاشیں آنے سے پہلے ہی پچاس نئی قبریں تیار کر لیں جو کہ بعد میں کم پڑ گئیں۔ بقول عبدالحمید "پہاڑوں سے اترتی موت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ مسلح درندوں کے مقابلے میں سنگباز جوان اپنی جانیں بے دریغ انداز میں قربان کرنے کیلئے واضح طور پر نظر آتے تھے جبکہ گولیاں چلانے والوں کے ناپاک عزائم بھی کبھی ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ موت تھوک کے حساب سے آئے گی، اسی لئے ہم نے پیش بندی کے طور پر اپنا کام جلدی جلدی مکمل کرنا شروع کر دیا تھا"۔

تھوڑی دیر کیلئے عبدالحمید خاموشی سے آسمان تکتا رہا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن شائد اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ یکدم اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کے چشمے ابلنے لگے۔ اس نے ایک قبر کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ قبر ایک بارہ سالہ بچے کی ہے جو اپنی شہادت سے ایک ہفتہ قبل ہر روز بلاناغہ ان شہداء کی قبروں پر اپنی بہت ہی خوبصورت مترنم آواز میں قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف رہتا تھا۔ اپنی شہادت سے چار دن پہلے اس نے مجھ سے سوال کیا "چچا! تم تو برسوں سے اس قبرستان میں موجود ہو اور ہزاروں شہداء کی قبروں کو کھودنے کی سعادت بھی تم کو حاصل ہے۔ کوئی ایک مثال ایسی تو بتاؤ جب تمہیں کسی کو دفناتے ہوئے ہوئے سب سے زیادہ دکھ ہوا ہو؟

میں اس بچے کے سوال پر چونک گیا اور اس کو یہاں سب سے کم عمر شہید دو سالہ بچے ثاقب بشیر کی قبر پر لے گیا جسے اس کی ماں کے ساتھ بھارتی ظالم ظالم فوج نے فائرنگ کر کے تقریباً آٹھ سال پہلے شہید کر دیا تھا۔ اس بارہ سالہ بچے نے پہلے ان دونوں قبروں پر پڑے ہوئے پتوں کو ایک طرف کیا اور اس کے بعد بہت ہی دردناک آواز میں اس قبر پر قرآن کی تلاوت کی اور سلام کر کے رخصت ہونے لگا تو اونچی آواز میں بولا: بابا اگر میں شہید ہو جاؤں تو مجھے بھی اس بچے کی بغل میں دفن کرنا کیونکہ میرے گھر میں اب کوئی بالغ مرد و عورت نہیں بچا جو میری میت کے ساتھ آسکیں۔ میں نے یہ سن کر فوری طور پر گلے سے لگایا کہ یہ سب نوجوان میرے ہی بیٹے ہیں جن سے شب و روز میری ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ میں نے اس کو کرفیو کی پاسداری کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے گھر لوٹ جانے کو کہا۔ عبدالحمید کچھ دیر کیلئے پھر خاموش ہو گیا جیسے وہ اپنی قوتِ گویائی کو اکٹھا کر رہا ہو اور اچانک اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور ہونٹوں پر ایک تفاخرانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے بڑے یقین کے ساتھ بتایا کہ ان شہداء کے چہروں پر میں نے جو اطمینان اور مسکراہٹ دیکھی ہے، میں ان کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کا ثبوت یہ ان دیکھی خوشبو ہے جو ہر آنے والے کا استقبال کرتی ہے۔

اپنی یادداشتوں کو دہراتے ہوئے گویا ہوا: ہر شہید کی میت دیکھ کر قدرتی طور پر صدمہ ہوتا ہے لیکن یہ تو میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ شہداء کی قبروں پر جس بچے نے چند دن پہلے جس سوزو گداز سے قرآن کریم کی تلاوت کی تھی، تین دن کے بعد مجھے اسی بچے کو دوسرے چھ بچوں سمیت اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارنا پڑے گا۔ اس معصوم شہید کی میت دیکھ کر میرے دوسرے ساتھیوں کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا۔ ہم نے اس شہید کو بھی اسی دوسالہ ثاقب بشیر کے ساتھ ہی دفن کر دیا جس کے جسدِ خاکی کو پاکستانی پرچم میں لپیٹا ہوا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس بچے نے دوماہ پہلے اپنی والدہ کو یہ وصیت کی تھی کہ میں جب شہید ہو جاؤں تو مجھے پاکستانی پرچم میں دفن کرنا اور میرا جنازہ سید علی گیلانی پڑھائیں۔ سید علی گیلانی کو تو بھارتی درندوں نے پچھلے کئی برس سے نظر بند کر رکھا تھا اور باوجود کوشش کے ان کو بچے کا جنازہ پڑھانے کی اجازت نہ مل سکی لیکن میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں جب تک زندہ رہوں گا، ہمیشہ اس بچے کی قبر کو سرخ گلاب کے پھولوں کی دبیز چادر میں اپنے آنسو ملا کر سجائے رکھوں گا"۔ کیا ایسی قوم کو مزید غلام بنا کر رکھا جا سکتا ہے جو موت کو اپنی زندگی قرار دے چکی ہو، یقیناً ہرگز نہیں۔

ہر پھول کی قسمت میں کہاں نازِ عروساں
کچھ پھول تو کھلتے ہیں مزاروں کیلئے بھی

بروز منگل 28 جمادی الثانی 1445ھ 9 جنوری 2024ء

تاریخ کا رخ بدلنے والا ہے!

آپ کے بچے بھلے آپ سے پوچھیں یا نہ پوچھیں، آپ انہیں یہ ضرور بتائیں کہ ہم فلسطین سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ انبیاء کا مسکن اور سرزمین ہے ۔ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فلسطین کی طرف ہجرت فرمائی۔ اسی سرزمین پر حضرت لوط علیہ السلام کو عذاب الٰہی سے نجات ملی۔ حضرت ۔دنیا کے سب سے طاقتور حضرت سلیمان علیہ السلام اسی سرزمین داؤد علیہ السلام کا یہ مسکن یہیں اپنا ایک محراب بھی تعمیر فرمایا جو آج بھی موجود ہے پر بیٹھ کر ساری دنیا پر حکومت فرمایا کرتے تھے۔ اسی سرزمین کے ایک شہر عسقلان میں چیونٹی کا وہ مشہور قصہ پیش آیا جس کا نام بعد ازاں وادی النمل (چینٹوں کی وادی) رکھا گیا جس کا قرآن میں ذکر ہے: حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کُوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا "اے چیونٹیو، اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان (علیہ السلام) اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا محراب بھی اسی شہر میں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی ملک کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ اس مقدس شہر میں داخل ہو جاؤ۔ انہوں نے اس شہر کو "مقدس" شرک سے پاک ہونے اور انبیاء علیہم السلام کا مسکن ہونے کی وجہ سے کہا تھا۔ اس شہر میں کئی معجزات وقوع پذیر ہوئے جن میں ایک کنواری بی بی حضرت مریم کے بطن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت مبارکہ بھی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب یہودی قوم نے قتل کرنا چاہا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اسی شہر سے آسمان پر اُٹھا لیا تھا۔ ولادت کے بعد جب عورت اپنی جسمانی کمزوری کی انتہاء پر ہوتی ہے ایسی حالت میں بی بی مریم کا کھجور کے تنے کو ہلا دینا بھی ایک معجزہ الٰہی ہے۔ قیامت کی علامات میں سے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسی زمین پر مقام سفید مینار کے پاس تشریف لائیں گے۔ پھر اسی شہر کے ہی مقام باب لُد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسیح دجال کو قتل کریں گے۔

فلسطین ہی ارض محشر ہے، اور اسی شہر سے ہی یاجوج وماجوج کا زمین میں قتال اور فساد کا کام شروع ہو گا۔ اس شہر میں وقوع پذیر ہونے والے قصوں میں سے ایک قصہ طالوت اور جالوت کا بھی ہے۔ فلسطین کو نماز کی فرضیت کے بعد مسلمانوں کا قبلہ اول ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ہجرت کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دوران نماز ہی حکم ربی سے رسول اکرم ﷺ کو مسجد اقصیٰ (فلسطین) سے بیت اللہ کعبہ مشرفہ (مکہ مکرمہ) کی طرف رخ کرنے کا حکم پہنچایا تھا اور جس مسجد میں یہ واقعہ پیش آیا وہ مسجد آج بھی مسجد قبلتین کہلاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ معراج کی رات آسمان پر لے جانے سے پہلے مکہ مکرمہ سے یہاں بیت المقدس (فلسطین) لائے گئے جہاں رسول اکرم ﷺ کی اقتداء میں تمام انبیاء علیہم السلام نے نماز ادا کی، اس طرح فلسطین ایک بار پھر انبیاء کا مسکن بن گیا۔

سیدنا ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ زمین پر سب سے پہلی کون سی مسجد بنائی گئی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) میں نے عرض کیا کہ پھر کون سی؟ (مسجد بنائی گئی تو) آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسجد الاقصیٰ (یعنی بیت المقدس) میں نے پھر عرض کیا کہ ان دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ چالیس برس کا اور تو جہاں بھی نماز کا وقت پالے، وہیں نماز ادا کر لے، پس وہ مسجد ہی ہے۔

آپ ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ارتداد کے فتنہ اور دیگر کئی مشکلات سے نمٹنے کیلئے عسکری اور افرادی قوت کی اشد ضرورت کے باوجود بھی ارض شام (فلسطین) کی طرف آپ ﷺ کا تیار کردہ لشکر بھیجنا بھی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے۔ اسلام کے سنہری دور فاروقی میں دنیا بھر کی فتوحات کو چھوڑ کر محض فلسطین کی فتح کیلئے خود سیدنا عمر کا چل کر جانا اور یہاں پر جا کر نماز ادا کرنا اس شہر کی عظمت کو اجاگر کرتا ہے۔ دوسری بار بعینہ معراج کی رات بروز جمعہ 27 رجب 583 ھجری کو صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں اس شہر کا دوبارہ فتح ہونا بھی ایک نشانی ہے۔

بیت المقدس کا نام قدس قران سے پہلے تک ہوا کرتا تھا، قرآن نازل ہوا تو اس کا نام مسجد اقصیٰ رکھا گیا۔ قدس اس شہر کی اس تقدیس کی وجہ سے ہے جو اسے دوسرے شہروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس شہر کے حصول اور اسے رومیوں کے جبر و استبداد سے بچانے کیلئے پانچ ہزار سے زیادہ صحابہ نے جام شہادت نوش کیا اور شہادت کا باب آج تک بند نہیں ہوا، سلسلہ ابھی تک چل رہا ہے۔ یہ شہر اس طرح شہیدوں کا شہر ہے۔ مسجدِ اقصیٰ اور بلادِ شام کی اہمیت بالکل حرمین الشریفین جیسی ہی ہے۔ جب قران پاک کی یہ آیت (وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ وَطُورِ سِينِينَ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ) نازل ہوئی تو ابن عباس کہتے ہیں کہ ہم نے بلاد شام کو "الزیتون" انجیر سے، بلاد فلسطین کو "التین" سے اور طور سینین مصر کے پہاڑ کوہ طور سے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سے کلام کیا کرتے تھے سے استدلال کیا۔ قرآن کی یہ آیت مبارک (وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ) سے یہ استدلال لیا گیا کہ امت محمد حقیقت میں اس مقدس سرزمین کی وارث ہے۔ فلسطین کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں پر پڑھی جانے والی ہر نماز کا اجر 5 سو گنا ہے۔

گزشتہ دو ماہ سے غزہ فلسطین میں خون کی ہولی کھیلنے والوں سے ہر ذی شعور واقف ہے لیکن امریکی نیشنل سکیورٹی کا کوآرڈینیٹر جان کربی میڈیا پر آنسو بہا رہا ہے۔ اس کے یہ آنسو افغانستان میں 11 لاکھ سے زیادہ، عراق میں 13 لاکھ سے زیادہ، شام میں 10 لاکھ سے زیادہ، لیبیا میں 5 لاکھ سے زیادہ اور یمن میں 4 لاکھ سے زیادہ افراد کی زندگیاں اجاڑنے پر نہیں مگر ایک ناجائز ریاست اسرائیل اور اس میں رہنے والے غاصبوں کی ممکنہ شکست پر بہا رہا ہے۔ لیکن تاریخ سے کوئی سبق حاصل کرنے کو تیار نہیں۔ یاد رکھیں! جب مکہ کی گلیوں میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی اور رسول اکرم ﷺ قیصر و کسری فتح کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ بنی اسرائیل کو بچے پیدا کرنے کی اجازت نہ تھی اور موسیٰ علیہ السلام فرعون سے آزادی کا خواب دکھا رہے تھے۔ روس کی کمیونسٹ پارٹی کو اپنے ملک میں بات کرنے کی اجازت نہیں تھی اور لندن میں تخت پلٹنے کی باتیں کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ بڑے خوابوں اور آئیڈلزم کی باتیں کرنے والوں نے ہی تاریخ کا رخ بدلا ہے، حالات کے مطابق ڈھلنے والوں نے وقتی مفاد تو شاید اٹھایا ہو مگر کوئی تاریخی تبدیلی ان کے بس کی بات نہیں۔ عالمی سامراج کی اجارہ داری کا سورج غروب ہونے جا رہا ہے۔ یہ اس بات پر فکر مند ہیں کہ چاروں طرف سے محصور حماس کس طرح پچھلے دو ماہ سے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں اور آب تک اسرائیل اپنے قیدیوں کو نہیں چھڑوا سکا۔

بستیوں کو مری روند تا کون ہے؟

ان دنوں اس زمیں پر خدا کون ہے؟

بے توازن سی ہے کیوں یہ دنیا بہت

کون محور ہے اب، دائرہ کون ہے؟
روز ملتی ہے بس سانحوں کی خبر
کچھ کھلے تو، پس سانحہ کون ہے؟
جبر کی سلطنت کی حدیں ہیں کہاں
اس حکومت کا فرماں روا کون ہے؟
ہم کو لازم ہے اپنے کئے کی سزا
پر یہ انجام سے ماورا کون ہے؟
روشنی بانٹنے کے بہانے یہاں
آگ دہلیز پر رکھ رہا کون ہے؟
جیسے میرا یہ گھر بھی ہو اس کا ہی گھر
میرے آنگن میں یوں گھومتا کون ہے؟
میری مرضی کے یہ فیصلے تو نہیں
میرے سب فیصلے کر رہا کون ہے؟
ہم تو اپنے ہی مسکن میں ہارے ہوئے
شوق تسخیر میں مبتلا کون ہے؟
ہم تو اپنی ہی شاخوں پہ سہمے ہوئے
حد پرواز سے آشنا کون ہے؟
ہم تو اپنے ہی غاروں میں محو دعا
اور خلاؤں سے گزرا ہوا کون ہے؟
ہم تو اپنے ہی سورج سے ملتے نہیں
آسمانوں سے ملنے گیا کون ہے؟
ہم تو کم فہم اور نا سمجھ لوگ ہیں
اپنی عیاریوں میں سوا کون ہیں؟
جب بدن کے ہی گھاؤ نہ دیکھے گئے
زخم روحوں کے پھر دیکھتا کون ہے؟
میرے سچ پر کیا سب نے یہ تبصرہ
سچ تو سچ ہے مگر بولتا کون ہے؟

بروز جمعرات یکم رجب المرجب 1445ھ 11 جنوری 2024ء

طاقت اور بد دعاؤں کی جنگ

ہلا کو خاں جب بغداد پہنچا تو اس کے سپاہیوں نے قتل و غارت گری شروع کر دی، سنگ دل منگولوں کو جہاں کوئی سر سلامت دکھائی دیا، انہوں نے کاٹ دیا، جہاں کوئی عمارت نظر آئی، جلا کر خاکستر کر دی، جہاں کوئی کتب خانہ، لائبریری یا کوئی درسگاہ ملی اس کو راکھ کر دیا۔ تاریخ کہتی ہے کہ خون کے دھبے اور راکھ کے داغ دھوتے دھوتے دجلہ کا پانی سوکھ گیا لیکن منگولوں کی وحشت کے آثار نہ مٹے۔ اسی قتل و غارت گری کے دوران عراقی صوفیوں کا ایک گروہ منگول سپاہیوں کے ہتھے آ چڑھا، سپاہی زہد کے بوجھ تلے دبے ان بزرگوں کو لیکر ہلا کو خان کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ سپاہیوں کا کہنا تھا کہ یہ صاحبانِ دعا ہیں، عراقیوں کے بقول ان کی دعا بارگاہِ رب العزت میں قبولیت کی سند رکھتی ہے۔

ہلا کو خان نے نخوت سے پوچھا "پھر کیا" سپاہیوں نے جواب دیا "حضور! یہ لوگ آپ کو بد دعائیں دے رہے تھے" ہلا کو خان صوفیاء کے اس گروہ کی طرف مڑا اور جلالی لہجے میں اس الزام کی تصدیق چاہی۔ صوفیائے کرام میں سے ایک نسبتاً بزرگ نے اقرار میں گردن ہلا کر جواب دیا "اے بادشاہ! تم خلقِ خدا کے قاتل ہو، تم نے ہزاروں بے گناہوں کا لہو بہایا، تم نے اللہ کی مقدس کتابوں کی توہین کی، تمہارے سپاہیوں کے گھوڑوں نے مسجدوں کا تقدس پامال کیا، لہٰذا تم اب اللہ کے انتقام سے بچ نہیں پاؤ گے، تمہیں اس زمین پر حساب دینا ہو گا"۔

ہلا کو خان اور اس کے حواری اس کہنہ بزرگ کی جرأت پر حیران ہو گئے۔ سپاہیوں نے تلواریں سونت لیں، لیکن اس سے قبل کہ تلواریں اپنا کام دکھاتیں، ہلا کو خان نے اشارہ کیا، ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا اور صوفیائے کرام کے اس گروہ سے مخاطب ہو کر بولا "اے شکست خوردہ بزدل قوم کے مظلوم بزرگو! بغداد کی تباہی کے بعد ہلا کو خان کا حساب ہوا بھی تو کیا ہوا، اب اگر تمہاری بد دعائیں قبول بھی ہو جائیں، ہلا کو خان کو سو بار جنم دیکر سو بار قتل بھی کر دیا جائے، تو بھی بغداد آباد نہ ہو گا، گردن سے اترے سر دوبارہ شانوں پر نہیں لگیں گے، خاک ہوئی عمارتیں اور راکھ ہوئے کتب خانے دوبارہ آباد نہیں ہوں گے، اب دنیا کا کوئی انتقام دجلہ کے کناروں پر گھاس نہیں اگا سکتا۔" ہلا کو خان اٹھا، صوفیاء کے گروہ کے قریب پہنچا اور ان پر نظریں گاڑ کر بولا "جاؤ میں تمہیں اس قبرستان میں زندہ رہنے کی سزا دیتا ہوں"۔

ہلا کو خان بغداد سے واپس چلا گیا. اب تو معلوم نہیں قدرت نے واقعی ہلا کو خان سے انتقام لیا یا پھر آسمانی طاقتیں اس سے رعائت برت گئیں لیکن جہاں تک بغداد کی تباہی کا معاملہ ہے آج بھی تاریخ جب اس موڑ پر پہنچتی ہے تو اپنے بال کھول دیتی ہے اور اس کے منہ سے دردناک بین کی آوازیں آنے لگتیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ قتل کے بعد قاتل پھانسی چڑھے یا عمر قید کی سزا بھگتے، مقتول کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ پانچ ہزار قاتلوں کی پھانسی بھی ایک مقتول، ایک مظلوم کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتی لیکن کیا کیجئے خوش فہمی بھی بڑی چیز ہے۔ دنیا کے تمام کمزور، بزدل اور مظلوم لواحقین اپنے پیاروں کی لاشیں سمیٹتے ہوئے، مظلوموں اور مقتولوں کو آخری غسل دیتے ہوئے یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتے رہتے ہیں کہ "آخر کسی نہ کسی روز قاتل نے بھی مر جانا ہے"۔

لمحہ موجود میں سارا عالمِ اسلام اسی خوش فہمی کا شکار ہے، پوری مسلم امّہ کے دانشور امریکا کی تباہی، امریکا کی بربادی کی پیشین گوئیاں کر رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یورپ امریکا کے خلاف اٹھ کھڑا ہو گا، کسی کا کہنا ہے کہ عراق کی راکھ سے ہزاروں لاکھوں اسامہ پیدا ہوں گے، افغانستان کے سیاہ پہاڑوں

سے لاکھوں ملا عمر کے لشکر نکلیں گے، اب امریکا اور اس کے اتحادیوں کا کوئی شہری چین کی نیند نہیں سو سکے گا، کوئی اعلان فرماتا ہے کہ "ڈی ڈے" شروع ہو چکا ہے لیکن کوئی ان سے پوچھے بغداد کی تباہی اور موت کے بعد "ڈی ڈے" شروع ہوا، امریکیوں اور اس کے اتحادیوں کی نیندیں حرام ہوئیں، ہزاروں بن لادن پیدا ہوئے، لاکھوں ملا عمر میدان میں اترے یا یورپ امریکا کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تو کیا فائدہ؟ کیا بغداد اور افغانستان کے بے گناہ لوٹ آئیں گے؟

میرے ایک دوست اسی قسم کی مذہبی خوش فہمی کا شکار ہیں۔ وہ کل میرے پاس تشریف لائے اور آتے ہی فرمانے لگے "مظلوم عراقیوں، بے بس افغانیوں، کشمیریوں اور بے گناہ پاکستانیوں کی نعشیں کہہ رہی ہیں امریکا اور اس کے تمام ساتھیوں کا بدترین انجام قریب ہے، تم اپنے پاس لکھ کر رکھ لو امریکا اور اس کے موجودہ اتحادی عنقریب تباہ و برباد ہو جائیں گے"۔ میں نے قہقہہ لگایا، اس کا کالر جھاڑا اور بڑے پیار سے کہا "برادرم! غصے اور انتقام کی تلخی اس طرح تو دور نہیں ہو گی، امریکا اور اس کے اتحادی بے شک دس ہزار مرتبہ تباہ ہوں لیکن ہمارے اوپر گر کر تو تباہ نہ ہوں"۔ میرے دوست کو میری بات ناگوار گزری اور ناراض ہو کر منہ بسور کر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک خوش فہم شخص اسی ردعمل کا اظہار کر سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میرے دوست کی خوش فہمی درست ثابت ہو، واقعی کل کا سورج طلوع ہو تو دنیا کے نقشے پر اٹلانٹک اوشن اور بحر ہند کے پار چند بدبودار جوہڑوں اور جلی سڑی چٹانوں کے سوا کچھ نہ ہو لیکن یہ ابھی محض "ہو سکتا" ہے، امکان، گمان یا خیال ہے۔ آج کی حقیقت تو یہ ہے کہ عراق کی سرزمیں نعشوں سے اٹ چکی، افغانستان میں لاشیں بچھ چکیں، کشمیر کے لاکھوں باشندے موت کو گلے لگا چکے، جب امریکی ڈرون کا بھی پاکستانیوں کے پرخچے اڑا کر سانس پھول چکا تب اس نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی، بش، رمز فیلڈ، کولن پاؤل، رچرڈ باؤچر، اوباما، ہالبروک، ٹرمپ اور اب بائیڈن، جنرل مشرف، زرداری، نواز، عمران خان، مودی، امیت شاہ اور اب نیتن یاہو رہیں یا ختم ہو جائیں، امریکا، بھارت، اسرائیل اور یورپ باقی بچے یا تباہ ہو جائیں، ان نعشوں، ان جلی سڑی عمارتوں کو اس سے کوئی غرض نہیں۔

زمینی حقائق تو یہ ہیں کہ خادمین حرمین اپنے ہاتھوں سے پہلے ٹرمپ کو اور بعد ازاں نہ صرف مودی کو ملک کا سب سے بڑا سول اعزاز پہنا چکے بلکہ ملک کا سب سے بڑا ادارہ "آرامکو" عملی طور بھارتی افراد کے سپرد ہو چکا اور مہاراشٹر کی ریفائنری سمیت دیگر اداروں میں 75 بلین ڈالرز کی سرمایہ کاری بھی ہو چکی۔ ٹرمپ کے داماد کی کامیاب سفارت کاری کے جواب میں پانچ عرب ممالک اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کر کے ایک دو سے کو گلے لگا چکے اور اب تجارتی تعلقات عروج پر ہیں۔ امریکی خبر رساں ادارے "اے پی" کی رپورٹ کے مطابق بھارت میں 100 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری، اہم اقتصادی شراکت داری اور تجارتی مفادات کے باعث خلیجی ممالک نے مقبوضہ کشمیر میں آرٹیکل 370 ختم کرنے کے بھارتی اقدام پر چپ سادھ لی تھی بلکہ یو اے ای نے مودی کو ملک کا سب سے بڑا سول اعزاز دیکر پاکستان کو باقاعدہ پیغام بھی دے دیا۔

اب غزہ میں وحشیانہ ظلم میں اسرائیل کی پشت پر کھڑے چہروں کے نقاب بھی نمایاں ہو گئے ہیں۔ غزہ کی جنگ کی ابتداء میں امریکی وزیر خارجہ انتھونی بلنکن کا ڈرامائی انتقامی اور مکارانہ کردار اب مگرمچھ کے آنسو بہا رہا ہے اور یہ تمام طاقتیں پریشان ہیں کہ آخر حماس پچھلے دو ماہ سے ختم کیوں نہ ہو سکی اور

اب تک محصور غزہ کے چپے چپے کو تباہ کرنے کے باوجود اسرائیلی قیدی رہا کیوں نہ ہو سکے؟ اب ایک مرتبہ پھر ایک نئے چہرے کے ساتھ خطے میں پڑوسی عرب ریاستوں کے دورے میں مصروف ہیں۔

ادھر حوثیوں نے بحیرہ احمر سے گزرنے والے بڑے بحری جہازوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے اور اب لبنان میں حماس کے اہم رہنماؤں کی ڈرون حملے میں ہلاکت ایک ایسا واقع ہے جو حالات کو خطرناک راستے پر ڈال سکتا ہے۔ خطے کی دوسری ریاستی اور غیر ریاستی طاقتیں اس جنگ میں بھرپور طریقے سے شامل ہونے کیلئے پر تول رہی ہیں۔ حزب اللہ کے سربراہ نصر اللہ بھی میدان میں خم ٹھونک کر للکار رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہودی نژاد بلنکن اپنے دورہ کے دوران اپنی طاقت کے مظاہرہ میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں؟

ہلاکو خان نے بغداد ہی کی سرزمین پر کھڑے ہو کر کہا تھا کہ "طاقت اور بددعاؤں کی جنگ میں طاقت ہمیشہ پہلی فاتح ہوتی ہے۔
رہے نام میرے رب کا جس کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔

وجہِ بے رنگیٔ گلزار کہوں تو کیا ہو
کون ہے کتنا گناہ گار کہوں تو کیا ہو
تم نے جو بات سرِ بزم نہ سننا چاہی
میں وہی بات سرِ دار کہوں تو کیا ہو

بروز جمعۃ المبارک 2 رجب المرجب 1445ھ 12 جنوری 2024ء

غلاظت، سڑاند بھرے کچرا گھر

وہ باباجی کے دونوں اعتراض درست تھے، میں خود بڑے عرصے سے محسوس کر رہا ہوں، میری تحریر میں ایک بیزاری، ایک لاتعلقی سی آچکی ہے۔ تلخی، وہ آگ اور وہ سلگتا ہوا درد ختم ہوتا جا رہا ہے جو اس تحریر کی پہچان تھا۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میں اکثر خود سے سوال کرتا ہوں۔ ہر بار میں خود کو یہی جواب دیتا ہوں، کوئی نیا موضوع، کوئی نیا ایشو نہیں۔ میں نے باباجی کو بھی یہی جواز پیش کیا۔ میں نے انہیں بتایا "باباجی! مہنگائی پر کتنے کالم لکھے جا سکتے ہیں؟ بیروزگاری، جہالت، لاقانونیت اور بیماری پر کوئی کہاں تک لکھ سکتا ہے؟ بدامنی، حکومتی رٹ، حکومتی بے حسی، لوٹ کھسوٹ، کرپشن، دفتری تاخیر، سرخ فیتہ اور سیاسی مکر و فریب پر کتنے ٹن مضامین چھاپے جا سکتے ہیں؟ آخر انسانی دماغ کی بھی ایک حد ہوتی ہے، آپ سیاپا بھی ایک حد تک کر سکتے ہیں، بچہ ماں کو کتنا پیارا ہوتا ہے، بچہ مر جائے تو ماں بین کرتی ہے، روتی ہے چلاتی ہے لیکن کتنی دیر؟ ایک گھنٹہ، ایک دن یا ایک ہفتہ، آخر بین چیخوں، چیخیں سسکیوں اور سسکیاں آہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، دلِ مضطرب کو چین آ جاتا ہے۔ ایک ہلکی سی کسک، درد کی ایک تھوڑی سی آہٹ باقی رہ جاتی ہے"۔

کالم نویسوں کے کالم بھی ایک بین، ایک چیخ ہوتے ہیں۔ یہ چیخ یہ بین بتاتے ہیں کہ لوگو! تمہارے ساتھ ظلم ہو گیا، تم لٹ گئے، تم برباد ہو گئے۔ اس چیخ، اس بین پر لوگ متوجہ ہو جائیں اور ظالم ٹھٹک کر رک جائے تو کالم اور کالم نویس کا فرض پورا ہو گیا لیکن اگر ظالم ان چیخوں، ان بینوں کے باوجود ظلم کرتا رہے، ایک لمحے کیلئے اس کا ہاتھ نہ رکے، اس کے ماتھے پر ندامت کا پسینہ تک نہ آئے، تو وہ چیخ، وہ بین ایک فضائی آلودگی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ لوگ بھی اگر اس چیخ اور اس بین کو معمولی سمجھیں اور ایک روٹین کا درجہ دے دیں تو بھی یہ چیخیں یہ بین آوازوں کے جنگل میں ایک جھاڑی، سوکھی سڑی اور ایک کچلی گھاس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ چوکیدار کے "جاگتے رہو" کے اعلان سے اگر چور گھبرائیں اور نہ ہی اہلِ محلہ کی آنکھ کھلے تو چوکیدار کیا کرے گا؟ اس کی پتلیوں میں بھی نیند ہچکولے لے گی، اس کا ضمیر بھی جمائیاں لینے لگے گا۔

یقین کیجئے میں جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو خود سے سوال کرتا ہوں، کس کیلئے لکھ رہا ہوں؟ ان لوگوں کیلئے جو غلامی سہنے کی عادت، زیادتیاں برداشت کرنے کی خو جن کی نس نس میں بس چکی ہے، جو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی داستان کو بھی ایک افسانہ سمجھ کر پڑھتے ہیں، جو اپنے قتل کے گواہ پر ہنستے ہیں یا اس حکومت کیلئے جو خدا ترسی کی اپیل کو پاگل اور قنوطیوں کا "واویلا" سمجھتی ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں، آپ بیل کو لیکچر کے ذریعے چیتا نہیں بنا سکتے۔ بھیڑیئے کے دل میں بھیڑ کیلئے ہمدردی بھی نہیں جگا سکتے، لہٰذا صاحبو! سچی بات ہے سیاپے کی یہ نائین (پیغام دینے والی مائی) تھک چکی ہے۔ آخر قبرستانوں میں اذان دینے کی ایک حد ہوتی ہے!

رہا دوسرا اعتراض تو میں نے پچھلی تین دہائیوں میں سیاستدانوں کے وہ رنگ دیکھے کہ لفظ سیاست سے مجھے بدبو آتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کسی کچرا گھر کی دیوار پر بیٹھا ہوں، ایسی دیوار جس میں اصول، انصاف، وفاداری، ایمانداری اور ضمیر نام کی ہر وہ خوبی، ہر وہ وصف گل سڑ رہا ہے، جس کی وجہ ایک درندہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے، مجھے ان اوصاف، ان خوبیوں کے لاشوں میں کیڑے رینگتے نظر آتے ہیں۔ میں نے ان پچھلی تین دہائیوں میں ان لوگوں کو اپنے محسنوں کو گالیاں دیتے دیکھا۔ میں نے فوجی حکمرانوں پر تنقید کرنے والوں کو ان کے تلوے چاٹتے دیکھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جنرل ضیاء الحق نے جب کہا تھا کہ میں ان سیاستدانوں کو اشارہ کروں تو یہ دم ہلاتے میرے پاس آنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کریں۔ میں اس وقت بھی سیاسی

تجزیے کے عنوان سے لکھتا تھا، اس لئے میں اشارے ہوتے اور دمیں ہلتی با آسانی دیکھتا بھی رہا اور اپنی بساط کے مطابق لکھتا بھی رہا لیکن مشرف کا دورِ اقتدار تو کل کی بات ہے، ہم سب نے کھلی آنکھوں سے اشارے کے بغیر دمیں ہلتیں اور زبانیں نکلتی دیکھیں ہیں۔ آپ کسی غیرت مند کو گالی دے سکتے ہیں لیکن جس کی آنکھوں کی شرم ہی مر چکی ہو، جسے پارٹی بدلتے، وفاداری تبدیل کرتے، نظریہ اور منشور بھلاتے اتنے دیر بھی نہ لگتی ہو جتنی بنیان بدلنے یا جرابیں تبدیل کرنے میں لگتی ہے تو آپ اس کو کتنا برا بھلا کہہ دیں گے۔ یار وان سے تو وہ شخص بہتر تھا جس نے یہ کہا تھا کہ میں انکار میں اتنا آگے جا چکا ہوں کہ میرے لئے واپسی ممکن نہیں۔ باباجی! آپ خود سوچیں بدبو کے اس جوہڑ پر کیا لکھا جائے؟ ان غلاظت اور سڑاند بھرے کیچڑ اگھروں سے کون سا سورج طلوع ہو گا، یہ لوگ کس مستقبل کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ کرپشن کی کوکھ میں پروان چڑھنے والے لوگ اپنی انا، اپنا ضمیر اور اپنی زبان گروی رکھ کر جنم لیا کرتے ہیں۔ وہ جمہوریت جو آمریت کے پیٹ میں ہلکورے لے رہی ہو اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ جو لوگ اپنے نظریئے پر قائم نہیں رہ سکے، جو اپنے لیڈروں کے نہیں ہو سکے وہ میرے یا آپ کے کیا ہوں گے۔ وہ میرے نظریات، میرے احساسات اور میرے جذبات کی کیا ترجمانی کریں گے۔ وہ میرے لئے تبدیلیوں کے کون سے سورج تراشیں گے، وہ انقلاب کے کن سویروں کی پنیریاں لگائیں گے؟

ہمارے یہ سیاستدان کشمیر کے مظلوم اور بیکس لوگوں کو کیا پیغام بھیج رہے ہیں جو پچھلے 76 سالوں سے بھارتی فوج کی نافذ کردہ پابندیوں کے باوجود اپنے حق کے حصول کیلئے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں اور اس تحریک کو ہر حال میں اپنے منطقی انجام تک پہنچانے کیلئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا چکے ہیں۔ بھارتی فوج 86 سالہ ضعیف مردِ حریت جناب سید علی گیلانی سے اس قدر خوفزدہ رہی کہ برسہابرس ان کو اور ان کے دوسرے کئی ساتھیوں کو جیل کی اذیت ناک کوٹھڑیوں میں بند رکھا اور ان کی پاکستانی جھنڈے میں ملبوس کفن سے اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ سارے کشمیر میں کرفیو نافذ کرنے کے باوجود ان کی میت کو فوری طور پر اپنے قبضے میں لیکر ان کی وصیت کے خلاف انتہائی عجلت میں حیدر پورہ کے قبرستان میں تدفین کر دی۔ کوئی ان ظالم درندوں کو تاریخ سے سبق حاصل کرنے کا کیوں نہیں کہتے کہ کہ بھلا جیل کی سلاخیں یا ایسے ظالمانہ اقدامات کشمیر کی آزادی کا راستہ روک سکتے ہیں؟ کیا کشمیریوں کے محبوب لیڈر سید علی گیلانی کو عوام کے دلوں سے الگ کیا جاسکا ہے؟ کیا مجاہدہ سیدہ آسیہ اندرابی کے عزم کو کمزور کیا جاسکتا ہے؟ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہی اب ممکن ہے! پھر ہمارے مقتدر اشرافیہ کو بھی کیوں سمجھ نہیں آرہی کہ کل ان کو اور ہمارے سیاستدانوں کو کل کلاں تاریخ کس نام سے یاد کرے گی؟

خدا کی قسم! میں اپنے وجود پر شرمندہ ہوں، مجھے شرم آتی ہے، میں کس دور، کس عہد میں جی رہا ہوں۔ میں اپنے بچوں، اپنی آئندہ نسل کو کس عہد، کس دور میں چھوڑ کر جاؤں گا۔ میں تو ہوا کے اس جھونکے سے بھی ہلکا ہو گیا ہوں جو اگر چلتی ہے تو دنیا سے بدبو کا ایک تولہ، سڑاند کا ایک آدھ ماشہ کم ہو جاتا ہے اور باباجی کہتے ہیں کہ میں ان سیاستدانوں پر لکھوں، شیطان کو بددعائیں دوں، یہ جانتے ہوئے بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ سیاپوں، بینوں اور چیخوں سے مردے جاگا کرتے ہیں اور نہ ہی بددعاؤں سے شیطان مرا کرتے ہیں۔

ہم سیاست سے، محبت کا چلن مانگتے ہیں

شبِ صحرا سے مگر صبحِ چمن مانگتے ہیں
وہ جو ابھرا بھی تو بادل میں لپٹ کر ابھرا
اس بچھڑے ہوئے سورج سے کرن مانگتے ہیں
کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں
ایسے غنچے بھی تو گل چیں کی قبا میں ہیں
اسیر بات کرنے کو جو اپنا ہی دہن مانگتے ہیں
ہم کو مطلوب ہے تکریم قد و گیسو کی
ہم تو اہلِ وطن دردِ وطن مانگتے ہیں

بروز ہفتہ 3 رجب المرجب 1445ھ 13 جنوری 2024ء

چنگاری

جب جدید بھارت کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں یہ ضرور شامل ہو گا کہ ہندو بھارت کے سامراجی مقاصد وادیٔ کشمیر میں خاکستر ہو گئے۔ افغانستان کو اگر "سلطنتوں کا قبرستان" کہا جاتا ہے تو غلط نہیں۔ 19 برس تک وقت کا فرعون امریکا اپنی طویل ترین جنگ میں ذلت آمیز شکست کے بعد رخصت ہو چکا، اس سے پہلے سوویت یونین نے بھی ایسی حماقت کی اور نتیجے میں اپنے ہی چھ ٹکڑے کروا کے روس بن گیا۔ مقبوضہ جموں و کشمیر میں جنگ لڑتے بھارت کو 75 برس بیت چکے ہیں۔ اس جنگ کو 9 لاکھ بھارتی فوجی لڑتے چلے آ رہے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ سویت یونین یا امریکی نیٹو فورسز نے افغانستان میں اگر اب تک سب سے بھاری فوج تعینات کی تھی تو وادی کشمیر میں اس سے 7 گنا زیادہ فوجی اہلکار تعینات ہیں۔

اس کشمیر جنگ کا خاتمہ صرف اس وقت ہی ہو گا، جب نئی دہلی کو یہ بات سمجھ آ جائے گی کہ ظالم برہمن ہندو تو اکشمیریوں کے بلند حوصلے توڑ نہیں سکتے اور جنگ سے وہ بھارتی ریاست کو ہی سنگین نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ مستقبل اب قریب تر نظر آ رہا ہے کیونکہ کشمیر پر بھارتی قبضے کی غیر قانونی حیثیت کو بڑے پیمانے پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔ سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری نے ایک بار پھر اقوام متحدہ کی ان قراردادوں کی توثیق کی ہے، جو کشمیر میں میں غیر جانبدارانہ استصوابِ رائے شماری کا مطالبہ کرتی ہیں۔ بھارتی موقف ان قراردادوں کے عین منافی ہے۔

بھارتی آئین کی شق 370 سے ان شرائط کو قانونی حیثیت دینے کا تقاضا کیا گیا تھا جن پر کشمیر کے مہاراجہ نے وادی کا الحاق کرنا چاہا۔ اس شق کے خاتمے سے بھارت نے اپنا وہ قانونی جواز بھی گنوا دیا ہے جس کے بَل بُوتے پر وہ جموں و کشمیر پر اپنے قبضے کو جائز قرار دیتا تھا۔ اب خود بھارت کے اپنے قانونی پیمانوں کے مطابق کشمیر پر قبضہ غاصبانہ اور بلاجواز ہے۔ دوسری بات، مودی حکومت نے اس تنازع کے پُرامن اور مذاکراتی حل کے تمام دروازے بند کیے ہوئے ہیں۔ مودی حکومت نے نہ صرف پاکستان کے ساتھ دوطرفہ مذاکرات سے انکار کر دیا ہے بلکہ تیسرے فریق کی ثالثی بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ 5/ اگست کو اپنے یکطرفہ اقدامات کے بعد بھارت کا کہنا تھا کہ اب بھارت کے پاس پاکستان سے بات کرنے کیلئے صرف ایک ہی موضوع رہ گیا ہے یعنی، آزاد کشمیر بھارت کو لوٹایا جائے۔

اس کے علاوہ بھارتی حکومت کشمیریوں سے بھی مذاکرات کرنے سے متعلق کچھ نہیں سوچ رہی۔ کشمیریوں پر براہِ راست دہلی سے حکمرانی کی جائے گی۔ بھارت نے واضح طور پر فوجی حل کا انتخاب کیا ہے۔ کشمیری مسلمانوں کو اپنے وجود کے خطرے کا سامنا ہے۔ ہندو سامراجوں کی جانب سے انہیں اپنے ہی وطن میں اقلیت میں بدلے جانے پر وہ بھرپور طریقے سے مخالفت کریں گے اور اب ان کے پاس اپنی جدوجہد آزادی کو تیز کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ کشمیر کی آبادیاتی ساخت تبدیل کر کے خود ساختہ "آخری حل" تھوپنے کے بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کے فاشسٹ پلان کے نتیجے میں انسانی حقوق اور انسانیت پسند قوانین کی سنگین خلاف ورزیاں ہوں گی جبکہ اس سے مقبوضہ کشمیر میں نسل کشی کی راہ بھی ہموار ہو سکتی ہے۔ "ہندوؤں کے ہٹلر" کی جانب سے قتلِ عام اور نسل کشی کیے جانے سے بھارت عالمی اچھوت بن جائے گا، بھارت کا سماجی ڈھانچا تار تار ہو جائے گا اور اس کی کشمیر پر جکڑ بھی کمزور پڑ جائے گی۔

تیسری بات بھارت کا تکبر اور دشمی، ہندو توا نسل پرستی اور کشمیری عوام پر ڈھائے جانے والے ظلم جیسے عناصر نے پاکستان کو ایک خوفزدہ دوست سے

کشمیری جدوجہدِ آزادی کے ایک بہادر ساتھی میں تبدیل کر دیا ہے۔ کشمیر ایک بار پھر پاکستان کیلئے اہم ترین مسئلہ قرار دیا جانے لگا ہے۔ بی جے پی کے اقدامات نے پاکستان کے اندر اس امید کو یکسر طور پر ماند کر دیا ہے کہ مذاکرات کے ذریعے بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پر لائے جاسکتے ہیں اور مسئلہ کشمیر کا حل نکالا جاسکتا ہے۔ بھارت کی حالیہ یلغار اور کشمیری تحریک کے خلاف ممکنہ کریک ڈاؤن سے پاکستانی حکومت پر کشمیری جدوجہدِ آزادی کی حمایت کرنے کیلئے مقامی دباؤ اب پہلے سے زیادہ بڑھ جائے گا اور اس قسم کی مدد ہر طرح سے جائز ہو گی۔

سلامتی کونسل کی قرارداد 47 (1948ء) اور اس کے بعد کی دیگر قراردادوں میں مجوزہ غیر جانبدارانہ استصوابِ رائے شماری کے اصول سے جموں وکشمیر کے عوام کے حق خودارادیت کی قانونی حیثیت ظاہر ہوتی ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اپنی قرارداد 2649 (1970ء) اور دیگر کئی قرار دادوں کے ذریعے بارہا کلونیل اور بیرونی غلبے کی زد میں رہنے والے لوگوں کی جدوجہد کی جائز حیثیت کی توثیق کر چکی ہے۔ قراردادوں کے مطابق ہے "اور "اس حق کے تحفظ کیلئے مسلح جدوجہد سمیت ہر دستیاب وسائل کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے علاوہ "انہیں خودارادیت کا حقدار تسلیم کیا جاتا ازیں، یہ قراردادیں ایسے لوگوں کے "حق خودارادیت کے اپنے جائز استعمال" کی خاطر ہر قسم کی اخلاقی اور مادی مدد کا مطالبہ اور اسے حاصل "کرنے کے حق کو بھی تسلیم کرتی ہے۔ چاہے پاکستان کشمیر کی جدوجہدِ آزادی میں مدد کرتا ہو یا نہ کرتا ہو لیکن بھارت ہر صورت پاکستان پر "سرحد پار دہشت گردی" کا الزام لگائے گا اور طاقت کے استعمال سے ڈرائے گا یا پھر فضائی حملوں یا فوجی چڑھائیوں کی کوششیں کرے گا۔ دنیا اس بات سے آگاہ ہے کہ پاک بھارت تنازع ایک تباہ کن جنگ میں بدل سکتا ہے اور صورتحال ایٹمی ہتھیاروں کی نہج تک پہنچ سکتی ہے۔ اس خطرے کو ٹالنے کیلئے سلامتی کونسل کے اراکین، دیگر ریاستیں اور عالمی ادارے ایسے تمام اقدامات اٹھانے کی بھرپور کوشش کریں گے جن سے صورتحال کو مزید بگڑنے سے روکا جاسکے

اقوام متحدہ اور دنیا کی اہم طاقتیں بھارت کو اپنا فیصلہ واپس لینے اور پاکستان و کشمیری عوام کے ساتھ کامیاب امن عمل کیلئے آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کریں گی لیکن مودی اقتدار کے نشے میں چُور ہے۔ وہ اور ان کے حلقے آر ایس ایس (امیت شاہ، اجیت ڈووول و دیگر) کو اس بات پر یقین ہو چلا ہے کہ کشمیریوں کا استحصال اور پاکستان کی جانب جارحیت ہی بھارت کے اندر کامیابی کا نسخہ ہے۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ اشتعال انگیزی سے باز آنے اور مذاکرات کی میز پر آنے کے مطالبات کو ٹھکرا دیں گے جس کے بعد عالمی برادری کی توجہ شاید "آسان" راستہ لینے کی جانب یعنی پاکستان کو کشمیری جدوجہدِ آزادی میں مدد سے باز رکھنے اور مقبوضہ جموں وکشمیر میں بھارت کی مسلط کردہ "حقیقتوں" کو تسلیم کرنے پر دباؤ ڈالنے پر مبذول ہو جائے۔ تاہم پاکستان کی گزشتہ حکومتوں کے برعکس موجودہ پاکستانی قیادت اس قسم کے دباؤ کے آگے شکست نہیں مانے گی۔

اسلام آباد میں اس خیال کو تقویت مل رہی ہے کہ بی جے پی کی جابرانہ حکمت عملی کا الٹا انہیں ہی نقصان اٹھانا ہو گا کیونکہ مقامی کشمیریوں کی بغاوت میں ایک بار پھر جان آچکی ہے کہ جسے زیر کرنا بہت ہی کٹھن ثابت ہو گا۔ اگر بھارت دھمکیوں تک محدود رہتا ہے یا پھر طاقت کا استعمال کرتا ہے تو پاکستان میں یہ تازہ دم اعتماد موجود ہے کہ یہ دہلی کو اگر ضرورت پڑی تو قابلِ اعتماد ایٹمی مزاحمت سے بھی، بے اثر بنا سکتا ہے۔

بھارت کا ایک عرصے سے جاری کشمیر پر قبضہ ممکن ہے کہ جلد افغان جنگ جیسی دلدل میں بدل جائے گا جو بھارت کی مسلح افواج کا اعتماد توڑ کر رکھ دے گا، سیاسی تقسیم جنم دے گی اور معیشت کو ڈبو دے گی۔ ماضی کی کلونیل طاقتوں کی ہی طرح بھارت پُر عزم عوامی بغاوت کے خلاف اپنی کمزور ہوتی جنگ بالآخر ہار جائے گا۔ اس شکست میں 10 سے 20 برس لگ سکتے ہیں لیکن مشہور ہندو کش کے پہاڑوں جیسے سخت عوام بالآخر ہندو بھارت کے سامراجی سپنوں کو نیست و نابود کر دیں گے لیکن لمحہ فکر تو یہ ہے کہ دنیا کے دیرینہ حل طلب مسائل میں مسئلہ کشمیر اور مسئلہ فلسطین سر فہرست ہیں جہاں نصف صدی سے زائد عرصے سے بھارت اور اسرائیل آگ اور خون کا کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں اور امریکا سمیت پورا یورپ اس کھیل کا مدت سے نظارہ کر رہے ہیں۔ ہر امن پسند دردمند ذی شعور شخص سوچ رہا ہے کہ یہ سفاکانہ کھیل کب تک جاری رہیں گے؟ تنازع کشمیر اور فلسطین کا آسان حل یہ ہے کہ ان دونوں مسائل کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرانا دنیا کے بڑی طاقتوں کی بین الاقوامی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اقوام متحدہ نے ریاست جموں و کشمیر کے ڈیڑھ کروڑ سے زائد عوام کو استصواب رائے کا حق دلانے اور فلسطین و اسرائیل کے دو ریاستی حل کا وعدہ کر رکھا ہے، لیکن آج تک اقوام متحدہ تو امریکا اور مغرب کی لونڈی کا کردار ادا کرتے ہوئے صرف بیانات کی حد تک اپنا کردار ادا کر رہی ہے جس کے بعد اب ضروری ہو گیا ہے کہ یہ حق دلانے میں اقوام عالم کو اپنا دامن نہیں چھڑانا چاہئے وگرنہ جس تیزی کے ساتھ دنیا مکمل تاریکی کی طرف بگٹٹ بھاگ رہی ہے کہیں ایک اڑتی ہوئی چنگاری ساری دنیا کا نقشہ ہی نہ تبدیل کر دے۔

بروز اتوار 4 رجب المرجب 1445ھ 14 جنوری 2024ء

قرآن اور موسیقی

ڈاکٹر محمود احمد غازی کی کتاب "محاضرات قرآنی" کے صفحہ 148 پر درج اس اقتباس نے مجھ پر حیرت کے کئی در وا کر دیئے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں: آپ نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا نام سنا ہو گا، انہوں نے غالباً 1958ء میں خود براہ راست مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ غالباً 1958-1957ء میں ایک شخص ان کے پاس آیا۔ ان کی زندگی کا یہ ایک عام معمول تھا کہ ہر روز دو چار لوگ ان کے پاس آتے اور اسلام قبول کرتے تھے۔ وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا کہ اسلام کا مختصر تعارف ان کے سامنے ایک صاحب آئے اور کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب عادت ان کو کلمہ پڑھوایا اور پیش کر دیا۔ اپنی بعض کتابیں انہیں دے دیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ان کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی شخص ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا تھا تو وہ اس سے یہ ضرور پوچھا کرتے تھے کہ اسے اسلام کی کس چیز نے متاثر کیا ہے؟ 1948ء سے 1996ء تک یہ معمول رہا کہ ڈاکٹر صاحب کے دست مبارک پر اوسطاً دو افراد روزانہ اسلام قبول کیا کرتے تھے۔ عموماً لوگ اسلام کے بارے میں اپنے جو تاثرات بیان کیا کرتے تھے، وہ ملتے جلتے ہوتے تھے۔ ان میں نسبتاً زیادہ اہم اور نئی باتوں کو ڈاکٹر صاحب اپنے پاس قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ اس شخص نے جو بات بتائی، وہ ڈاکٹر صاحب کے بقول بڑی عجیب و غریب اور منفرد نوعیت کی چیز تھی اور میرے لیے بھی بے حد حیرت انگیز تھی۔

اس نے جو کچھ کہا، اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا ارشاد تھا کہ میں اسے بالکل نہیں سمجھا اور میں اس کے بارے میں کوئی فنی رائے نہیں دے سکتا۔ اس شخص نے بتایا: میرا نام ژاک ژیلبیر ہے۔ میں فرانسیسی بولنے والی دنیا کا سب سے بڑا موسیقار ہوں۔ میرے بنائے اور گائے ہوئے گانے فرانسیسی زبان بولنے والی دنیا میں بہت مقبول ہیں۔ آج سے چند روز قبل مجھے ایک عرب سفیر کے ہاں کھانے کی دعوت میں جانے کا موقع ملا۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہاں سب لوگ جمع ہو چکے تھے اور نہایت خاموشی سے ایک خاص انداز کی موسیقی سن رہے تھے۔ جب میں نے وہ موسیقی سنی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ موسیقی کی دنیا کی کوئی بہت ہی اونچی چیز ہے، جو یہ لوگ سن رہے ہیں۔ میں نے خود آوازوں کی جو دھنیں اور ان کا جو نشیب و فراز ایجاد کیا ہے، یہ موسیقی اس سے بھی بہت آگے ہے بلکہ موسیقی کی اس سطح تک پہنچنے کیلئے ابھی دنیا کو بہت وقت درکار ہے۔

میں حیران تھا کہ آخر یہ کس شخص کی ایجاد کردہ موسیقی ہو سکتی ہے اور اس کی دھنیں آخر کس نے ترتیب دی ہیں۔ جب میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ یہ دھنیں کس نے بنائی ہیں تو لوگوں نے مجھے اشارہ سے خاموش کر دیا لیکن تھوڑی دیر بعد پھر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پھر یہی بات پوچھی لیکن وہاں موجود حاضرین نے مجھے خاموش کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے دوران وہ فن موسیقی کی کچھ اصطلاحات بھی استعمال کر رہا تھا، جن سے میں واقف نہیں، کیوں کہ فن موسیقی میرا میدان نہیں۔

قصہ مختصر جب وہ موسیقی ختم ہو گئی اور وہ آواز بند ہو گئی تو پھر اس نے بڑی بے تابی اور مضطرب انداز میں لوگوں سے پوچھا کہ یہ سب کیا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ موسیقی نہیں تھی بلکہ قرآن مجید کی تلاوت ہے اور فلاں قاری کی تلاوت ہے۔ موسیقار نے کہا کہ یقیناً یہ کسی قاری کی تلاوت ہو گی اور یہ قرآن ہو گا، مگر اس کی یہ موسیقی کس نے ترتیب دی ہے اور یہ دھنیں کس کی بنائی ہوئی ہیں؟ وہاں موجود مسلمان حاضرین نے بیک زبان وضاحت کی

کہ نہ یہ دھنیں کسی کی بنائی ہوئی ہیں اور نہ ہی یہ قاری موسیقی کی ابجد سے واقف ہیں۔ اس موسیقار نے جواب میں کہا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ دھنیں کسی کی بنائی ہوئی نہ ہوں لیکن اسے یقین دلایا گیا کہ قرآن مجید کا کسی دھن سے یا فن موسیقی سے کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ یہ فن تجوید ہے اور ایک بالکل الگ چیز ہے۔

اس نے پھر یہ پوچھا کہ اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ تجوید اور قرأت کا یہ فن کب ایجاد ہوا؟ اس پر لوگوں نے بتایا کہ یہ فن تو 14 صدیوں سے زائد سے چلا آرہا ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نے جب لوگوں کو قرآن مجید عطا فرمایا تو فن تجوید کے اصولوں کے ساتھ ہی عطا فرمایا تھا۔ اس پر اس موسیقار نے کہا کہ اگر محمد ﷺ نے اپنے لوگوں کو قرآن مجید اسی طرح سکھایا ہے جیسا کہ میں نے ابھی سنا ہے تو پھر بلاشبہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس لیے کہ فن موسیقی کے جو قواعد اور ضوابط اس طرز قرأت میں نظر آتے ہیں، وہ اتنے اعلیٰ وارفع ہیں کہ دنیا ابھی وہاں تک نہیں پہنچی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اس کی یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ بعد میں، میں نے اور بھی قرأ کی تلاوت قرآن کو سنا، مسجد میں جا کر سنا اور مختلف لوگوں سے پڑھوا کر سنا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اگر یہ اللہ کی کتاب ہے تو اس کے لانے والے یقیناً اللہ کے رسول تھے، اس لیے آپ مجھے مسلمان کر لیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اسے کلمہ شہادت پڑھوا کر مسلمان کر لیا لیکن میں نہیں جانتا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ کس حد تک درست تھا، اس لیے کہ میں اس فن کا آدمی نہیں

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میں نے ایک الجزائری مسلمان کو جو پیرس میں زیر تعلیم تھا، اس نئے موسیقار مسلمان کے بے حد اصرار پر اس کی دینی تعلیم کیلئے مقرر کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد وہ دونوں میرے پاس آئے اور کچھ پریشان سے معلوم ہوتے تھے۔ الجزائری معلم نے مجھے بتایا کہ وہ نو مسلم قرآن مجید کے بارے میں کچھ ایسے شکوک کا اظہار کر رہا ہے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ جس بنیاد پر یہ شخص ایمان لایا تھا، وہ بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اب اس کے شکوک کا میں کیا جواب دوں گا اور کیسے دوں گا؟ لیکن اللہ کا نام لے کر پوچھا کہ بتاؤ تمہیں کیا شک ہے؟

اس نو مسلم نے کہا کہ آپ نے مجھے یہ بتایا تھا اور کتابوں میں بھی، میں نے پڑھا ہے کہ قرآن مجید بعینہ اسی شکل میں آج موجود ہے جس شکل میں اس کے لانے والے پیغمبر ﷺ نے اسے صحابہ کرام کے سپرد کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ واقعی ایسا ہی ہے۔ اب اس نے کہا کہ ان صاحب نے مجھے اب تک جتنا قرآن پڑھایا ہے، اس میں ایک جگہ کے بارے میں مجھے لگتا ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور حذف ہو گئی ہے۔ اس نے بتایا کہ انہوں نے مجھے سورۂ نصر پڑھائی ہے اور اس میں "اَفْوَاجًا" اور " فَسَبِّحْ" کے درمیان خلا ہے۔ جس طرح انہوں نے مجھے پڑھایا ہے، وہاں اَفْوَاجًا پر وقف کیا ہے۔ وقف کرنے سے وہاں سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے جو نہیں ٹوٹنا چاہیے جبکہ میرا فن کہتا ہے کہ یہاں خلا نہیں ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ یہ سن کر میرے پیروں تلے زمیں نکل گئی، اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس شبہ کا جواب کیا دیں اور کس طرح مطمئن کریں۔ کہتے ہیں کہ میں نے فوراً دنیائے اسلام پر نگاہ دوڑائی تو کوئی ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آیا جو فن موسیقی سے بھی واقفیت رکھتا ہو اور تجوید بھی جانتا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ چند سیکنڈ کی شش و پنج کے بعد بالکل اچانک اور یکایک میرے ذہن میں ایک پرانی بات اللہ تعالیٰ نے ڈالی کہ اپنے بچپن میں جب مکتب میں قرآن مجید پڑھا کرتا تھا تو میرے معلم نے مجھے بتایا تھا کہ " اَفْوَاجًا" پر وقف نہیں کرنا چاہیے بلکہ اَفْوَاجًا کو بعد کے لفظ سے

ملا کر پڑھا جائے۔ ایک مرتبہ میں نے " اَفْوَاجًا" پر وقف کیا تھا تو اس پر انہوں نے مجھے سزا دی تھی اور سختی سے تاکید کی تھی کہ اَفْوَاجًا کو آگے فَسَبِّحْ" سے ملا کر پڑھا کریں۔

میں نے سوچا کہ شاید اس بات سے اس کا شبہ دور ہو جائے اور اس کو اطمینان ہو جائے۔ میں نے اسے بتایا کہ آپ کے جو پڑھانے والے ہیں، وہ تجوید کے اتنے ماہر نہیں ہیں۔ دراصل یہاں اس لفظ کو غنہ کے ساتھ آگے سے ملا کر پڑھا جائے گا۔ "افواجاً فسبح"۔ ڈاکٹر صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ وہ خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور مجھے گود میں لے کر کمرے میں ناچنے لگا اور کہنے لگا کہ واقعی ایسے ہی ہونا چاہیے۔ یہ سن کر اس کو میں نے ایک دوسرے قاری کے سپرد کر دیا جس نے اس شخص کو پورے قرآن پاک کی تعلیم دی۔ وہ وقتاً فوقتاً مجھ سے ملتا تھا اور بہت سر دھنتا تھا کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ وہ بہت اچھا مسلمان ثابت ہوا اور ایک کامیاب اسلامی زندگی گزارنے کے بعد 1970ء کے لگ بھگ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعے سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی جو صوتیات ہے، یہ علم و فن کی ایک ایسی دنیا ہے جس میں کوئی محقق آج تک نہیں اترا ہے اور نہ ہی قرآن مجید کے اس پہلو پر اب تک کسی نے اس انداز سے غور و خوض کیا ہے۔

قارئین! مجھے یہ واقعہ 11 برس پیچھے لے گیا جب میری اہلیہ کا پورا جسم فالج کی وجہ سے شدید متاثر اور معذور ہو گیا۔ اس اچانک افتاد نے دنیا اندھیر کر دی اور بالآخر ان کے علاج اور تشخیص کیلئے اہلیہ کے تمام ٹیسٹ پر ڈاکٹروں کا ایک پورا بورڈ میسر آ گیا، خوش قسمتی سے دنیا کے سب سے بڑے معالج "پروفیسر بیکر" کی خدمات حاصل ہو گئیں۔ کانفرنس روم میں موت جیسا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ نجانے کیا اعلان ہو۔ تمام متعلقہ ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر بیکر نے اپنی نیلی آنکھوں پر سے چشمہ ہٹاتے ہوئے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرا دل حلق کے اندر آ گیا ہے۔ پروفیسر نے پہلے تمام ٹیسٹ کے نتائج کے بارے میں آگاہ کیا اور آخر میں انتہائی افسوس کے ساتھ بتایا کہ مریضہ کے پاس صرف دو ہفتے ہیں لیکن مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہو رہی ہے کہ مریضہ کے دماغ سے یہ حملہ ہوا جس نے ان کے سارے جسم کو مفلوج کر دیا لیکن ان کا چہرہ، گلا، ناک، آنکھیں اور کان اس حملے سے کیسے بچ گئے اور یہ تمام اعضاء مکمل طور پر صحت مند ہیں جبکہ یہ میڈیکل سائنس اور ہمارے تجربے کی نفی ہے؟

پروفیسر بیکر کے اس اعلان پر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا اور دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہو گئی تھی کہ میں ہکا بکا اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ ممکن ہے کہ یہ کوئی اچھی خبر سنا دے۔ میں نے پروفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں ڈاکٹروں کے پورے بورڈ کے تجربات کو جھٹلانے کی ہمت تو نہیں کر سکتا لیکن اہلیہ کے چہرے کے بارے میں جو رائے دی گئی ہے، اس کی بابت یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس رب کی طرف سے یہ آزمائش آئی ہے، میں نے اپنی ساری ازدواجی زندگی میں اہلیہ کو قرآن کا عاشق پایا ہے اور عین ممکن ہے کہ میرے کریم رب نے اس قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کے طفیل ان کے چہرے کو مکمل محفوظ رکھا ہو۔ یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ فوری طور پر پروفیسر نے میرے دونوں کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ جماتے ہوئے مجھے بڑے خوبصورت انداز میں یہ نصیحت کی کہ "ہم ڈاکٹر صرف اپنے تجربات کی بناء پر اپنی آراء قائم کرتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ بالکل ویسا ہی ہو، تاہم میں آپ کی اس بات سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں کہ ہمیں ان معجزات پر بھی یقین کرنا ہو گا جو ہمیں کبھی کبھار دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اہلیہ اس واقعے کے بعد چھ سال تک زندہ رہیں لیکن اپنی معذوری کی اور شدید علالت کی بناء پر انہیں نرسنگ ہوم میں منتقل کرنا پڑ گیا۔ وہ اس حال میں بھی ہر وقت قرآن و تسبیحات میں مشغول رہتی تھیں۔ معجزاتی طور پر ان کے جسم کا دایاں حصہ حرکت کرنے لگا اور امید بندھ گئی اور پروفیسر بیکر بھی اس تبدیلی پر بڑا حیران تھا۔ ایک دن پروفیسر اہلیہ کی تیارداری کیلئے جب آیا تو ہم سب حسب معمول قاری عبد الباسط مرحوم کی آواز میں "سورہ الرحمٰن "کی تلاوت سن رہے تھے۔ میں لیپ ٹاپ پر آواز کو جب کم کرنے لگا تو اس نے مجھے منع کر دیا اور خود بھی بڑے انہماک کے ساتھ سننا شروع کر دیا۔ میں اس کے چہرے کے تغیرات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ سورہ مکمل ہونے پر اس نے مجھ سے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے بے ساختہ کہا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ یہ آواز جاری و ساری رہے اور کبھی ختم نہ ہو جبکہ میں اس کے مفہوم و معنی سے بالکل نابلد ہوں لیکن یہ آواز براہِ راست میرے دل پر اثر کر رہی تھی

ہمارا یہ معمول تھا کہ دن کا زیادہ وقت سورہ رحمٰن سنتے رہتے تھے لیکن اس دن مجھے بہت تعجب ہوا جب نرسنگ ہوم کے انگریز ڈائریکٹر "سائمن" نے مجھ سے اس سورہ کے بارے میں درخواست کی کہ میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اونچی آواز میں لگا دیا کروں کہ باقی مریض بھی اس سے استفادہ کریں کہ مریضوں کی اکثریت دروازے کے باہر کھڑی بڑی خاموشی کے ساتھ سن کر بڑا سکون محسوس کرتے ہیں۔ انہی مریضوں میں ایک 91 سالہ "ارنسٹ ٹوملیسن "بھی تھا جو کینسر کا مریض تھا اور انتہائی کرب کے ساتھ سارا دن چیختا اور تڑپتا رہتا تھا۔ اس کو اس کرب سے نجات دلانے کیلئے روزانہ انجیکشن دیکر سلا دیا جاتا تھا۔ ایک دن اس نے جب سورہ رحمٰن کو سنا تو اس نے بے اختیار نرس کو اس آواز کے تعاقب کیلئے بھیجا۔ معلوم ہونے پر اس نے ہمارے کمرے میں آنے کی درخواست کی۔

حیرت انگیز طور پر وہ انتہائی خاموشی کے ساتھ اس کو سنتا رہا اور اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ مجھے ہر روز اس کو سننے کیلئے کمرے میں آنے کی اجازت دی جائے جبکہ میں نے اسی کے کمرے میں اس کا بندوبست کر دیا۔ مجھے میڈیکل سٹاف کے اس انکشاف نے مزید حیران کر دیا کہ جب سے اس نے سورہ رحمٰن کو سننا شروع کیا ہے، اس کے انجیکشن کو ہم نے بتدریج ختم کر دیا ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ معاملہ ایسا بڑھا کہ نرسنگ ہوم میں باقاعدہ طور پر ہر روز دو گھنٹے کیلئے سورہ رحمٰن کی تلاوت کا اہتمام کر دیا گیا۔ اہلیہ تو رمضان کی 27 ویں مبارک شب کو اللہ کے پاس چلی گئیں مگر بعد ازاں مجھے بتایا گیا کہ "ارنسٹ" برطانیہ کا ایک مشہور میوزیشن رہا ہے اور اس کی تیار کردہ سینکڑوں دھنیں پوری دنیا میں بہت مشہور ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ اس سارے واقعہ کی منطقی وجوہات کیا ہیں لیکن اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد مجھ پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں کہ ہم نے آخر تحقیق سے کیوں منہ موڑ رکھا ہے کہ اغیار کی گواہیاں علی اعلان سامنے آ رہی ہیں۔ امریکا کی ریسرچ یونیورسٹیوں کے حالیہ جائزہ رپورٹ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دیندار حضرات میں شرح بیماری کم ہے اور ان کے اندر قوتِ دفاع دوسروں کے بالمقابل زیادہ ہے، ہائی بلڈ پریشر کا شکار عمومی طور پر 65 سال کی عمر والے حضرات ہوتے ہیں لیکن دیندار حضرات میں یہ تناسب 40 فیصد کم ہے۔ واضح رہے کہ بلڈ پریشر عمومی طور پر دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے اور ان حالات میں دماغی رگوں کے پھٹنے کا امکان زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر ہارولڈ کہتا ہے: "ہمیں پورا یقین ہے کہ اسلام میں نماز اور دیگر شعائر کی ادائیگی کا حکم ایک مثبت اور درست حکم ہے جس کے بہتر اور صحت افزا اثرات انسانی جسم پر نمودار ہوتے ہیں اور عام لوگوں کے مقابلہ میں دیندار حضرات بیماریوں کا کم شکار ہوتے ہیں"۔

اس تحقیقی رپورٹ کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ امریکی یونیورسٹیوں کی خالص علمی و تحقیقی ریسرچ کمپنیوں نے اس کا انکشاف کیا ہے اور ایسے

معاشرہ میں یہ بات سامنے آئی ہے جو خالص مادی ہے، جو محسوسات سے ماوراء چیزوں کو نہیں دیکھتا، پھر ایسے ماہرین و محققین نے اعتراف کیا ہے جو خالص عالمی بنیادوں کو اپنا معیار بناتے ہیں، اور پھر ایسے زمانے میں جبکہ مادیت کا ہر طرف غلبہ ہے اور لوگ روحانی افلاس کا شکار ہیں۔

زمانہ قدیم سے طب اور علاج مذہب اور دین سے جڑے ہیں لیکن امراض سے شفا حاصل کرتے پنڈتوں اور کاہنوں کے پاس جاتے اور وہ روحانی پیشوا کچھ خاص طریقوں سے ان کا علاج کرتے اور یہ طریقہ بابل، کلادن، اور آشوریوں کے یہاں رائج تھا۔ مصر اور ہندوستان میں زمانہ قدیم ہی سے تعویذ اور گنڈوں کا استعمال عام تھا۔ یونانیوں کے یہاں علم طلب دیندار طبقہ کے ساتھ خاص تھا، مریض عبادت گاہوں کا چکر لگاتے، کاہنوں کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ بحالت خواب مرض و علاج کی تشخیص کرتے ہیں۔

ماضی کا انسان امراض اور اسباب علاج کو دین و مذہب سے جوڑے ہوتا تھا لیکن آج مغربی و مادی تہذیب میں گھل مل کر انسان اس سے بالکل غافل ہو چکا ہے اور بے شمار لاعلاج امراض کا شکار ہو کر بھی دین و اخلاق اور اعلیٰ اقدار سے کوسوں دور ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان بے شمار جسمانی اور نفسیاتی امراض لاشکار ہو گیا ہے۔ یہ بیماریاں ان معاشروں میں بکثرت ہیں جو مادیت میں غرق اور فضائل و اخلاق سے بہت دور ہیں۔ آج خطرناک ترین بیماریوں کے گراف بڑھتے جارہے ہیں، ایڈز، منشیات کی بری عادت، دل کی بیماریوں، دورے اور شوگر جیسی مہلک بیماریاں عام ہو رہی ہیں۔ ایک جائزہ کے مطابق 13 فیصد امریکی عوام نفسیاتی امراض میں مبتلا ہیں 85 فیصد لوگ ذہنی و دماغی الجھنوں کا شکار ہیں، شفاخانوں میں 50 فیصد سیٹیں ایسے مریضوں کیلئے خاص ہیں جو ذہنی و دماغی امراض میں مبتلا ہیں۔

گزشتہ ادیان کے ماننے والے علاج و معالجہ کا رشتہ مذہب و دین سے جوڑے ہوئے تھے جبکہ مذاہب انسانوں کے خود ساختہ تھے۔ آسمانی مذاہب اس کے زیادہ اہل ہیں کہ دوا علاج کو مذہب سے جوڑیں، دین اسلام جو ہر طرح کی تحریف و تاویل سے پاک و مبرا ہے، اس پر یہ ذمہ داری مزید عائد ہوتی ہے جبکہ سورۂ حجر کی آیت 9 میں ارشاد ہے: اِنَّانَحۡنُ نَزَّلۡنَاالذِّکۡرَ وَ اِنَّالَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ "بے شک یہ کتاب نصیحت ہم ہی نے اتاری اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں"۔ مذہب اسلام پوری انسانیت کیلئے ہدایت و رحمت کا دین ہے، ایک کامل و مکمل نمونہ حیات ہے، انسان کی زندگی کو راحت بخشنے والا مصائب و آلام سے چھٹکارا دلانے والا دین ہے، دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ قرآن و حدیث میں امراض اور ان کے اسباب و علاج مذکور ہیں لیکن وائے افسوس کہ ہم نے قرآن کے مطالعہ اور تحقیق سے منہ موڑ رکھا ہے۔

بروز اسوموار 5 رجب المرجب 1445ھ 15 جنوری 2024ء

ناشکرا انسان

خدا بھلا کرے کہ قصر سفید کے فراعین نے ایک لفظ کو مجسم شخصیت عطا کر دی۔ آج سے پہلے لفظ فرعون ہمارے مذہبی اور معاشرتی شعور میں ایک تاریخی شخصیت سے زیادہ ایک محاورے یا مثال کی حیثیت رکھتا تھا۔ فرعون بہ معنی مکمل ڈکٹیٹر شپ' رعونت، بے جا اکڑ اپنی خوش بختی پر حد سے زیادہ گھمنڈ اور اس سب کے ساتھ اپنے سامنے پوری دنیا کو ہیچ سمجھتے ہوئے خود کو ہر فرد اور ہر ملک کی قسمت کا مالک تصور کرنا، یہ سب قباحتیں اس ایک لفظ سے عبارت تھیں لیکن آج ہم نے جانا کہ ان خصوصیات کا چہرہ اور شخصیت کیسی ہوتی ہے۔ افغانستان، عراق، لیبیا پر امریکی حملے سے پہلے اور بعد میں قصر سفید کے سابقہ ظالم مکیں بش، کے مختلف بیانات، دعوے اور بعد ازاں اوبامہ اور ٹرمپ کی تقریریں سن سن کر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ کوئی فرد چاہے وہ دنیا کی واحد سپر پاور کا سربراہ ہی کیوں نہ ہو، آخر انسان ہونا یعنی فانی ہونا کیسے بھول سکتا ہے؟

لیکن بائیڈن جنہوں نے اپنا اکلوتا نوجوان بیٹا موذی مرض کینسر کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہوتا ہوا دیکھا، وہ بھی نمک کی کان میں پہنچ کر نمک بن گئے ۔کیا یہ سب فراعین بھول جاتے ہیں کہ اس دنیا سے اوپر بھی ایک سپر پاور ہے جو چاہے تو ایک لمحے میں پوری کائنات کو تہہ و بالا کر دے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ کرونا کے ان دیکھے جرثومہ نے دنیا بھر میں میرے رب کی معمولی سی طاقت کا ایسا آئینہ دکھایا کہ سب کو جان کے لالے پڑ گئے اور وہ جن کے اپنے گودام دنیا کو محض دو منٹ میں تباہ رکھنے کی صلاحیت رکھنے والے ایٹمی اسلحے سے بھرے پڑے تھے، وہ بھی خوفزدہ اپنے ہی گھر والوں سے فاصلے سے بات کرتے تھے لیکن ایسا ناشکرا انسان جو ایک سانس کا محتاج ہے، خود کو پوری دنیا کے انسانوں کی قسمتوں کا مالک سمجھتا ہے۔ اسی لئے خالقِ کائنات نے قرآن میں ایسے نافرمانوں کیلئے فرمادیا: إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ، وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ۔۔بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے، اور بے شک وہ اس بات پر خود شاہد ہے۔

ویسے انسان کی فطرت کے اندر شائد یہ خرابی ہے کہ دولت اور طاقت کی فراوانی اسے فرعونوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے، پھر وہ دنیا کے سارے وسائل پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل میں پھر وہ دوسرے انسانوں سے کیڑوں مکوڑوں سے بھی زیادہ برا سلوک روا رکھتا ہے۔ اس سلوک کی کہانیاں ہم روز پڑھتے اور سنتے ہیں اور یہ صرف امریکی انتظامیہ تک محدود نہیں۔ کشمیر، افغانستان، عراق اور لیبیا سے لیکر کیوبا اور فلسطین تک، انسانی فطرت کی اسی کجی کے قصے بکھرے ہوئے ہیں لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ "ہر فرعونے راموسیٰ" تو آج کے دور کے ان فرعونوں کے بھی اپنے ہی ایوانوں سے موسیٰ پروان چڑھ رہے ہیں۔ ڈھائی ماہ سے غزہ میں انسانیت کو ذبح کیا جا رہا ہے اور وقت کے فراعین اب اس خوف میں مبتلا ہیں کہ چاروں طرف سے محاصرہ میں افراد نجانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ اب بھی اپنے ہر شہید کو ایک عجیب سرشاری سے لحد میں اتار رہے ہیں اور ان کا حوصلہ اب بھی آسمانوں کو چھو رہا ہے گویا وہ موت کو اپنی ابدی و دائمی زندگی سمجھ کر اس کے منتظر ہیں۔ اس ماحول میں نجانے مجھے ایک بہادر بیٹی راشل کوری کا 20 سال قبل لکھا ہوا وہ خط جو اس نے غزہ کی پٹی سے اپنے ماں باپ کو ای میل کیا تھا، بے تحاشہ یاد آنے لگ جاتا ہے۔ اس ننھی لڑکی کو پورا یقین تھا کہ یہ اس کا اپنے ماں باپ کے نام آخری پیغام ہے۔

راشل کوری وہ امریکی لڑکی تھی جو مظلوم فلسطینیوں کی خاطر اسرائیلی بلڈوزر کے نیچے آکر ہلاک ہوگئی تھی۔ وہ ان امریکی رضاکاروں میں شامل تھی جو فلسطینیوں پر ڈھائے جانے اسرائیلی مظالم اوران کے گھروں کا مسمار کئے جانے کے خلاف احتجاج کرنے اور دنیا کو ان زیادتیوں سے باخبر کرنے کے ارادے سے رافہ میں جمع ہوئے تھے۔ راشل نے یہ خط 7 فروری 2003ء کو اپنے ماں باپ کو ای میل کیا تھا جسے اس کی موت کے بعد اس کے ماں باپ نے گلوبل نیوز نیٹ ورک کو جاری کر دیا تھا تاکہ دنیا بھر کے میڈیا کو پتہ چل جائے کہ ان کی بیٹی نے ان مظلوم اور بے بس لوگوں کی حمائت اور حفاظت کی خاطر جان دی جو لوگ اپنا دفاع اور حفاظت خود نہیں کر سکتے تھے۔

راشل کوری اپنے اس خط میں لکھتی ہیں کہ "مجھے غزہ کی پٹی میں آئے ہوئے دو ہفتے ہو چکے ہیں لیکن اتنا کچھ پڑھنے، انفرادی طور پر ان مظلوم اور مفلوک حال لوگوں سے معلومات لینے اور ڈاکومینٹریز دیکھنے کے باوجود
میں اس صورتحال کیلئے بالکل تیار نہیں تھی جس کا سامنا مجھے یہاں آکر کرنا پڑ رہا ہے۔ فلسطینیوں پر فوج کے مظالم کا یہ عالم ہے کہ شائد ہی آپ کو کوئی گھر ایسا ملے جس میں توپوں کے گولوں کے سوراخ نہ ہوں بلکہ بیشتر گھر تو مسمار کئے جا چکے ہیں۔ لوگوں کی نقل و حرکت پر مسلسل پہرے ہیں اوران کے معاملات کے فیصلے ایک پولیس کا سپاہی کرتا ہے۔ یعنی انہیں ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے اور بحفاظت واپس آنے کی قسمت کا فیصلہ بھی اسی کے موڈ پر ہے۔ چھوٹے بچوں تک کو بے دریغ گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے اور رات دس بجے کے بعد نظر آنے والے ہر فرد کو بغیر پوچھے گولی سے اڑا دیا جاتا ہے، جبکہ زندگی کی سہولتوں کا یہ عالم ہے کہ پانی کے دو بڑے ذخائر یا کنویں اسرائیلی فوج نے تباہ کر دیئے ہیں۔ اب صرف ایک ذخیرۂ آب بچا ہے جس کی حفاظت اور باقی گھروں کو بچانے کیلئے مقامی لوگ مجھ جیسے انٹرنیشنل لوگوں کی مدد چاہتے ہیں لیکن ہماری تعداد محدود ہے۔ راشل مزید لکھتی ہے کہ میں سوچتی ہوں کہ میں تو پانی خرید سکتی ہوں اور میرا تو ایک گھر امریکا میں ہے جہاں میں جب چاہے واپس جا سکتی ہوں لیکن ان لوگوں کے پاس کیا آپشن ہے جبکہ یہاں کی بیشتر آبادی ان لوگوں کی ہے جو دو سے تین بار پہلے بھی بے گھر ہو کر ریفیوجی بن چکے ہیں۔

دنیا کو ان فرعونوں سے مظلوم لوگوں کو بچاتے ہوئے اوران مظلوم لوگوں کے گھروں کو مسمار ہونے سے روکنے کی کوشش میں آخر کار راشل کوری خود بھی اس ظلم کا نشانہ بن گئی۔ 16 مارچ 2003ء کو ایک اسرائیلی بلڈوزر کو ایک فلسطینی کا گھر گرانے سے روکتے ہوئے یہ 23 سالہ نوجوان بہادر لڑکی دب کر ہلاک ہوگئی لیکن اپنے پیچھے روشنی کی ایسی کرن چھوڑ گئی ہے جو ہمیں یاد دلاتی رہے گی کہ فرعونی طاقتوں سے ٹکر لینے والی قوتیں بھی دنیا میں ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے گھر ہی میں پروان چڑھے تھے اور امریکی لے پالک، اسرائیل سے ٹکر لینے والی لڑکی بھی امریکی شہری ہی تھی لیکن کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ امریکی شہریوں کی زندگی اور حفاظت کی ٹھیکیدار امریکی انتظامیہ راشل کوری کی دردناک موت (قتل) پر خاموش رہی تھی اور امریکی میڈیا بھی اس معاملے کو معمول کی ایک بات سمجھ کر "انڈر پلے" کر گیا یعنی اس نے کوئی خاص اہمیت ہی نہیں دی۔

راشل کوری کے ساتھ یہی سانحہ کسی اور ملک میں ہوا ہوتا تو شائد ابھی تک اس ملک پر بھی لشکر کشی ہو چکی ہوتی اور دنیا کو یہ باور کروایا جاتا کہ امریکا اپنے

شہریوں کی جان ومال کا کس قدر خیال رکھتا ہے لیکن ان صہیونی طاقتوں کے سامنے امریکا کی مجال نہیں کہ احتجاج تک کر سکے۔ راشل کوری کی موت نے جو روشنی کی لکیر چھوڑی ہے ویسی ہی روشنی کی قندیل مجھے عالیہ کی شکل میں نظر آئی تھی۔ عراق پر امریکی حملے سے کچھ دن پہلے جب ساری دنیا میں احتجاجی مظاہرے ہو رہے تھے اور جنگ کے مخالف لوگوں کی انسانی زنجیریں بن رہی تھیں تو یہ لڑکی اپنا ملک اور تین سالہ بچی کو چھوڑ کر عراق پر حملے کے خلاف انسانی زنجیر میں شامل ہونے کیلئے بغداد پہنچ گئی تھی۔ دینیا پیونے یہاں آکر اسلام قبول کیا اور اپنا نیا نام عالیہ رکھ کر مظلوموں کے حقوق کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا اور عالیہ نے بھی مظلوم انسانیت کیلئے جان دے دی۔ برطانیہ کی ایک مشہور صحافی "ایوان رڈلے" اپنی صحافتی ذمہ داریوں کی خاطر چھپ کر اور بھیس بدل کر افغانستان پہنچ جاتی ہے اور وہاں طالبان کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ان طالبان کے حسنِ سلوک کی بناء پر ایسی مسلمان ہو کر لوٹتی ہے کہ یورپ میں مسلمانوں کی تائید میں سب سے زیادہ بلند آواز اسی ایوان رڈلے کی ہے۔ ہماری بد نصیبی یہ ہے کہ ہمارے حکمران ان فرعونوں کے ہاتھوں کٹھ پتلیاں بنے ہوئے ہیں۔

اسی قادرِ مطلق سے دعا ہے کہ وہ اس دور کے موسیٰ کو بھی جلد بھیج دے کہ اب فرعونیت اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔

بروز جمعرات 8 رجب المرجب 1445ھ 18 جنوری 2024ء

نا قابل تلافی جرم

بزدل بنیا88 سالہ علیل بزرگ سید علی گیلانی سے اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس نے ان کی زندگی کے آخری9 برس ان کو گھر میں محض اس لیے نظر بند رکھا کہ ان کا اپنے عوام سے رابطہ منقطع کر دیا جائے لیکن وقت نے گواہی دی ہے کہ نہ صرف مقبوضہ کشمیر میں بلکہ دنیا بھر ان کی رحلت کے بعد بھی ان کے احترام میں اضافہ ہوا ہے بلکہ تاریخ میں آج بھی کشمیر کی سب سے توانا آواز کے طور پر ان کی ایک منفرد پہچان ہے۔ان کا جرم صرف اتنا کہ وہ بھارت کو اقوام متحدہ میں کیے گئے تحریری وعدوں کی پاسداری کیلئے نہ صرف اقوام عالم کو جھنجھوڑتے رہے بلکہ بھارت کے سب سے بڑی جمہوریت کے دعوے کیلئے بھی ایک چیلنج بن گئے تھے جنہوں نے بندو برہمن کی منافقت کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا تھا۔انہوں نے کئی بار متعصب ہندو بنیے کو متنبہ کیا تھا کہ ان کی یہ ظالمانہ پالیسیاں کا نتیجہ بالآخر بھارت کیلئے ہولناک بلکہ شرمناک بھی ہو گا۔

واضح رہے کہ بھارتی تحقیقاتی ادارے این آئی اے نے گزشتہ دو برس سے حریت کانفرنس سے وابستہ کشمیری رہنماؤں کی گرفتاریوں اور انہیں نئی دہلی لے جا کر قید کرنے کا منظم سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے جبکہ دوسری جانب بھارتی فوجیوں کے ہتھے کشمیریوں پر مظالم میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ کشمیریوں کی شہادتوں کے واقعات بھی غیر معمولی طور پر بڑھ گئے ہیں لیکن بھارتی میڈیا مکمل طور پر مودی کا زر خرید غلام بن چکا ہے اس لئے کشمیر میں جاری مظالم کی خبروں پر مکمل بلیک آؤٹ ہے اور کسی بھی غیر ملکی میڈیا کو کشمیر میں جانے کی اجازت نہیں۔کشمیری حریت پسندوں کے خلاف10 ہزار صفحات پر مشتمل فردِ جرم تیار کر لی گئی ہے اور مودی سرکار نے عدالتوں کے ذریعے کشمیری قائدین کو سخت ترین سزائیں دلوانے کی منصوبہ بندی کر لی ہے جس کا فائدہ وہ اپنی انتخاب میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اس کیلئے بھارتی ٹی وی چینلز نے اپنے متعصب حکمرانوں کی ایما پر حریت پسندوں کے خلاف زہر اگلنے اور بے بنیاد پروپیگنڈے کی مہم کو اپنا وتیرہ بنا لیا ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں مودی سرکار کی جانب سے ایک طرف سنگباری کے الزام میں گرفتار نوجوانوں کی رہائی کی باتیں کر کے دنیا کو دھوکا دیا جا رہا ہے تو دوسری جانب کشمیریوں کی بڑی تعداد میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ بھی زوروں پر ہے۔بھارتی فوج جب اور جس کو چاہے،اس کے گھر میں گھس کر گرفتار کرتی ہے اور بعد ازاں کالے قوانین کے تحت اسے کسی نہ کسی جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔کشمیری رہنماؤں اور سرگرم کشمیری نوجوانوں کے ساتھ جیلوں میں جس طرح کا اذیت ناک سلوک کیا جا رہا ہے اس نے ابو غارب اور گوانتاناموجیسی بدنام زمانہ جیلوں میں ڈھائے جانے والے مظالم کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔بھارتی عدالت عظمیٰ کے واضح احکامات موجود ہیں کہ کشمیری قیدیوں کو بیرون ریاست جیلوں میں نہ رکھا جائے،جو کشمیری جیلوں میں قید ہیں انہیں فوری طور پر مقبوضہ کشمیر کی جیلوں میں منتقل کیا جائے اور یہ کہ ان قیدیوں کو ان کے گھروں کے نزدیک ترین جیلوں میں رکھا جائے لیکن ہندو انتہا پسند سیاسی جماعت بی جے پی کی سفاک حکومت اپنی ہی اعلیٰ عدلیہ کے فیصلوں کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے جس کسی کو سزا دینا ہوتی ہے اسے بھارت کی دور دراز جیلوں میں منتقل کر دیتی ہے جہاں ان سے گھر والوں کی ملاقات کی اجازت تک نہیں دی جاتی۔

بھارتی جیلوں میں کشمیری قیدیوں کو ڈکیتی اور قتل جیسی سنگین قسم کی وارداتوں میں ملوث خطرناک قیدیوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے اور پھر انہیں سرکاری سرپرستی میں تشدد کا نشانہ بنانا معمول کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔بھارتی جیلوں میں ان کشمیریوں کو جو تحریک آزادی میں بھرپور انداز میں حصہ لیتے رہے اور حریت کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے،خاص طور پر ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ان پر جھوٹے مقدمات قائم کر کے تاحیات عمر قید

کی سزائیں سنائی جارہی ہیں اورانہیں جیلوں میں سڑنے پر مجبور کر دیا گیاہے اور ظلم کی بات تو یہ ہے کہ کئی سال تک انہیں عدالتوں میں نہ تو پیش کیا گیا اور نہ ہی انہیں صفائی کا کوئی موقع دیا گیا۔ مقبوضہ جموں وکشمیر اور بھارت کی تمام جیلوں میں ڈھائے جانے والے مظالم سے کشمیری تو بخوبی آگاہ ہیں۔ ایسے کربناک حالات کا تصور کرکے ہی ایک عام انسان خوف اور غم میں ڈوب چکاہے مگر اس ضمن میں اگر کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تو وہ ہے عالمی برادری اور بھارت کی دہشتگرد حکومت، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت اقوام عالم کی توجہ غزہ کی طرف ہے، اس کی آڑ میں ظالم برہمن مودی پورا فائدہ اٹھارہاہے۔

جیلوں میں بند کشمیری حریت رہنمایاسین ملک، کشمیری رہنما مسرت عالم بھٹ مسلم لیگ مقبوضہ کشمیر، ڈاکٹر محمد قاسم اوران کی اہلیہ آسیہ اندرابی کے بارے میں یہ انکشاف بھی منظر عام پر آچکاہے کہ ناقص اور نامناسب خوراک میں "سلوپوائزن" کی وجہ سے انتہائی خطرناک امراض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ حریت رہنماؤں کے مطابق کسی کی بینائی جاچکی ہے تو کسی کے گردوں اور جگرنے کام کرنا چھوڑ دیاہے۔ کشمیریوں کے سخت احتجاج کے باوجود انہیں علاج معالجے کی سہولتوں سے محروم رکھا جارہاہے جو عالمی کنونشن کی بھی کھلی خلاف ورزی ہے۔

کوٹ بھلوال جیل کا ذکر کریں تو وہاں انتہائی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے جیل سپرنٹنڈنٹ کے مظالم تو دل دہلا دینے والے ہیں کہ کس طرح مسلمان قیدیوں پر قرآن کریم کی تلاوت پر بھی پابندی لگادی گئی ہے، انہیں نماز تک ادا کرنے کی اجازت نہیں اور اسلامی احکامات کی پیروی سے روک کر زبردستی پوجاپاٹ کرنے اور بھجن گانے پر مجبور کیا جاتاہے۔ مقبوضہ جموں وکشمیر اور بھارتی جیلوں سے رہائی پانے والے قیدیوں سے ہونے والے مظالم کی داستانیں رونگٹے کھڑے کر دینے کیلئے کافی ہیں۔ یہ باتیں بھی ریکارڈ پر موجود ہیں کہ کشمیری قیدیوں سے لواحقین کی ملاقات کیلئے باقاعدہ تاوان وصول کیا جاتاہے اور تاوان نہ ملنے کی صورت میں قیدیوں پر جسمانی اور نفسیاتی تشدد کیا جاتاہے اوران کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتاہے۔ یاد رہے کہ اس سلسلے میں کئی برس قبل سرکردہ حریت لیڈر شیخ عبدالعزیز مرحوم جو 15 سال بھارتی جیلوں سے رہائی پانے کے بعد ہندو برہمن کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے مجھے خود بتایا کہ مجھے اور 30 دوسرے کشمیری قیدیوں کو جب جودھ پور جیل میں منتقل کیا گیا تو ہماری آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں، بعد میں ہاتھ اور ٹانگیں باندھ کر برہنہ کرکے بھارت کے حق میں اور پاکستان کے خلاف نعرے لگانے پر مجبور کیا جاتا رہا اور ناکامی پر سب کے سامنے شدید تشدد کیا جاتا۔

کشمیریوں پر غیر انسانی مظالم کے حوالے سے نئی دہلی کی تہاڑ جیل بہت بدنام ہے۔ اسی جیل میں 4 کشمیری قیدیوں انجینئر محمود بہار، توصیف اللہ، احتشام الحق اور محمد رفیق شاہ جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسٹر گوسوامی کی جو انتہائی سخت گیر ہندو انتہا پسند ہے اور مسلمان قیدیوں پر تشدد کروانے کے کئی واقعات میں ملوث پایا جاتاہے، کی ہدایات پر مسلم قیدیوں پر قاتلانہ حملے کیے گئے جن سے ان قیدیوں کی پسلیاں ٹوٹ گئیں، بعد ازاں ان کی حالت تشویشناک ہوگئی تو پلاسٹر چڑھائے گئے۔ جیل حکام کی جانب سے پوری کوشش کی گئی کہ ماضی کی طرح یہ واقعات پھر سامنے نہ آسکیں لیکن مذکورہ قیدیوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی اطلاع اپنے عزیز واقارب تک پہنچادی جنہوں نے کسی نہ کسی طرح مجھے اس کربناک صورتحال سے آگاہ کر دیا اوراس طرح فوری طور پر ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دیگر انسانی حقوق کی تنظیموں کے ذریعے یہ واقعہ منظر عام پر آگیا۔

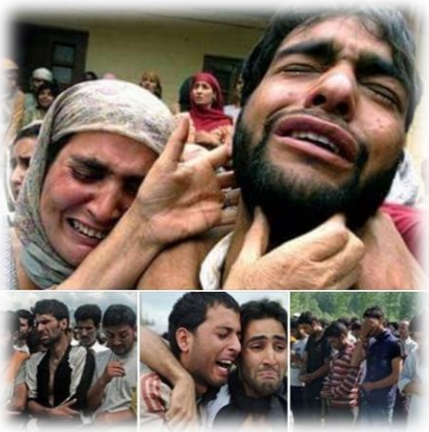

تہاڑ جیل میں قاتلانہ حملوں کا نشانہ بننے والے قیدیوں کے اہل خانہ کا کہنا ہے کہ زخمی ہونے والے ان چاروں قیدیوں کی طرح وہاں جتنے بھی کشمیری مسلمان قیدی موجود ہیں ان کے ساتھ ایسا ہی بہیمانہ سلوک روا رکھا جارہا ہے جس کی وجہ سے ان کی زندگی کو سخت خطرات لاحق ہیں اور وہ انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جیل حکام کی جانب سے بعض اوقات انہیں خود تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو کبھی جیل میں موجود ہندو انتہا پسندوں کے ہاتھوں جارحیت کا شکار بنایا جاتا ہے۔

ایک واقعہ شامل تحریر ہے کہ تامل ناڈو اسپیشل پولیس (جو خصوصی سیکورٹی اور تلاشی کیلئے تعینات ہے) کے اہلکار اچانک تہاڑ جیل کے اس بلاک میں داخل ہو کر سب کو فوری باہر نکلنے کا حکم دیا کہ وہ اس بلاک کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ اس دوران انہوں نے ایک قیدی سے اس کے تکیے کا غلاف تک چھین لیا کہ اس کی اجازت نہیں۔ جب اس نے کہا کہ اس نے جیل حکام سے اس کی باقاعدہ اجازت لے رکھی ہے تو مذکورہ پولیس افسر غصے میں آپے سے باہر ہو کر غلیظ گالیاں بکنے لگا۔ بعد ازاں فون پر تامل زبان میں کسی سے بات کرتا رہا جس کے کچھ دیر بعد تامل ناڈو پولیس کے مزید اہلکار وہاں آگئے اور گندی گالیوں کے ساتھ ان کشمیری قیدیوں پر بری طرح ٹوٹ پڑے اور ان کشمیری قیدیوں کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں جیل کا الارم بجادیا گیا اور یہ اس صورت میں بجایا جاتا ہے جب کوئی قیدی فرار ہونے کی کوشش کرے یا کسی جیل اہلکار پر کوئی قاتلانہ حملہ ہو جائے یا پھر کہ ان خطرناک قیدیوں کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جائے۔ ان حالات میں کوئی قیدی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تو کسی سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔

تشدد کا شکار بنائے جانے والے قیدیوں کا کہنا تھا کہ جس طرح یہ سب کچھ اچانک ہو گیا اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ ان تامل پولیس کے بدمعاش اور ظالم اہلکاروں کو دراصل یہی ٹارگٹ دے کر بھیجا گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں مارنے والے پولیس اہلکار بلند آواز میں کہہ رہے تھے کہ آؤ ہم سے لڑو، اب آزادی کے نعرے لگاؤ، یہ کہہ کر انتہائی ظالمانہ انداز میں اندھا دھند لاٹھیاں برساتے رہے حتیٰ کہ تمام قیدیوں کو خون سے لہولہان کر کے دم لیا۔ ایک قیدی کے سر سے جب خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تو فوری طور پر اس کے سر پر تین چار یخ ٹھنڈے پانی کی بالٹیاں انڈیل دیں، پھر ڈاڑھی سے پکڑ کر دور تک گھسیٹتے لے گئے جو بعد ازاں اس ٹھنڈے پانی کی وجہ سے نمونیا میں مبتلا ہو کر اللہ کے ہاں پہنچ گیا۔ کشمیری قیدیوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ تامل پولیس اہلکاروں نے کشمیریوں کو تو تشدد کا نشانہ بنایا لیکن ان کے ساتھ آشوتوش مشرا نامی ہندو کو محض اس لیے چھوڑ دیا کہ اس کی کلائی پر مخصوص دھاگا بندھا ہوا تھا۔

عین اس موقع پر جب کشمیری عوام بھارتی جیلوں میں پابند سلاسل قیدیوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کے طور پر ایک دن کی ہڑتال جب اعلان کیا تو دہلی کی تہاڑ جیل میں نہتے کشمیریوں پر جو وحشیانہ تشدد کیا گیا وہ بھارت کا استبدادی چہرہ مزید بے نقاب کرنے کا موجب بن گیا۔ یہ انتہائی افسوسناک واقعہ مہذب دنیا کیلئے لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بین الاقوامی تنظیموں بالخصوص اقوام متحدہ، انسانی حقوق کمیشن، ایشیا واچ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کی یہ منصبی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ مظالم برداشت کرنے والے کشمیریوں کی زندگی محفوظ بنانے میں کردار ادا کریں۔ تہاڑ جیل کے اس واقعے سے چند یوم قبل جموں کی کوٹ بھلوال جیل میں ایک قیدی کے جسمانی تشدد کی تصویر سوشل نیٹ ورک پر نمودار ہونے کے بعد معاشرے کے سنجیدہ فکر حلقوں اور ریاستی حقوق کمیشن کی جانب سے تشویش اور فکرمندی کے اظہار کے بعد یہ امید پیدا ہوئی تھی کہ بھارتی جیلوں میں جاری جارحیت روکنے کیلئے بین الاقوامی اور ملکی قوانین کا احترام ممکن بنایا جاسکے گا لیکن دہلی کی تہاڑ جیل میں 18 کشمیری قیدیوں پر جسمانی تشدد کے بعد ساری امیدیں ٹوٹ گئیں ہیں۔ جیل کے ایک انتہائی نگہداشت وارڈ میں بند ان قیدیوں کو جن کے معاملات عدالتوں میں زیر سماعت ہیں، بے تحاشا تشدد کر کے لہولہان کر دیا جانا ایک معمول بن گیا ہے۔

اس واقعے کا شاید کسی کو علم ہی نہ ہوتا اگر دہلی ہائی کورٹ میں ایک وکیل کی جانب سے اس حوالے سے مفاد عامہ کی درخواست نہ دائر کی جاتی جس پر مذکورہ عدالت نے سخت تشویش کا اظہار کیا اور معاملے کو سنجیدہ قرار دیتے ہوئے ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے اپنی رپورٹ میں قیدیوں پر کیے گئے جسمانی تشدد کی تصدیق کی ہے جس کے نتیجے میں دہلی ہائی کورٹ کے ڈویژنل بنچ نے معاملے کی سنجیدہ تفتیش پر زور دیتے ہوئے زخمی قیدیوں کو معائنہ کرانے کیلئے ایک میڈیکل بورڈ تشکیل دینے کی ہدایت جاری کی ہے جس پر آج تک عملدرآمد نہیں ہو سکا۔ ان قیدیوں کی جو تصاویر سامنے آئی ہیں وہ اس بات کی مظہر ہیں کہ ان کی مار پیٹ کرتے وقت کسی قسم کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ ان قیدیوں کے جسم کے تمام حصوں پر زخموں کے نشانات نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ مذکورہ تصاویر دیکھ کر ہر دردمند دل دہل گیا اور ہر شخص سوچنے لگا کہ یہ جیل انتظامیہ کی انتقامی سوچ کا کھلا مظہر ہے۔

اگرچہ بھارتی عدالت عظمیٰ نے کئی مرتبہ اس نوعیت کی شکایات پر سماعت کے دوران حکومتوں پر نہ صرف جیلوں کے اندر انسانی حقوق کا احترام ممکن بنانے پر زور دیا بلکہ اس حوالے سے پامالیوں کے مرتکب اہلکاروں کے خلاف کارروائی کرنے پر بھی زور دیا گیا جبکہ عدالت عالیہ کو بھی جیلوں کی صورت حال اور قیدیوں کے حالات پر نظر رکھنے کیلئے کہا لیکن اس کے باوجود کشمیر کے اندر اور بیرونِ کشمیر بھارتی جیلوں میں کشمیری قیدیوں پر ظلم و تشدد کا سلسلہ جاری ہے۔ آئے روز جیلوں کے اندر اسیرانِ کشمیر کو ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے لیکن عالمی سطح پر کبھی بھی زوردار انداز میں ان کا سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا گیا۔ ریاستی حقوق کمیشن نے کوٹ بھلوال جیل میں پیش آنے والے واقعے کا ازخود نوٹس لیکر جیل خانہ جات کے کٹھ پتلی ریاستی حکام کو واقعے کی تحقیقات کرکے ایک ماہ کے اندر اندر رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی تھی لیکن اس پر ابھی تک کوئی کاروائی نہیں ہوئی اور ماضی کی طرح کمیشن کی ایسی ہدایات کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ تہاڑ جیل معاملے کا دہلی ہائی کورٹ کے سنجیدہ نوٹس لینے کے باوجود جرائم کے مرتکبین کو قانون کے کٹہرے میں کھڑا نہیں کیا جاسکا۔

تہاڑ جیل میں کشمیری قیدیوں پر بدترین تشدد کے بعد مقبوضہ کشمیر میں یہ مطالبہ زور پکڑ رہا ہے لیکن انتہائی خوف و ہراس کے ان مناظر میں احتجاج کی بھی اجازت نہیں۔ عدالت میں یہ درخوست دی گئی تھی کہ کشمیری قیدیوں کو بھارتی جیلوں سے کشمیر کی جیلوں میں بھیجا جائے جس کو داخل دفتر کر دیا گیا۔ اس ظالمانہ فعل کے بعد ہماری ایک مرتبہ پھر اقوام متحدہ، ایمنسٹی انٹرنیشنل، ایشیاواچ اور ریڈ کراس کمیٹی جیسے اداروں سے اپیل ہے کہ وہ اس واقعے کا سختی سے نوٹس لیں اور بھارتی حکومت پر دباؤ بڑھائیں کہ وہ بے گناہ کشمیری قیدیوں کو رہا کرے اور انہیں کشمیر کی جیلوں میں بھیجا جائے۔ یاد رکھیں! اگر کشمیری قیدیوں میں سے کسی جان و مال کو نقصان پہنچا تو اس کے نتائج بے حد سنگین ہوں گے اور پھر پورے کشمیر میں ایک بڑی تحریک کو زور پکڑنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت پاکستان بھی اس حوالے سے مضبوط آواز بلند کرے اور دنیا کی سب سے بڑی فراڈ جمہوریت کی دعویدار مودی سرکار کے ظالمانہ چہرے کو عالمی سطح پر بے نقاب کرے۔ کشمیریوں کی تحریک اقوام متحدہ کی قراردادوں کے عین مطابق ہے اور اسی حوالے سے اقوام متحدہ کی درجنوں قراردادیں موجود ہیں۔

اُدھر قصر سفید کا فرعون بائیڈن اور اس کے دیگر مغربی اتحادی جہاں ایک طرف "را" کی طرف سے اپنے ملکوں میں مداخلت پر اسے تنبیہ کر رہے ہیں وہاں بھارتی دہشتگرد سے نظریں چراتے ہوئے متعصب کٹھ پتلی نریندر مودی کی پیٹھ تھپتھپانے میں مصروف بھی ہیں۔ اس کا یہ دوہرا معیار واضح کرتا ہے کہ پاکستان کے خلاف سازشوں میں بھارت کو قصر سفید کے فرعون کی مکمل سرپرستی حاصل ہے، کشمیر کی تحریک آزادی کو کچلنے کیلئے وہ بھارت کو ہر ممکن مدد فراہم کر رہا ہے لیکن مظلوم کشمیریوں نے اپنی لازوال قربانیوں سے تحریک آزادی کو جس موڑ پر پہنچا دیا ہے اسے اب طاقت کے بل پر کچلنا

ممکن نہیں۔ کشمیری قوم کے ہر فرد کے دل و دماغ میں غاصب بھارت کے خلاف نفرت کا الاؤ دہک رہا ہے، کشمیر کا ہر گھر کسی نہ کسی حوالے سے بھارتی ظلم و ستم سے متاثر ہے۔ انہیں کسی قسم کے لالچ، تشدد یا قتل و غارت گری سے ڈرا دھمکا کر تحریک آزادی سے پیچھے ہٹانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

کشمیری قائدین کے خلاف بھی بھارت سرکار اپنی خفیہ ایجنسیوں کا استعمال کرتے ہوئے جس طرح کی سازشیں کر رہی ہے اور انہیں عدالتوں کے ذریعے سزائیں دلوانے کے جو مذموم ارادے رکھتی ہے، اس میں انہیں ہرگز کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کشمیری قوم اب بھی پاکستان کو اپنا سب سے بڑا وکیل سمجھتی ہے جبکہ ہمارے حکمرانوں نے ان سے صریحاً دھوکہ کیا ہے۔ چونکہ کشمیری حریت پسند تکمیل پاکستان کی جنگ میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کر رہے ہیں اس لیے پاکستان کو کشمیری بھائیوں کی وکالت کا فرض سرانجام دینے میں ذرّہ بھر توقف، تاخیر اور تکلف بھی ایک ناقابل تلافی جرم ہو گا جس کیلئے خود پاکستانی عوام کو آئندہ انتخابات میں ان رہنماؤں کا ایسا محاسبہ کرنا ہو گا کہ تاریخ کا کوڑہ دان بھی ان کو اپنے ہاں پناہ دینے میں شرمندگی محسوس کرے گا۔

اک آنسو کہہ گیا سب حال دل کا
میں سمجھا تھا کہ یہ ظالم بے زباں ہے

بروز ہفتہ 10 رجب المرجب 1445ھ 20 جنوری 2024ء